١٣
دنیازاد
کتابی سلسلہ

کتابی سلسلہ

دنیازاد

کتاب ۱۳: خوابوں کا جزیرہ

ترتیب و تالیف

آصف فرخی

کتابی سلسلہ

دنیا زاد

کتاب ۱۳

اکتوبر ۲۰۰۴ء

کمپوزنگ	:	احمد گرافکس، کراچی info@ahmedgraf.com
سرورق	:	Arpana
طباعت	:	طباعت: دی سمیع سنز پرنٹرز، کراچی
رابطہ	:	شہرزاد
		بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی
ای میل	:	info@scheherzade.com

کتابی سلسلہ، سال میں تین کتابیں

پاکستان میں	:	۴۰۰ روپے
بیرون ملک	:	۴۰ امریکی ڈالر

فہرست

•

•

•

•

محفل

بھیانک خواب دیکھنے میں اب یہ سہولت حاصل ہوگئی ہے کہ آپ کو آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرائع ابلاغ کی برقیاتی یلغار کو براہِ راست آپ کے دل و دماغ تک پروجیکٹ کر دیں گے۔ اگر کسی نہ کسی طرح ایک امیج سے آپ بچ نکلے تو اس کے فوراً بعد ایک اور، پھر ایک اور مسلسل، لگاتار، ایک خوف ناک تصوّر سے دوسرے خوف ناک تصور تک...... آپ ان سے بچ کر جائیں گے کہاں۔ آپ کو صرف ایک سہولت فراہم کی گئی ہے، فراموشی۔ جن خوابوں کو آپ منسوخ نہیں کر سکتے، ان کو بھول سکتے ہیں- یہ نسخہ آسان ہے، ان کی خوف ناک صورتوں پر روزمرہ زندگی کی معمولی تفصیلات کی گرد پڑنے دیں یہاں تک کہ یہ اس ریت میں دفن ہو جائیں، ان کی شباہت بھی باقی نہ رہے۔ اور آپ پھر اگلے بھیانک خواب کے لیے تیار......

اس بھیانک اور بے نام عہد میں کہ جس میں ہم جی رہے ہیں، بڑے پیمانے پر ہونے والے بہیمانہ واقعات سے بڑھ کر، جن میں عام شہری تباہی و بربادی کا نشانہ بنتے ہیں اور پوری دُنیا صدمے میں مبتلا ہو کر دیکھتی ہے، دیکھے چلی جاتی ہے، کوئی اور بات خوف ناک ہے تو یہ کہ اتنی ہی جلدی یہ واقعات روزمرہ کے معمولی پن کا محض ایک حصّہ بن جاتے ہیں اور پھر یکسر غائب۔ آپ کو ایک لمحہ لگے گا تب کہیں آپ یاد کر پائیں گے، ان بچوں کو جو روس کے ایک چھوٹے سے شہر میں حسب معمول اسکول گئے تھے اور یرغمالی بن کر اس وسیع پیمانے کی تباہی و بربادی کا شکار ہوئے کہ اس شہر کی عورت کے ان الفاظ میں، جو ظاہر ہے ساری دُنیا میں ٹیلی ویژن پر نشر ہوئے، ایسا لگتا تھا کہ 'پائیڈ پائپر' اس شہر سے ہو کر گزرا ہے اور سارے بچّوں کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ پائڈ پائپر کون ہے اور کیوں شہروں شہروں پھر رہا ہے؟ ان بچوں کے ساتھ ساتھ بار بار ان کو یرغمالی بنانے والوں کا بھی دھیان آتا ہے کہ خود ان پر کیا قہر تھا؟ ہم عصر تاریخ کے ایسے گمبھیر سوالوں کا سامنا شاعری کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے اور ایسے سوال اٹھانے کی جرأت رندانہ شاعری میں ڈھلتی ہوئی، ممتاز روسی شاعر ایفتوشینکو کے ہاں نظر آتی ہے۔ سوویت روس میں اپنی نوجوانی کے دنوں میں ایک

غصیلے فن کار کے طور پر وہ ایسی شہرت کا حامل تھا کہ اس کی شعرخوانی کے حاضرین سے اسٹیڈیم بھر جایا کرتے تھے۔ اس کی تازہ نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بھی ضمیرِ وطن کی شاعرانہ آواز ہے۔ معروف شاعر اور نقاد جناب سحر انصاری کا کہنا ہے کہ اِفتو شینکو ان کے انتہائی دل پسند شاعروں میں سے ہے۔ انہوں نے ہماری درخواست پر اس نظم کا ترجمہ اس طور پر کیا ہے کہ ہمیں یہ اندازہ بھی ہوجاتا ہے کہ لمحہ موجود کی دُنیا سے برافروختگی و برہمی شاعری کے قالب میں کیسے ڈھلتی ہے۔ تاریخ کے کٹہرے میں ادب کی اس گواہی سے اس بار "دنیازاد" کا آغاز ہو رہا ہے کہ ایسے پُرآشوب دور میں شاعر و افسانہ نگار کا منصب اسی طور متعین ہوتا نظر آ رہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ادب ہو یا دُنیا، تبدیلی کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہے کہ دامانِ خیال بھی چھوٹا جائے ہے ہم سے...... اس آشوب میں تنقید کا فریضہ ایک اہم تہذیبی سرگرمی بن سکتا ہے کہ معیارات کیا ہیں، ہماری اقدار کیا ہیں، ادب پاروں کا اعتبار قائم ہو تو کیوں کر ہو اور تفہیم کے سانچے کون سے ہیں۔ معروف نقاد شمیم حنفی کا نیا مقالہ ایسے ہی مرکزی سوالوں کو ساتھ لے کر چلا ہے۔ یہ مقالہ جن نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے، ان کے ساتھ ساتھ اقدار کی تشریح اور بازیافت کے کئی پہلوؤں کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ اتفاق و اختلاف کے امور کے علاوہ، مصنف کا نقطۂ نظر ہندوستان کی تہذیبی صورتِ حال کے حوالے سے قائم ہوا ہے۔ کیا فرماتے ہیں ہمارے ناقدینِ فن اس بارے میں؟ کیا پاکستان کے بارے میں ایک وسیع تر تناظر میں اس دل سوزی کے ساتھ نہیں سوچا جاسکتا؟ تہذیب کی بازیافت شمس الرحمٰن فاروقی کے اس زیرِ تکمیل ناول کا مرکز بھی ہے۔ اس ناول کے دو ایک باب مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور اس کا ابتدائیہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ داستان سے لے کر غزل تک کئی اصناف کے مفسّر اور نظریہ ساز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانوی ادب سے عملی دل چسپی کو حالیہ برسوں کے ایک اہم تر ادبی واقعے کے سوا اور کس طور دیکھا جاسکتا ہے؟ بعض لوگوں نے تو یہاں تک برملا کہا کہ فاروقی صاحب اتنے پڑھے لکھے آدمی ہیں، ان کو ناول جیسی اسفل چیز میں سرکھپانے کی کیا ضرورت؟ اس ناول کی معنویت اور نوعیت کیا ہوگی، یہ جاننے کے لیے تو ہم سب کو (اپنے یا اس ناول کے) مکمل ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ اس ناول کی فضا بندی اس تہذیبی و معنیاتی بازیافت ہی کی ایک صورت ہے جس سے بطور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کا سروکار رہا ہے۔ چاند جتنے بھی ہوں آسمان تو ایک ہے۔ یا پھر یہاں سے ایسا دکھائی دیتا ہے۔

تاریخ کے نظاروں کی طرح اگر خواب بھی بازار میں مول ملنے لگیں تو کیا ہو؟ یہ امکان رضیہ فصیح احمد کے اس فنتاسیے میں نظر آتا ہے۔ پچھلے دنوں ڈائری کے ادھورے اندراجات تلاش کرتے ہوئے انہوں نے اس افسانے کو مکمل کیا۔ وہ آج کل امریکہ میں مقیم ہیں اور ایملی برانٹے کے سوانح پر مبنی ناول لکھ رہی ہیں۔ اس ناول کا اقتباس دنیازاد میں جلد ہی شامل ہوگا۔ جیلانی بانو کا کہنا ہے کہ ان کی تازہ تحریروں کو شاعری نہ سمجھا جائے۔ انہوں نے یہ کیا ہے کہ افسانے سے تمام غیر ضروری الفاظ نکال دیے ہیں۔ اپنی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب سجاتے رہے اور اس دوران اس وطن پر کیا گزری جسے ہم نے خوابوں کی تعبیر سمجھا تھا، یہ اس بار ہمارے افسانوں کا سوال ہے۔ معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض ان دنوں افسانوں کے علاوہ ایک ناول پر بھی کام کر رہی ہیں۔ نئے مجموعے "اپنا گھر" کے بعد یہ مسعود اشعر کی تازہ تحریر ہے۔ ان افسانوں کو آزادی کے ان واقعات کے ساتھ رکھ کر دیکھیے جو ہمیں بار بار یاد آتے رہتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے۔

دن، مہینے اور سال وقت کا ایک تسلسل ہیں جو ایک ہی سمت میں چلتا ہے۔ اس میں پیچھے پلٹنا ممکن نہیں۔ لیکن ہر سال جب اگست آتا ہے تو ۱۹۴۷ء آ جاتا ہے۔ یاد ایک دائرے میں گھومنے لگتی ہے۔ پریشاں خواب، بہت سی تعبیریں، ایک نئے ملک کی تشکیل، بگڑتا بنتا معاشرہ اور اس کے خدو خال جو بہت جانے پہچانے ہونے کے باوجود ابھی مانوس نہیں ہو پائے۔ اور ان ہی خوابوں کی خریداری کے لیے یہ سامان بہم پہنچایا تھا؟ آزادی، تقسیم، فسادات...... موضوعات کے اس دائرہ در دائرہ سلسلے پر افسانے بہت لکھے گئے۔ دو چھوٹی چھوٹی اخباری تحریریں 'دنیازاد' کے لیے اس خیال کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ مگر یہ خیال ہمارے ذہن سے دور ہونے ہی کب پاتا ہے؟

ناممکن ہے کہ تقسیم کا حوالہ اُبھرے اور منٹو کا نام سامنے نہ آئے، مطعون و معتوب منٹو جو ہمارے افسانے کا روشن ترین باب ہے اور جس کے انتقال کو جنوری ۲۰۰۵ء میں پچاس برس پورے ہو جائیں گے۔ وقت کے اس فاصلے کے باوجود، منٹو ہمارے لیے اب بھی برمحل ہے، اور اب بھی حشر بداماں کہ اختلاف و اتفاق کے شاخسانے پھوٹتے ہی رہتے ہیں۔ معروف ہندوستانی افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی کا مضمون ہم تک قدرے تاخیر سے پہنچا۔ یہ مضمون اور جواب مضمون ہندی میں پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔ فتح محمد ملک نے حال ہی میں منٹو پر ایک کتاب مکمل کی ہے، یہ مضمون بھی ان کی بعض معروضات ہمیں اختلافی معلوم ہوتی ہیں، اس میں شامل ہے۔ اس مضمون

پر مزید گفتگو ہونا چاہیے۔ تنقیدی مباحث کے لیے دنیازاد کے صفحات حاضر ہیں کہ منٹو آج بھی ہمارے ناخن کا قرض ہے۔

سماجی حقیقت اور اضطراب کے آہنگ میں ڈھل جانے سے حسن عابدی کی نظموں کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ ابرار الحسن نے خاصے عرصے کے بعد اشاعت کی طرف توجہ دی ہے۔ حسن عابدی اور ابرار الحسن کی نظموں کے مجموعے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ اپنی ہر نئی نظم سے محمد انور خالد چونکا دیتے ہیں کہ احساس و اظہار کی یہ جہت بھی امکان میں تھی۔ شاہین، نصیر احمد ناصر اور معین نظامی کی نظمیں سلسلہ وار پڑھے جانے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ادل سومرو ہم عصر سندھی ادب کا اہم نام ہے، شیخ ایاز اور امداد حسینی کی طرح وہ اُردو میں ادبی اظہار پر بھی اتنے ہی قادر ہیں۔ نئی آواز کے تحت ان کی نظمیں پڑھیے کہ یہ آواز نزدیک سے آئی ہے۔

کیا قافلہ جاتا ہے...... پچھلے شمارے سے لے کر اب تک وفیات کی ایک باقاعدہ قطار سی بندھی ہوئی ہے جو ہمیں سوگوار کر گئی ہے۔ کتاب تعزیت کے سلسلے میں ہم ایسی تحریریں شائع کرنا چاہتے ہیں جو محض رسمی خراج عقیدت نہ ہوں بلکہ مرحومین کے ادبی کام کا کسی نہ کسی حوالے سے جائزہ مرتّب ہو اور اس ادبی گفتگو کا سلسلہ آگے پڑھے جو دنیازاد کا مطمحِ نظر ہے۔ اس سلسلے کا آغاز اس بار اشفاق احمد سے۔ انتقال کے بعد یار لوگوں کو افسانہ نگار اشفاق احمد کی بہت یاد آئی جب کہ اپنی زندگی میں وہ ٹیلی ڈرامے اور ''ٹیلی تصوف'' سے اس طرح وابستہ ہو گئے تھے کہ ادب کو بے کار قرار دے چکے تھے۔ اس میں کیا شک کہ وہ بہت اچھے افسانہ نگار تھے لیکن کارِ دُنیا میں وہ افسانہ نگار کہاں کھو گیا؟ اب چلا گیا تو یاد بہت آتا ہے...... فہیم اعظمی نے ناول نگاری اور تنقید کے ساتھ ''صریر'' جیسے رسالے کو جاری رکھا یہاں تک کہ بسترِ مرگ پر بھی آخری اداریہ لکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے ڈاکٹر اسلم فرخی کے کئی خاکے اپنے پرچے میں شائع کیے، مگر ان کا خاکہ ''دنیازاد'' میں کہ اب صریرِ خامہ بھی نوائے سروش میں ڈھلنے کو ہے...... صاحب اسلوب سندھی افسانہ نگار جمال ابڑو سے لے کر پولینڈ ہی نہیں، بیسویں صدی کے سربرآوردہ شاعر چیسلاؤ میلوش تک، تابش دہلوی سے لے کر ژاک دریدا تک، کئی نام محفل سے اُٹھ گئے مگر ذہن میں تادیر جگمگاتے رہیں گے اور یادوں کا یہ سلسلہ آگے بھی چلے گا......

خراجِ تحسین اس بار ہم ادا کرنا چاہتے ہیں پابلو نیرودا کو جس کی صد سالہ سالگرہ اس سال منائی گئی۔ محمد سلیم الرحمان نے اس بے مثال شاعر کو ایک نظم میں مخاطب کیا ہے اور اس کے افسانوی شہرت کے حامل گھر کا احوال ڈاکٹر شیر شاہ سیّد نے لکھا ہے جو چند ماہ پہلے وہاں کا سفر کر کے آئے ہیں۔ معروف ماہر امراضِ نسواں ڈاکٹر شیر شاہ سیّد کے افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو قارئین کے لیے نیرودا اجنبی نام نہیں، ڈاکٹر انور زاہدی نے نیرودا کی یادوں کا ترجمہ کیا ہے اور مظفر اقبال نے چند ایک مضامین میں سوانحی حالات بھی جمع کیے ہیں۔ اتنے اہم شاعر سے ہماری واقفیت کا دائرہ مزید بڑھنا چاہیے۔

اس محفل میں غزل کے نئے، پرانے نام۔ ممتاز شاعر انور شعور نے اپنے تازہ کلام میں سے یہ غزلیں خاص طور پر دنیا زاد کے لیے انتخاب کی ہیں۔ احمد جاوید انتخاب اور اشاعت کے معاملے میں بہت سخت ہیں، ان کا تازہ کلام ہمارے لیے سوغات سے کم نہیں۔ نوجوان شاعر اور صحافی، اجمل سراج کا مجموعۂ کلام آیا ہی چاہتا ہے۔ تازہ دم شاعروں میں خورشید عالم خوب لکھ رہے ہیں اور خوب سے خوب تر کی جستجو کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان نوجوان شاعروں میں سے ہیں جن سے مستقبل کی اُمیدیں وابستہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لاہور اور اسلام آباد کی سکونت ترک کر کے نوجوان شاعر عارف امام اب لاس اینجلز میں بس گئے ہیں، اور ان تازہ غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا رنگ سخن کس طرح نکھر رہا ہے۔ ان غزلوں تک رسائی کے لیے ہم عقیل عباس جعفری کے ممنون ہیں۔

بعض لوگ سامنے نہ آ کر بھی محفل میں موجود رہتے ہیں۔ دنیا زاد کی محفلیں ایسے کئی دوستوں کے دم قدم سے آباد ہیں۔ اکبر معصوم نے ادھر بہت دن سے کچھ نیا نہیں لکھا۔ کچھ تو کہیئے کہ لوگ کہتے ہیں... انعام ندیم نے نئی غزلیں بھی لکھی ہیں اور جدید پنجابی نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں جو دنیا زاد میں شائع ہوں گے۔ مصطفیٰ ارباب نے نئی نظمیں بھی لکھی ہیں اور ایک سندھی ناول کے ترجمے کا آغاز بھی کیا ہے۔ بشیر عنوان نے ہمعصر ہندی ادب سے ایک اہم ناول کا ترجمہ مکمل کیا ہے جو ۲۰۰۵ء میں شہرزاد کی طرف سے شائع ہوگا۔ ہاں، یہ اہم خبر تو رہی جاتی ہے کہ ایک نئی طویل کہانی ''بیر شیبا کی لڑکی'' کے بعد حسن منظر نے آخر کار اپنا ناول ''دھنی بخش کے بیٹے'' مکمل کر ڈالا ہے۔ اگر محترم ڈاکٹر صاحب اس ناول کے کسی اقتباس کی اشاعت کے لیے راضی نہ ہوئے تو پھر کتابی صورت میں اشاعت کا انتظار کیجیے کہ بعض ناول انتظار کے لائق ہوتے ہیں۔

ایوگینی ایفتوشینکو
ترجمہ: سحر انصاری

درس گاہِ بیسلن

میں دنیا کی تمام درس گاہوں کو ترک کر چکا ہوں
کسی کے گناہوں کی پاداش میں مجھے ہر جگہ سے جلاوطن کر دیا گیا ہے
لیکن میں تجھ تک آ گیا ہوں، بیسلن،
تیری درگاہ کے ملبے سے علم حاصل کرنے کے لیے۔
بیلسن، مجھے معلوم ہے میں ایک خراب باپ ہوں
یہی نا؟ کہ خود اپنی آنکھوں سے
اپنے پانچوں بیٹوں کی موت کا منظر دیکھوں
اور بڑھاپے میں بطورِ سزا زندہ رہوں؟

درس گاہ کی سوختہ سیاہ میز پر، جو ابھی تپ رہی تھی،
جیبی چاقو سے نقش شدہ دل کی دھڑکن جب میں نے سُنی
تو بیسلن، مجھے یقین آ گیا کہ میں یہاں کسی اجنبی شہر میں نہیں ہوں۔

روس میں مجھے شاعرِ آتش فشاں کہا جاتا ہے
لیکن اب میں آتش فشاں کے مقابلے میں ایک بُھنگے کے سوا کچھ نہیں
جو کچھ یہاں ہوا، اگر ایسا ہونا ممکن ہے
تو پھر ہم میں سے کسی کے ہونے کا کوئی جواز نہیں
بیسلن میں ہر شے تہہ و بالا ہو گئی:
دہشت، انتشار، بدنظمی،

خوف، رحم، انسانوں کو بچانے کا حوصلہ،
پھر بھی معصوم جانوں کو بچانے سے قاصر رہ جانا۔
ہماری گزشتہ لغزشیں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔
ہمارا معصوم مستقبل بالکل نشانے کی زد پہ ہے۔
وہ ہمارے لمحۂ موجود سے بچ نکلنا چاہتا ہے
جو اُس کے عین شانوں کے بیچوں بیچ بندوق کی گولی پیوست کر دیتا ہے۔

لیکن ماتمی ہلال، ماتمی صلیب سے ہم آغوش ہے
درس گاہ کی سوختہ سیاہ میزوں اور دھویں کے کالے بادلوں
کے درمیان، محمدؐ اور عیسیٰؑ بھائیوں کی طرح گھوم پھر کر
بچّوں کی لاشوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے چن رہے ہیں
ہمارا کثیر الاسم خدا، ہم سب کو سینے سے لگا لیتا ہے۔
مختلف عقائد رکھنے والے بچوں کو ایک ساتھ دفن کرنے کی
ہمت وہی دیتا ہے۔
بچے، جنہیں ہم بچا نہ سکے......

جب اسٹالن کے حکم سے مویشی گاڑیاں قزاقستان جا رہی تھیں
اور ان میں چیچنیا کے باشندے، ایک کے اوپر ایک، ڈھیروں کی
صورت میں بُری طرح لاد دیے گئے تھے،
اسی وقت ماؤں کی کوکھ میں مستقبل کی دہشت جنم لے رہی تھی
اپنے اوّلین گہوارے میں، جھنجلا کر بچّے پناہ حاصل کرنے کے لیے
سمٹے جا رہے تھے
لیکن ماؤں کی کوکھ کے اندر نہاں اُن کے نازک سروں نے
سپاہیوں کی بندوقوں کی ضربیں اپنی ماؤں کے جسموں کے
نازک حصوں پر محسوس کیں۔

یہ بچے ماسکو سے رحم کی درخواست نہیں کر رہے تھے
جس نے انہیں چٹیل میدانوں میں پھینک دیا تھا
اتنے چٹیل میدان، جیسے کسی سفید دیو نے
چیچنیا کے سارے پہاڑ سطحِ زمین سے مٹا دیے ہوں۔

ناقابلِ یقین روسی نعروں کے درمیان
خنجر نما ہلال اُن کے کچّے مکانوں کے روزنوں سے
چپکے چپکے اسلام کی یاد دلا رہا تھا
پھر یلتسن کے جابرانہ غرور
اور اس کے جرنیلوں کے شب خون
چیچنیا کے باشندوں کو اوّلین دھماکوں کی طرف
دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے
اور جنگ سے محفوظ رہنا ناممکن ہو گیا
جھلسی ہوئی بیواؤں نے اپنے سینوں، اپنی کمروں
اور اپنے گلوں میں گلوبند کے بجائے آتش گیر مادّے پہن لیے تھے
ہمارے عقب میں زیادہ سے زیادہ لاشیں آتی جا رہی ہیں
اور تمام زندہ مخلوقات کی قیمت کم سے کم ہوتی جا رہی ہے
تاہم، انتقام کسی مسئلے کا حل نہیں
کثیر الاسم خدا، ہمیں انتقام سے محفوظ رکھ!

یہاں اگر اب بھی کچھ بچے زندہ بچ گئے ہیں
تو ہمیں اس واحد مقدس لفظ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے
"اتحاد۔"
اگر کوئی بچوں کو نہیں بچا سکا تو ہمارا ہیرو نہیں ہے
ہم سب ایک برہنہ حقیقت کے سامنے برہنہ ہیں

میں سوختہ بچوں کے ساتھ ہوں
میں انہی میں سے ایک ہوں،
میرا تعلق بھی بیسلن اسکول سے ہے
جب بیسلن پر حملہ کرنے والے ٹینکوں کے ساتھ تیرگی چنگھاڑتی ہے
اور درس گاہ کی تباہی کے بعد
باسکٹ بال کے حلقے میں، اسٹالن کی آویزاں کردہ
آتش گیر اشیا جب لرزتی ہیں
تو آسمان کا چہرہ کیسا تبدیل ہو جاتا ہے۔
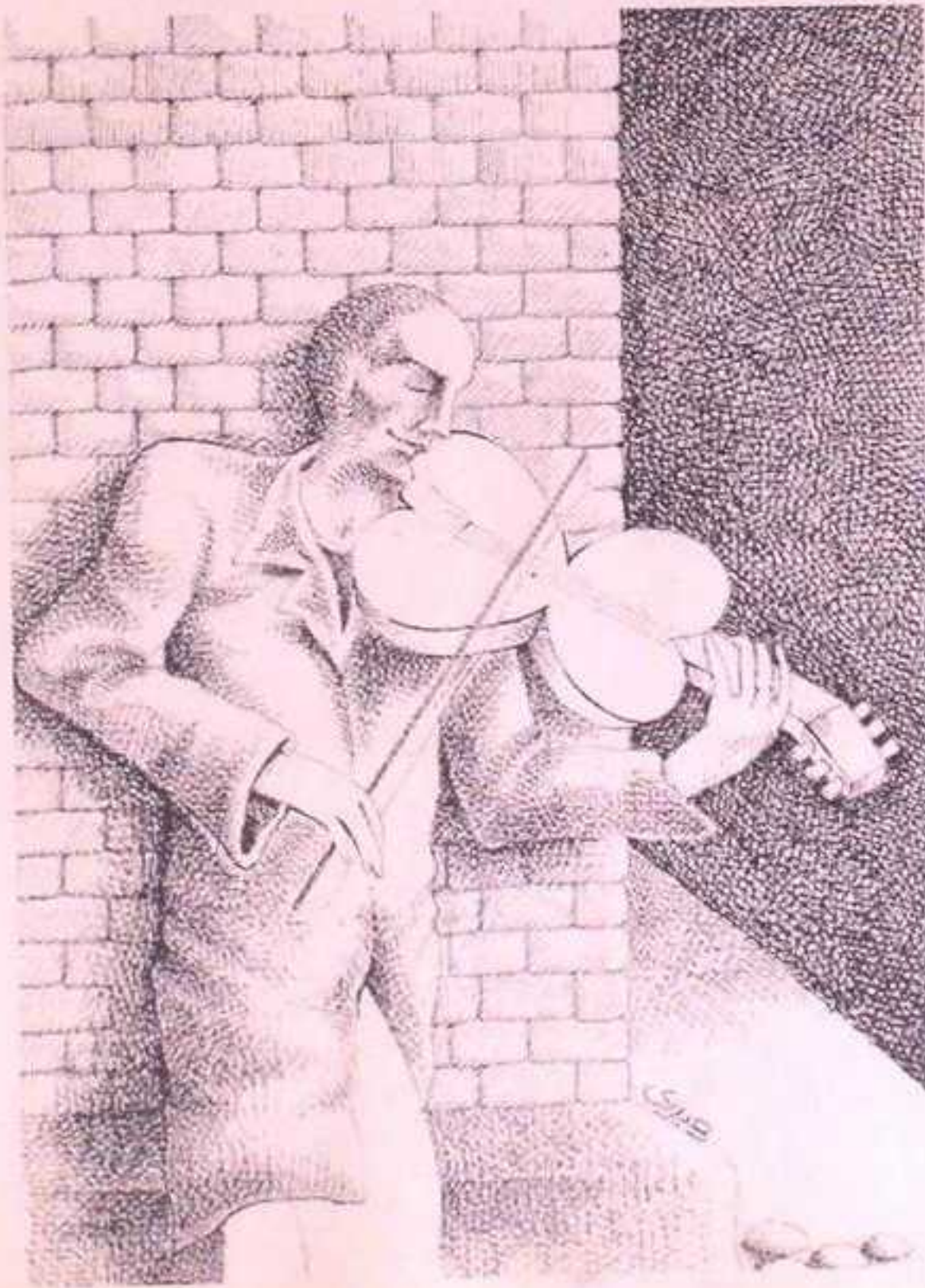
شمیم حنفی

اردو کی ادبی و تہذیبی روایت

روایت ادبی ہو یا تہذیبی ایک ڈھیلا ڈھالا، مبہم اور مظلوم لفظ ہے۔ ادبی اور تہذیبی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اصحاب اور گروہوں نے اس لفظ کو اپنی مرضی کے مطابق معنی پہنائے ہیں۔ بے شک روایت کا لفظ ایک سحر طراز لفظ ہے اور روایت کا خیال آتے ہی ہمارے احساسات پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ ہمارے تخیل کو ہی نہیں، ہمارے شعور کو بھی اپنی حقیقی صورت حال سے آگے، روایت کے واسطے سے ایک کھلا میدان مل جاتا ہے۔ کسی بھی ادبی روایت کی طرح ہماری اپنی روایت کے معنی بھی متعین نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ہی وقت میں الگ الگ ادبی جماعتیں اپنی روایت کے ایک الگ تصور میں یقین رکھتی ہیں اور اپنے اپنے حساب سے اس کی تعبیر کرتی ہیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے یہاں جذباتیت، انتہا پسندی اور ادعائیت کا جو ماحول پنپ رہا ہے اس نے روایت کے لفظ سے طرح طرح کے معاشرتی، فکری، نفسیاتی، سیاسی اور فرقہ وارانہ سوال جوڑ دیے ہیں۔ ان حالات میں لازم آتا ہے کہ اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت اور اس سے متعلق رویوں اور رجحانات یا تحریکوں اور میلانات پر نظر ڈالنے سے پہلے ہم اپنے آپ سے کچھ سوال بھی کرتے چلیں۔ مگر اس اقدام سے پہلے یہ بات ہمیں ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ روایت، تہذیب اور نسلی تشخص یا افتخار کا جذبہ باہم مترادف نہیں ہے۔ چنانچہ اپنے آپ سے ہمیں پوچھنا چاہیے کہ:

ان دنوں روایت سے ہمارا شغف اتنی تیزی کے ساتھ کیوں بڑھ رہا ہے؟

روایت سے ہمارے اس بے تحاشا شغف کا کسی طرح کی مجبوری یا حالات کے جبر سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگی تو نہیں ہے؟

آج اپنا جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے اور انفرمیشن ٹکنولوجی کے شور بے اماں نے ہمیں جس حال کو پہنچا دیا ہے، اس کے پیش نظر، اب روایت کی ضرورت کس حد تک باقی رہ گئی ہے؟

ہم اپنے لیے جس مستقبل کے تعمیر کررہے ہیں (یا تعمیر کرنے کے لیے مجبور ہیں) اس میں روایت کی معنویت کیا ہوگی؟

ان سوالوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور حقائق پر توجہ بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ خالص روایت کا تصور منطقی اعتبار سے بہت کمزور ہے، بالخصوص ہمارے اپنے معاشرے میں جسے مختلف قوموں، نسلوں، عقیدوں، زبانوں، قبیلوں اور میلانات کی ایک تجربہ گاہ کہا جاسکتا ہے، اور جہاں ایک ساتھ کئی زمانوں کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں روایت خود بینی اور خود تزئینی کا ایک بہانہ بھی ہے اور مشکل حالات میں ہمارے اعصاب و احساسات کو سہارا دینے والی ایک ان دیکھی طاقت بھی۔ اس سے قطع نظر، روایت کے ضمن میں یہ حقیقت بھی بہت اہم ہے کہ ہر معاشرے کی جڑیں بہرحال اس کے ماضی میں پیوست ہوتی ہیں اور بہت سی صورتوں میں، ماضی صرف، ماضی نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ روایت وقت کے مختلف ادوار کو ایک ہی مالا میں پرونے پر قادر ہوتی ہے اور کوئی بھی ایسی انسانی صورت حال، جس میں روایت کو ترک کرنا پڑے، ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہوتی خواہ اس کا انجام اپنی بربادی ہی کیوں نہ ہو۔

اردو کو درپیش موجودہ مشکلات کے پیش نظر یہ مسئلہ ہمارے لیے آج اور زیادہ اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ اردو کی لسانی اور ادبی تاریخ پر، ایک بن لکھی لسانی توسیع پسندی اور فاشیت کے باعث، جابے جا حملوں کا سلسلہ پرانا ہے۔ لیکن جب سے اس ملک میں فرقہ پرست طاقتوں کو بالادستی حاصل ہوئی ہے، اردو کی روایت بھی نرغے میں ہے....

جوائس نے کہا تھا کہ ''تاریخ ایک بُرا خواب ہے جس سے میں بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' ان دنوں جب گودھرا اور گجرات کے سانحے گزر چکے ہیں اور بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی نے فاشزم کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا ہے، ہمارے معاشرے میں اجتماعی ماضی کی ایک نئی تاریخ لکھی جارہی ہے۔ یقین نہیں آئے کہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر یہ سب ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن جو کچھ ہورہا ہے شاید جاگتی آنکھوں کا خواب ہے۔ ہمارے عہد کی سیاست نے ہماری ترقی اور لسانی تاریخ کے بارے میں بھی ایسا موقف اختیار کیا ہے کہ اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت آج طرح طرح کے اعتراضات اور غلط فہمیوں کی زد پر ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ایک حلقہ اگر اردو کو اپنی اجتماعی تاریخ اور یادداشت سے خارج کرنے پر تلا ہوا ہے، تو دوسرا حلقہ اردو سے تہذیبی وابستگی کے زعم میں، اس خوب صورت زبان کے بنیادی تناظر کو سمیٹ کر صرف ایک فرقے تک

محدود کردینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں اردو کے معاشرتی، ادبی، تہذیبی مزاج کی بابت طرح طرح کی غلط فہمیوں کا پیدا ہوجانا فطری ہے، اس قسم کے عامیانہ بیانات کہ اردو صرف ایک اقلیتی فرقے کی زبان ہے، یا یہ کہ تقسیم کی زبان ہے، یا یہ کہ ہندوستانی سماج کے بنیادی عناصر اور محرکات اس زبان سے مناسبت نہیں رکھتے، اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت پر ایک غیر متوازن، متعصبانہ اور صداقت سے عاری زاویہ نظر کے تسلط اور اطلاق کا نتیجہ ہیں۔ اردو کی ادبی اور تہذیبی سچائی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

المیہ یہ ہے اور یہ المیہ غور طلب بھی ہے کہ ایک اردو کے سوا، ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اس رنگارنگ ملک کی تاریخ اور جغرافیے سے اپنے رابطوں کی صفائی دینے کے پھیر میں نہیں پڑتی۔ اپنی ہندوستانیت پر اصرار کا مشغلہ کسی اور زبان کے بولنے اور لکھنے والے کبھی نہیں اختیار کرتے۔ کسی دوسری زبان کے رسم خط کو بدلنے کا مشورہ نہیں دیا جاتا۔ کسی اور زبان کے بولنے اور لکھنے والے اپنی رواداری کے ثبوت مہیا نہیں کرتے۔ اور یہ سب اس حقیقت کے باوجود ہے کہ اردو کی لسانی، ادبی، تہذیبی، معاشرتی اور فکری تاریخ میں گردوپیش کی دنیا سے رشتوں اور اپنے جغرافیائی، طبیعی، تاریخی ماحول سے مناسبت کے جتنے پہلو شامل ہیں، برصغیر کی کوئی بھی زبان، ہماری قومی زبان ہندی سمیت، اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تو کیا ہم اپنے محاسبے سے بے نیاز ہوجائیں؟ میرا جواب نفی میں ہوگا۔ کچھ ذمے داریاں مجبوریوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ ارتقا اور اس سے وابستہ میلانات اور تحریکات کا جائزہ لیا جائے تو جو بات سب سے زیادہ نمایاں اور واضح شکل میں سامنے آتی ہے، یہی ہے کہ اردو کا ذہنی اور حسی لینڈ اسکیپ، اس کی تاریخ کے ہر دور میں ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں سے زیادہ کشادہ، جاذب اور کثیر الجہات رہا ہے۔ اردو کی تاریخ ایک ایسے اجتماعی تجربے کی تاریخ سے عبارت رہی ہے جس میں ایک ساتھ کئی روایتوں کی آہٹ محسوس کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایت، گیارہویں اور بارہویں صدی میں مسلمانوں کے ساتھ مکالمے کے نتیجے میں، دو تہذیبوں کی آمیزش سے نمودار ہونے والی عہد وسطیٰ کی روایت، مغربی دنیا سے روشناسی کے بعد اٹھارویں اور انیسویں صدی کے عہد عقلیت اور عہد روشن خیال کی روایت جسے جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے طور پر دیکھا گیا، اردو کے دامن میں ان سب کے لیے گنجائش رہی ہے۔ یہ اردو کی تاریخ کے تین ادوار ہی نہیں اردو کے مرکز پر تین مختلف روایتوں کی یک جائی کے نشانات بھی ہیں۔ اردو کی ادبی اور تہذیبی تاریخ ایسے تمام اثرات کو قبول کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی جو اس کے منظرنامے میں

وسعت اور اضافے کا سبب بن سکیں۔ زندہ اور مثبت انسانی تجربے اور طرز احساس کی کسی بھی رو کو اردو نے کبھی مسترد نہیں کیا۔ چنانچہ اردو کی تاریخ کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے آج بھی کسی دائرے میں محصور کرنے سے بچایا جائے اور اس کے دروازے تمام سمتوں میں کھلے رکھے جائیں۔

خواتین وحضرات! اس گفتگو کا مقصد کچھ ثابت کرنا اور اردو زبان ادب کی تاریخ کو بنیاد بنا کر ان بدیہی موضوعات کی فہرست تیار کرنا نہیں ہے جو نثر و نظم کی مختلف صنفوں کے واسطے سے ہماری اجتماعی فکر اور واردات کا حصہ بنے۔ ہمارے ادب اور معاشرتی زندگی سے اس ادب کے تعلق، یا اردو کے ثقافتی پس منظر کے بارے میں، عام طور پر، جو کتابیں اور تحریریں سامنے آئی ہیں، ان کی سطح بالعموم بہت رسمی اور ظواہر کی پابند رہی ہے۔ مکتبیانہ انداز ان پر اتنا حاوی دکھائی دیتا ہے کہ ان میں ذہین بصیرتوں کی جستجو کا امکان دب جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع کے حوالے سے ذہنی ورزش کا وہی انداز اختیار کرنا، بے معنی ہوگا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ میں کوئی مقدمہ قائم کروں، میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ روایت، معاشرت اور ادب کے باہمی رابطوں کی بابت اپنے عہد کے سیاق میں ان باتوں کا کچھ محاکمہ کیا جائے جو اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت کے مضمرات اور اس روایت سے مربوط مسئلوں کی صورت ذہن میں ابھرتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ روایت یا قومیت یا انفرادی تشخص سے متعلق سوالات پر غور کرتے وقت، وہ جو ایک اعتذار کا یا رہبری کا روّیہ اکثر تحریروں میں خاموشی سے در آتا ہے، اس کے خطروں کا اور نقصانات کا مجھے احساس بھی ہے اور ان سے خوف زدہ بھی ہوں۔ ظاہر ہے کہ حضرت امیر خسروؒ سے لے کر اب تک کی ادبی روایت صدیوں کی رواداری، وسیع المشربی اور لبرل ازم کے جس ورثے کی امین رہی ہے، اسے اس گرے پڑے زمانے میں بھی ہر قیمت پر بچائے رکھنا ہوگا۔ لیکن ادب اور تہذیب، خاص طور سے اردو کی غالب روایت کے بارے میں بعض بنیادی سوالوں سے آنکھیں چرانا بھی ایک طرح کی نفسیاتی بے اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں مذہبی بنیادوں پر اپنا امتیاز قائم کرنے کی طلب اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے ۵۵-۵۰ء کے آس پاس اسلامی ادب کی ایک تحریک کا خاکہ ترتیب دیا تھا۔ اب نہ وہ خاکہ رہا، نہ وہ تحریک۔ گاہے ماہے کچھ رسالوں اور مضامین میں کوئی نحیف آواز سر اٹھاتی ہے، پھر دم توڑ دیتی ہے۔ محمد حسن عسکری نے اسلامی ادب کے سوال پر فراق صاحب سے ایک لمبی بحث (نقوش، لاہور من آنم، فراق) کے بعد، اس موضوع سے تقریباً ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ سلیم احمد اور جیلانی کامران عمر بھر اس سوال پر ایک کشمکش میں الجھے رہے۔ ہمارے

ممتاز معاصرین میں باقی بچے مظفر علی سیّد اور فتح محمد ملک جیسے اصحاب، تو ان کا المیہ یہ ہے کہ روایت، ثقافت اور ادب کا ذکر چھڑتے ہی برصغیر کی سیاست، تقسیم اور نظریاتی پیکار کا مسئلہ ان کے احساسات کے گرد ایک گھیرا ڈال دیتا ہے اور یہ ایک خیالی حریف کو موجود سمجھ کر، ہوا میں ہاتھ چلانے لگتے ہیں۔ اس رویے کی تازہ مثال محمد عمر میمن کی مرتبہ اینتھولوجی STUDIES IN THE URDU GHAZAL AND PROSE FICTION(مطبوعہ یونیورسٹی آف وسکانسن، میڈیسن) پر ''اسلام شناسی اور اردو ادب'' کے عنوان سے فتح محمد ملک کا مضمون (شمولہ تحسین و تردید، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء) ہے۔ اس مضمون کا تبصرے کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

> یہ مجموعہ مضامین دو اعتبار سے منفرد ہے۔اوّل یہ کہ یہاں محدود ادبی اور لسانی تناظر کی بجائے وسیع تر اور عمیق تر معاشرتی اور تہذیبی پس منظر میں اردو غزل اور افسانے کو متعارف کرایا گیا ہے اور دوم یہ کہ یہاں اردو ادب کو برصغیر کے مسلمان ذہن تک رسائی اور برصغیر کے مسلمان معاشرے کے درد و داغ اور سوز و ساز و جستجو و آرزو سے شناسائی کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔
>
> ....اسلام کے اساسی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ہر خطہ ارض کے مسلمانوں نے اپنے اپنے تہذیبی تنوعات کو جنم دیا ہے۔ اس لیے تہذیبی اشتراک کے اندر کارفرما، نازک اور معنی خیز اختلافات کا مطالعہ بھی اسلام شناسی کا ناگزیر حصہ ہونا چاہیے۔(محمد عمر میمن) کے خیال میں اردو ادب بنیادی طور پر مسلمان ذہن کا کرشمہ ہے اور اردو غزل، جنوبی ایشیا کے مسلمان معاشروں کو درپیش سوالات پر مسلمانوں کے ردعمل کی ترجمانی ہے۔ اردو غزل، جنوبی ایشیا کے مسلمان معاشرے کے مانند، زمان و مکاں سے ماورا بھی ہے اور زمان و مکاں کی اسیر بھی۔
>
> شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک غلط مفروضے کو سچ کر دکھانے میں ذہانت اور عملیت کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے ان نقادوں کو سیاسی انداز نظر کا حامل بتایا ہے جو اردو غزل کو مسلمانوں کے تصورِ کائنات اور ہندی مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت کا ترجمان بتاتے آئے ہیں، مگر تمام تر عملی وسعت اور بے پناہ ذکاوت احساس کے باوجود ان کا مقالہ محدود سیاسی مصلحت کا شکار ہے۔ انہوں

نے اردو غزل میں ہندوستانیت کے دریافت کی خاطر سبکِ ہندی کے تخلیقی اظہار پر خوب دادِ تحقیق دی ہے، مگر عنقا کو کون زیرِ دام لا سکا ہے؟

فتح محمد ملک اپنے غیر متوازن مقدمے کے ساتھ اس مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کے موقف پر جیلانی کامران کے اس ''دعوے'' کو ترجیح دیتے ہیں کہ:

اردو غزل، درحقیقت، برصغیر میں مسلم شعور کی تاریخ ہے۔ بحیثیت ایک شناختی صنف اظہار کے، غزل مسلم معاشرے کے تخلیقی کردار کی نشیب وفراز کی ترجمان بھی ہے اور مخصوص لفظیات اور ملائم و رموز کے باوجود، برصغیر میں اسلام کی سرگزشت کی امین بھی۔''

ان اقتباسات کی مدد سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا موقف جتنی محکم بنیادوں پر قائم ہے، اس کے مقابلے میں فتح محمد ملک (اور جیلانی کامران) کی دلیل اتنی ہی کمزور ہے۔ اردو شاعری کی تمام صنفوں میں فکری آزادی اور وسیع النظری کا اظہار جتنی شدت اور تواتر کے ساتھ اور جتنی پر پیچ تخلیقی اور فکری سطحوں پر غزل کی صنف میں ہوا ہے، دوسری کسی صنف میں نہیں ہوا۔ قلی قلب شاہ سے لے کر ہمارے عہد تک کی غزل اپنی ذہنی کشادگی اور تجربوں کی رنگارنگی، اپنے ثقافتی حوالوں کی کثرت، اپنی آزادیٔ فکری، اپنی جرات انکار اور ہر طرح کے تعصب اور کٹر پن سے اپنی دوری، اپنی مجموعی شعریات اور جذباتی ترجیحات کے اعتبار سے رواداری اور انسان دوستی کے ایک ایسے خاموش اور غیر رسمی منشور کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وسیلے سے ہم ہندی روایات کے ثقافتی تنوع کے ایک خاص منظر نامے تک پہنچتے ہیں۔ فارسی غزل اپنی فکری دبازت، تہہ داری اور تاثیر کے باوجود اتنی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ نہیں کہی جاسکتی۔ اردو غزل میں حرم کے بالمقابل دیر کا، دین داری کے مقابلے میں رندی کا، زہد و پارسائی کے مقابلے میں گم رہی اور بے راہ روی کا تذکرہ محض برائے بیت اور صرف فارسی غزل کی تقلید کا نتیجہ نہیں ہے۔ اردو سے آگے بڑھ کر، اس سلسلے میں تو یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے فارسی گویوں نے فکری، جذباتی اور جمالیاتی سطح پر جو روش اختیار کی وہ ایرانی روایات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فارسی کی ایک علاحدہ روایت کی ترجمانی بھی ہے، جس کے امتیازی نقوش امیر خسرو سے لے کر اقبال تک کے فارسی کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہندی اسلام اور انڈو مسلم ثقافت کا ایک اپنا الگ مزاج اور ایک الگ پہچان ہے۔ یہ نہ تو صرف عربی ہے، نہ صرف ایرانی۔

ثقافتی اور فرقہ وارانہ تقسیم پر مبنی یہ انداز نظر اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت سے وابستہ کچھ بنیادی حقائق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔ دکنی ادب کو پس منظر مہیا کرنے والا ذہنی اور ثقافتی ماحول، اس کے بعد شمالی ہندوستان میں اٹھارویں صدی کے دوران رونما ہونے والی ادبی روایت، یہ سارا سلسلہ انہی میلانات کی نشاندہی کرتا ہے جن کی بنیادیں سیکولر ہیں اور ایک مشترکہ اور متحدہ قومیت کے تصور سے مناسبت رکھتی ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں تحریک سازی اور کسی منظم منشور یا دستور العمل کی ترتیب وتشکیل کا سلسلہ مغربی اثرات میں اضافے کے ساتھ سامنے آیا۔ انیسویں صدی کی سرسید تحریک اور انجمن پنجاب کا منشور ہماری اجتماعی زندگی کے اسی موڑ کا پتہ دیتے ہیں۔ جدید ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار راجہ رام موہن رائے اور ان کے برہموسماج کے ساتھ ملک گیر پیمانے پر فکری تبدیلیوں اور نت نئے میلانات سے مربوط محاذ قائم ہوئے۔ آریہ سماج، پرارتھنا سماج، رام کرشن مشن، یہ تمام انجمنیں ایک انقلاب آفریں اور ترقی پسندانہ زاویہ فکر کی پابند ہونے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر، مذہبیت کے ایک شعور کی پابند تھیں۔ لیکن اردو کی ادبی روایت پر سایہ ڈالنے والی دونوں تحریکیں، علی گڑھ تحریک اور نظم جدید کی تحریک (انجمن پنجاب) تمام وکمال غیر منقسم ثقافتی اور تہذیبی مقاصد کی ترجمان تھیں۔ جدید ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے تقریباً تمام ذمے دار مدوخ اور مفسر انیسویں صدی کی ہندو اصلاحی انجمنوں کے سیاق میں ایک اکیلی علی گڑھ تحریک کے سیکولر ہونے پر متفق الخیال ہیں۔ گویا کہ اردو کی ادبی روایت کا مرکزی نقطہ ایک وسیع انسان دوستی اور رواداری کے شعور پر مبنی ہے۔ لیکن اپنی روایت کے اس پہلو پر اصرار کرتے وقت ہماری توجہ اس طرف بھی جانی چاہیے کہ فتح محمد ملک کے متذکرہ موقف کے برعکس ہمارے وہ ادبی مفسر ایک دوسری انتہا پر کھڑے نظر آتے ہیں جو عقلیت پرستی اور روشن خیالی کی قدروں سے شاید اپنی بے تحاشا وابستگی کے باعث بین الاقوامی انسان اور عالمی آشوب کی سطح سے نیچے نہیں اترتے۔ جو انفرادی تشخص کو عالمیت کی ضد سمجھتے ہیں۔ اپنی روایت کو صرف ایک بین الاقوامی مظہر کے طور پر سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں اور ایک ایسی نخوت کا رویہ اختیار کرلیتے ہیں کہ زیر بحث مسئلے پر ان سے بھی کسی بامعنی مکالمے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ نخوت اور جھوٹے پندار کا یہی رویہ ان لوگوں میں بھی عام ہے جو اجتماعی زندگی اور اس سے منسلک سوالوں پر سوچ بچار کرتے ہوئے ذہنی اور جذباتی دوریوں اور تاریخ کی عاید کردہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے باہمی تفریق اور تہذیبی و ذہنی اختلافات کی تہہ میں جھانکنے کے روادار بھی نہیں ہوتے۔ چنانچہ کچھ حقیقی اور جیتے جاگتے مسئلوں سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ہر طرح کے

وسوسوں سے آزاد ہو کر مسلم خلقیے اور اردو کی ادبی روایت پر غور و فکر کی جو سطح ہمیں رشید احمد صدیقی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے یہاں ملتی ہے، اس کا سلسلہ اگر ٹوٹ گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے کچھ اسباب بھی رہے ہوں گے۔ رشید احمد صدیقی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے لیے مسلم خلقیے اور ہماری ادبی روایت پر ہند اسلامی ثقافت کے اثرات کا مسئلہ کسی بیرونی حوالے کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے لیے یہ مسئلہ ادب اور زندگی کی روایات کے تعین میں تجزیے کے عمل کا ایک فطری حصہ تھا۔ شاید مختلف النوع نفسیاتی، جذباتی اور سماجی مجبوریوں کے احساس نے اس تجزیے کی ضرورت سے ہمیں بے نیاز کر دیا۔ مگر ہمارے یہاں (ہندوستان میں) پچھلے تقریباً پچاس برسوں پر پھیلی ہوئی ادبی تاریخ کا، اس تذکرے سے تقریباً خالی رہ جانا بھی ذہنی صحت کی علامت نہیں ہے۔ اس معاملے میں اردو نقادوں اور علمائے ادب سے بہتر تو ہندی کے وہ ادیب ہیں جو لبرل ہیومنزم، ترقی پسندی، تجدد پسندی، عقلیت، بین الاقوامیت کے تصورات سے کبھی اتنے مغلوب نہیں ہوتے کہ ادبی روایت سے متعلق سامنے کی ایک سچائی کو نظر انداز کر دیں۔ ادبی روایت، تحریکات اور میلانات کے تناظر میں ہندوستان کے بنیادی خلقیے اور ثقافت کا مسئلہ ہندی کے ترقی پسند، غیر ترقی پسند، جدید اور قدیم، سبھی ادیبوں نے اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی بات کھل کر کہنے سے وہ گھبراتے نہیں اور ادب کے مطالعے میں اجتماعی زندگی سے وابستہ کچھ اہم سوالوں پر نظر ڈالنے سے شرماتے نہیں۔ ادب پر گفتگو، کسی نہ کسی حد تک، زندگی پر گفتگو کا ایک طور بھی ہے۔ یہاں اس پوری تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں بس دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا کیونکہ ان کا تعلق براہ راست زیر بحث موضوع سے ہے۔ پھر اس سے یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہندی والے اس مشترکہ (اور متنازعہ) مسئلے پر بالعموم کس طرح سوچتے ہیں۔ اردو شعر و ادب میں فقط ہندوستانیت کی تعبیر اور تجزیے سے یہ مسئلہ سلجھنے کا نہیں ہے۔ صرف امیر خسروؔ کے گیتوں، صوفیا کے شکارناموں اور ملفوظات، اردو پر اودھی اور بھاکا کے اثرات، ہندوستان کی فصلوں اور موسموں اور مناظر کے بیانات، بارہ ماسا اور کتاب نورس سے لے کر نظیر اکبر آبادی اور اس کے بعد میرا جی تک ہندو دیوی دیوتاؤں، راگ راگنیوں کے حوالے سے بھی کافی نہیں ہیں کیونکہ ابھی تک تو ہم (یعنی کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیب) ''قومی خلقیے'' اور ہندوستانیت کی کسی ایک تعریف پر بھی متفق نہیں ہو سکے ہیں۔ برسوں پہلے دلی میں ریڈیو پر ایک مذاکرہ ہوا تھا، عنوان تھا: ہندوستانی ادب کی پہچان۔ ہندی کے کئی برگزیدہ ادیب ...... پروفیسر شیو منگل سنگھ سمن، ڈاکٹر پربھاکر ماچوے، ڈاکٹر نگیندر اس بحث میں شریک

ہوئے تھے۔ کسی نے ہندوستانیت کی اصل کا سراغ ویدوں میں لگایا، کسی نے مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی معاشرتی تاریخ میں۔ میری باری آئی تو میں نے عرض کیا کہ بھرت منی اور ان سے بھی آگے ابھینو گپت کی جمالیات سے میرے رابطے کی نوعیت صرف علمی اور تاریخی ہے۔ لیکن وہ ہندوستانی ثقافت جس میں مجھے اپنا عکس دکھائی دیتا ہے اور جس کی بساط پر مجھے بھی قدم جمانے کی جگہ مل سکے، اس کا سلسلہ تو اس ملک میں ترکوں کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے، اور یہیں سے اس ہند اسلامی یا انڈو مسلم روایت کا سلسلہ بھی نکلتا ہے جو اردو کی ادبی روایت کا نام اور مقام غرض کہ اس کی پوری شناخت کا تعین کرتی ہے۔

پروفیسر نامور سنگھ نے اپنی کتاب ''دوسری پرمپرا کی کھوج'' میں اسی مسئلے سے بحث کی ہے اور آچاریہ ہزاری پرساد دویدی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے .... ''میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام نہیں آیا ہوتا تو بھی اس (ہندی) ادب کا بارہ آنے (یعنی کہ تین چوتھائی) ویسا ہی ہوتے جیسا کہ آج ہے۔'' اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور سنگھ نے لکھا ہے کہ ''ہندوستانی معاشرے پر ترکوں اور ان کے بعد مغلوں کے اثر سے ایک دم انکار کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سیاق میں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہندوتوا سے محبت ترکوں کو انقلاب آفریں ماننے میں ہی ظاہر نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کی ایک شکل ترکوں کے اثر سے یکسر انکار بھی ہے۔ اس پس منظر میں دویدی جی کی بارہ آنے والی بات اہم ہے۔ انہوں نے اسلام کے اثر کو پورے کا پورا مسترد نہیں کیا۔ بس اتنا ہی کہا کہ تین چوتھائی سماج وہی رہتا۔ اس لیے دیکھنا چاہیے کہ وہ بچا ہوا ''چار آنہ'' یا ایک چوتھائی کیا ہے جو اسلام کے آنے کا نتیجہ ہے۔'' اسی سلسلے میں نامور سنگھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان میں آنے والے ترکوں کے بارے میں اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ '' یہ قبیلوں کی شکل میں منظم تھے اور جاگیردارانہ نظام کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے تھے۔'' ان کے پاس ایک باضابطہ طرز فکر بھی تھا اور وہ اپنے سیاسی اقتدار کے ساتھ اُس طرز فکر کے اقتدار کو قائم کرنے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ ہندوستانی سماج پر اس فکری یعنی ثقافتی غلبے کے قیام کی کوشش کا کیا اثر پڑا، اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔'' (دوسری پرمپرا کی کھوج، ص ۶۷)

یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر گفتگو کے بغیر ہندی ادب کے بھکتی کال سے آج تک کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ اور اس سوال کو نظر انداز کرنے کا مطلب ہے انہی روایت کے کچھ حصوں اور اس کے تسلسل کی کچھ کڑیوں کو نظر انداز کر دینا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما، اپنی ترقی پسندی کے باوجود،

اس ضمن میں اسی غلطی کے شکار ہوئے ہیں اور اس غلط نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ''ترکوں کی آمد ہمارے ملک میں کسی عہد آفریں تبدیلی کا سبب یوں نہیں بن سکی کہ وہ خود یہاں کے سماجی ڈھانچے میں کھپ گئے۔' اور ہندوستانی معاشرے پر ترکوں کی بے اثری کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے آنے سے یہاں کے سماجی ڈھانچے میں کسی قسم کا تغیر نہیں آیا اور مجموعی نظام تقریباً پہلے ہی جیسا رہا۔'' تاریخ کے اسٹیج پر رونما ہونے والی کوئی بھی بڑی واردات، ظاہر ہے کہ اتنی کمزور اور بے اثر نہیں ہوتی۔

بالفرض، ہم یہ مان بھی لیں کہ ایسا ہی ہوا ہوگا جب بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کسی قوم کی معاشرتی صورت حال اس کے بیرونی ڈھانچے سے کہیں زیادہ بامعنی اور دور رس نتیجوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہ صورت حال، وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم ہوتی جاتی ہے اور اس کے کچھ عناصر ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں بقول نرمل ورما ''وقت اور تاریخ کا دھارا بہت کم چھو پاتا ہے۔ یہ عناصر ایک قوم کی ہیئت، اس کے مجموعی آہنگ کا تعین کرتے ہیں، ایک تصویر کے علائم کی طرح جنہیں بدلنے کا جوکھم انہیں تباہ کر کے ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ علائم اور اشارات، براہ راست، ہمارے معتقدات، رسوم اور تعلقات سے جڑے ہوتے ہیں۔ عام انسان انہیں خواہ لفظوں میں بیان نہ کرسکے، لیکن یہ اس کے لیے قانون اور آئین سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔'' (شبد اور سمرتی، ص ۵۷)

عجیب بات ہے کہ ہندوستانی معاشرت کی تاریخ لکھنے والے ہندوستان میں ترکوں کی آمد کو ایک طرف تو قدیم اور وسطی ہندوستان کا خط تقسیم کہتے ہیں، دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ ترکوں نے ہندوستان کی معاشرت پر کوئی ایسا اثر نہیں ڈالا جسے قابل لحاظ کہا جاسکے۔ اس مفروضے پر ایک سوالیہ نشان تو یہ ثبت کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہندوستانی معاشرت میں مسلمانوں کی شمولیت کسی بڑی ثقافتی اور فکری تغیری کا پیش خیمہ نہیں تھی تو پھر ایک عہد (قدیم) اُن کے آتے ہی ختم کیسے ہوگیا اور دوسرا عہد (وسطی) شروع کس طرح ہوا؟ مزید برآں، سوال یہ بھی ہے کہ کسی طرح کی ابتری کے بغیر بیرونی عناصر کی شمولیت سے کیا کسی منظم اور مرتب ڈھانچے کی ماہیت بھی جوں کی توں رہتی ہے۔ اخذ و استفادے اور امتزاج کا عمل، چاہے جتنا سست اور خاموش ہو، آنے والے زمانوں پر اپنا کچھ نہ کچھ اثر مرتب ضرور کرتا ہے۔ چنانچہ اردو کا بنیادی مزاج اور اس سے مربوط تہذیب کا شناس نامہ بھی ہندوستانیت کے ایک پائدار اور مضبوط سلسلے کے باوجود، گیارہویں اور بارہویں صدی کے ساتھ ایک نئی سطح پر اپنی تلاش اور دریافت کے عمل سے گزرتا ہے۔

اس تہذیب کے خدوخال ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام کے ساتھ ہی نمایاں ہونے لگے تھے اور اس کا خاکہ گیارہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک نہ صرف یہ کہ اچھی طرح واضح اور روشن رہا بلکہ ہندوستان کی مجموعی ثقافت اور معاشرے پر اس کے اثرات بھی برقرار رہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس تہذیب (انڈومسلم) کے تصور کو جو قبولیت شمالی ہندوستان میں ملی وہ جنوب میں نہیں مل سکی چنانچہ دکنی ادب کی روایت میں اس کے نشانات نسبتاً مدھم ہیں۔ اس صورت حال اور شمال وجنوب میں فرق کے اسباب تاریخی بھی ہیں اور طبیعی بھی۔ اور غور سے دیکھا جائے تو جنوبی ہندوستان کا ثقافتی ماحول اشتراک کی کچھ نشانیوں کے باوجود بجنسہٖ وہ نہیں جیسا کہ شمالی ہندوستان میں دکھائی دیتا ہے۔ بنیادی فرق تصور اور مظہر کا ہے۔ مقامی مظاہر، اشیا اور طبیعی حوالوں کی جو یلغار قلی قطب شاہ کے کلیات اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب نورس سے لے کر ولی کے دیوان تک دکھائی دیتی ہے، اس کا رنگ شمالی ہندوستان کی ادبی روایت میں مقابلتہً ہلکا ہے۔ اشتراک اگر ہے تو تصورات (Conceptual) سطح پر۔ یہاں میں علاقائیت یا اُن دیسی (Nativistic) رویوں کی بات نہیں کر رہا ہوں جنھوں نے ٹوٹتی بکھرتی سرحدوں کے اس دور میں ''مہذب دنیا'' کے زیادہ تر علاقوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ میرا اشارہ دراصل اس حقیقت کی طرف ہے کہ اردو تہذیب اور ثقافت کا روایتی تصور غلط یا صحیح، بعض اسباب کی بنا پر، بہر حال شمالی ہندوستان کے لسانی اور ادبی مراکز (مثلاً فیض آباد، لکھنو، دلّی) کا تابع رہا۔ شاید اسی لیے اس تصور میں خرابی کی یہ صورت بھی نمودار ہوئی کہ کچھ مخصوص علاقوں کے لوگ صرف سطحی اور خارجی بنیادوں پر اس تہذیب کی پہچان مقرر کر کے مطمئن ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ کلچر اتنی کم عیار اور بے تہہ شے نہیں ہوتی۔ بیرونی شکل یا ہیت کو مارکس نے روحانی فردیت کا نام دیا تھا، اور اسی کی بنیاد پر یہ رائے بھی قائم کی تھی کہ اسلوب انسان کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن نہ تو ہیئت صرف بیرونی مظہر ہے، نہ ہی اسلوب صرف خیال کو یا باطنی حقیقت کو اوپر سے ایک چادر میں لپیٹ دینے کا عمل۔ چنانچہ اردو تہذیب وثقافت کا جائزہ لیتے وقت بھی چند اساسی نکات کو سامنے رکھے بغیر اس بحث سے کوئی بامعنی نتیجہ برآمد نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ''انڈو آرین اینڈ ہندی'' کے عنوان کے ایک تجزیے میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر ترک مسلمان فتح یاب نہ ہوئے ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ جدید ہندوستانی آریائی عوامی زبانوں کا رسمی طور پر تو آغاز ہو جاتا لیکن گمبھیر ادبی مقاصد کے لیے (ان زبانوں کی) قبولیت میں تاخیر ہوئی

ہوتی، گویا کہ مسلمانوں کی آمد سے رونما ہونے والی لسانی، معاشرتی، تہذیبی تبدیلیوں نے ہندوستان میں ایک نئے تخلیقی رویے، ایک نئے طرز احساس، ایک نئے شعور کا راستہ ہموار کیا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں آچاریہ رام چندر شکل نے ہندی ادب کے آدمی کال کو ویرگاتھا کال کا نام دیا ہے کیونکہ اسی دور میں مسلمان حملہ آوروں کی مذمت اور ہندو راجاؤں کی شجاعت کے قصوں سے بھری ہوئی گاتھائیں وجود میں آئیں۔ یہ دور سیاسی سطح پر ایک نئے تہذیبی تصادم کا دور تھا، دو بڑی تہذیبوں کے مابین مکالمے اور مفاہمت کا نہیں۔ مگر رفتہ رفتہ، مسلمان قوم، ایک نئی سرزمین پر، ایک نیا گھر بنانے کے امکان سے آگاہ ہوئی اور یہ سرزمین ایک نئی تہذیب کی توانائیوں سے بہرہ ور ہوتی گئی۔ آویزش کی جگہ امتزاج نے لے لی۔ ہندی ادب کی تاریخ میں آدمی کال سے آگے، ایک نئے کال کا قصہ شروع ہوا، بھکتی تحریک کے ساتھ۔ نامور سنگھ کا تاثر یہ ہے کہ ''اب اس دیس میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوجانے پر ہندو عوام کے دل میں فخر، زور اور جوش کے لیے جگہ نہیں رہ گئی .... اپنی مردانگی سے تھکی ہوئی قوم کے لیے بھگوان کی شکتی اور کرونا کی طرف دھیان لے جانے کے سوا دوسرا راستہ ہی کیا تھا۔'' میرا خیال ہے کہ بھکتی تحریک کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھے بغیر شاید اس طرز احساس، اس تہذیبی رویے، فنی مظاہر کی تشکیل کے اس جمالیاتی معیار اور میلان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا جس سے ہندوستان کے تعارف کا وسیلہ مسلمان قوم ثابت ہوئی تھی۔ مسلمان صرف حملہ آور اور فاتح نہیں تھے، کچھ ایسی قدروں کے ترجمان بھی تھے جن کا فکری پس منظر اور پیش منظر، اس ملک کے باشندوں کے لیے پرکشش اور خاصا نیا تھا۔ یہ سرفروش اجنبی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ ایک نئے طرز فکر، ایک نئی تہذیب کے قیام کا ذریعہ بھی بن گئے۔ ان کا طرز فکر تمام کا تمام بیرونی نہیں تھا۔ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہ سرزمین بھی ان کے لیے ایک ہمہ گیر روحانی اور وجدانی تجربے اور واردات تک رسائی کا وسیلہ بن گئی تھی۔ اردو کی ادبی روایت کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ البیرونی نے ''کتاب الہند'' میں احساس وخیال کے جس ٹھوس اور طبیعی پس منظر کی نشاندہی کی ہے، اسے حضرت امیر خسروؒ سے لے کر خواجہ حسن نظامی تک بلکہ آج تک مقامی ثقافت کی ایک توسیع ہی کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کے سیاسی تسلط کے واسطے سے جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں، ایک نئے تہذیبی اور جمالیاتی رویے کا ظہور بھی ہوا۔ اس رویے کی ترسیل وتشکیل کرنے والے صرف فاتح، اور غالب از راجنبی نہیں تھے۔ ان کی جاذب اور باکمال شخصیتیں دنیا کی دو عظیم الشان روایتوں کا سنگم اور مرکز اتصال بن گئیں، اور یہ سب کچھ تقریباً خودکار

طریقے سے ہوا۔ اس ملاپ کے نتیجے میں جو منظر سامنے آیا وہ سارے کا سارا نہ تو صرف دیسی تھا نہ صرف بدیسی۔ ہندوستان کی لسانی تاریخ میں اردو پہلی زبان ہے جو ایک وسیع تہذیبی اور ادبی پس منظر میں ہندوستان اور بیرونی دنیا کے کچھ علاقوں کے درمیان ایک پل بناتی ہے اور ہمیں اپنے اجتماعی سفر کے لیے ایک دوسری اور مختلف روایت کا راستہ دکھاتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں کا طرز احساس اور اس طرز احساس کی نمائندہ تہذیب ہماری گزشتہ ایک ہزار برس کی تاریخ کا ہی ایک نیا باب ہے، دنیا کے تمام دوسرے ملکوں میں رونما ہونے والی مسلم ثقافت (اسلامی ثقافت؟) سے مختلف، قائم بالذات اور خود مکتفی۔ یہ تجربہ صرف ہندوستان کی سرزمین پر ہی ممکن ہوسکتا تھا۔ اردو زبان اور تاج محل اور میر، غالب، انیس، اقبال کی شاعری اور میرامن، سرشار، پریم چند، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی نثر اسی منفرد اور نودریافت تجربے میں چھپی ہوئی بصیرتوں کا اظہار ہیں۔ اس جیتی جاگتی سچائی کے باوجود اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت کے سلسلے میں ایک عام سرد مہری اور لاتعلقی کا جو روّیہ ہمیں اپنے چاروں طرف نظر آتا ہے، اس کا جائزہ لیتے ہوئے نرمل ورما نے ایک فکر انگیز اور بحث طلب بات کہی ہے کہ:

''ہندوؤں کے لیے بدھ مت مختلف ہوتے ہوئے بھی اپنا تھا۔ عیسائی مذہب اور اسلام بہرحال ''پرائے'' تھے۔ اس لیے ان کے سلسلے میں ہندوؤں کا روّیہ جستجو کے عنصر سے یکسر عاری رہا۔''

اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت کی بابت غیر اردو داں طبقوں میں پھیلی ہوئی عام بے حسی اور لاتعلقی کا جائزہ نرمل ورما کے اس بیان کے پس منظر میں بھی لیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو ثقافت اور اردو زبان کی تاریخ سے منسلک مسئلوں کو نوعیت اور ان کے مضمرات کا سلسلہ طویل بھی ہے اور پر پیچ بھی۔ اس ثقافت کا اور اس قدرے عجیب وغریب، خوب صورت زبان کا مطالبہ ہم سے یہی ہے کہ اس سے وابستہ روایت کی تفہیم وتعبیر میں ہم اپنے تحفظات اور تعصبات سے الگ ہوکر ایک معروضی انداز نظر سے کام لیں اور زبان کی سیاست کے مروجہ نقشے سے الگ ہوکر اردو کی ادبی تہذیبی روایت کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔

اس روایت سے تعلق رکھنے والی تحریکات اور اہم میلانات کے جائزے پر مشتمل ایک تحقیقی مقالے (اردو ادب کی تحریکیں، ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک، ناشر انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۵ء) میں اس مقالے کے مرتب ڈاکٹر انور سدید نے اردو کے سیاق میں حسب ذیل تحریکات کی نشاندہی کی ہے:

۱۔ ریختہ کی پہلی تحریک ....امیر خسرو
۲۔ صوفیا کی تحریک
۳۔ ریختہ کی دوسری تحریک ....ولی دکنی
۴۔ ایہام کی تحریک
۵۔ اصلاح زبان کی تحریک
۶۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک
۷۔ علی گڑھ تحریک
۸۔ تحریک سید احمد بریلوی
۹۔ برہمو سماج کی تحریک
۱۰۔ آریہ سماج کی تحریک
۱۱۔ تحریک دلّی کالج
۱۲۔ انجمن پنجاب کی تحریک
۱۳۔ اقبال کی تحریک
۱۴۔ رومانی تحریک
۱۵۔ ترقی پسند تحریک
۱۶۔ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک
۱۷۔ تحریک ادب اسلامی
۱۸۔ پاکستانی ادب کی تحریک ....اور
۱۹۔ ارضی ثقافتی تحریک

جدیدیت، تانیثیت اور مابعد جدیدیت کے میلانات کا تجزیہ ڈاکٹر انور سدید کے اس مقالے میں شاید یوں ممکن نہ ہو سکا کہ ان کی تشکیل کا عمل اس وقت تک (جب یہ مقالہ ترتیب دیا گیا) مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن ان میلانات سے ہٹ کر بھی اس فہرست پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بہ طور تحریک بعض عنوانات کی شمولیت کا جواز نہیں نکلتا۔ امیر خسروؒ، ولی اور اقبال کسی تحریک کے بانی نہیں تھے۔ اپنے اپنے زمانے کی ادبی تاریخ پر ان کے اثرات برحق، لیکن مثال کے طور پر میر، غالب، ذوق، اکبر، فراق، جوش اور فیض نے شاعری کے میدان میں اور میر امن، سرسید، محمد حسین آزاد،

شبلی، حالی اور پریم چند نے اردو نثر کے منظر نامے پر بے شک گہرے اثرات چھوڑے۔ لیکن ہر ادبی میلان اور مقبولیت حاصل کرنے والا ادبی رجحان تحریک نہیں ہوتا تاوقتیکہ ایک معینہ دستور العمل کے مطابق منصوبہ بند طریقے سے اس کی ترویج و اشاعت نہ کی جائے۔ اردو کی ادبی روایت پر مختلف زمانوں میں مختلف رجحانات اثر انداز ہوتے رہے۔ مثال کے طور پر متصوفانہ مضامین کی قبولیت کا میلان اردو نثر و نظم کی تاریخ میں شروع سے دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ہماری ادبی روایت میں اس نے کبھی تحریک کی شکل اختیار نہیں کی۔ تصوف ایک طاقت ور میلان کے طور پر ابھرا اور اردو نثر و نظم کی تمام صنفوں میں اس نے اپنے نشان ثبت کیے۔ اسی طرح ایہام گوئی کی روایت، اصلاح زبان کے جوش میں فارسیت کا غلبہ قائم کرنے کی روایت نے اٹھارویں صدی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ لیکن یہ روایت تحریک نہیں تھی۔ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج کے تعلیمی، فکری اور ادبی و علمی مقاصد کے سلسلے میں کوئی ابہام نہیں، لیکن ان اداروں کے تحت فروغ پذیر ہونے والی سرگرمیوں کو تحریک کہنا غلط ہوگا۔ تحریک کے تصور کو ایک جدید مظہر کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے سے پہلے ہمارا ادبی معاشرہ بہت وسیع المشرب اور کثیر الجہات تھا، ادب کی مملکت ایک آزاد جمہوریت کی مثال تھی جہاں مختلف لکھنے والے اور شعرا کے گروہ اور سلسلے اپنے اپنے معیار و مذاق کے مطابق ادب کی تخلیق کر رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کی ادبی روایت انیسویں صدی کی روایت سے بعض معنوں میں جو بالکل مختلف دکھائی دیتی ہے تو اس لیے کہ برطانوی تہذیب کے اثرات نے اس وقت تک کوئی نمایاں شکل اختیار نہیں کی تھی۔ میر، سودا، درد، میر حسن، نظیر اکبرآبادی کے لیے مغرب کی دنیا کا کچھ مطلب نہ تھا۔ اس دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ اپنی روایت کے مطابق شعر کہہ رہے تھے۔ ان کا تصور حقیقت مغربیوں کے برعکس بہت وسیع، لچک دار اور گہرا تھا۔ ان کے لیے حساس کائنات اور غیر حساس کائنات، فطرت کے رنگارنگ مظاہر اور زندگی کی تمام شکلیں مل جل کر ایک وحدت کی تعمیر کرتی تھیں۔ وہ انسانی جذبوں کی خانہ بندی کے قائل نہیں تھے۔ حقیقت کے درجات تو ہوسکتے تھے لیکن اس کی حیثیت ایک ناقابل تقسیم اکائی کی تھی۔ اسی لیے ان کے تجربوں میں ایسی رنگارنگی اور بلند و پست کے لیے ایک سی گنجائش دکھائی دیتی ہے۔

اٹھارویں صدی کا معاشرہ اردو شعر و ادب کے سیاق میں بھی ایک کھلاڈلا، آزاد رو اور من موجی معاشرہ تھا۔ نظیر اکبرآبادی تو خیر ایک علامت بن چکے ہیں خودروی، قلندری اور تخلیقی استغنا کی۔ لیکن نظیر کے علاوہ بھی اس عہد کے باکمالوں کے یہاں جو تخلیقی خود اعتمادی زبان و بیان کی

سطح پر، اور حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اور شوخی تجربوں کے بیان میں، نظر آتی ہے اس سے ایک ایسے معاشرے کا تصور قائم ہوتا ہے جو اپنے آپ میں مگن ہے، عشق حقیقی ہو یا مجازی، اس مشغلے کی دھوم سب نے مچا رکھی ہے، اپنے بے خوف جذبات سے پردہ اٹھانے میں لوگ شرماتے نہیں۔ محبوب کا سراپا (مثنویوں میں) اس طرح کھینچتے ہیں کہ کھجوراہو، کالی داس اور بھوبھوتی کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ ''شوخی عرض مطالب'' میں میر اور سودا اور میر حسن سے میر اثر تک سب کے سب ''گستاخ طلب'' نظر آتے ہیں اور ہر تجربے کا بیان ایک معصومانہ سادگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ بڑے شعرا زبان ''بگاڑنے'' سے جھجکتے نہیں۔ ان کے مقاصد محدود، ان کی نیتیں خراب ہوں تو ہوں مگر ان کی بصیرت پر تصنع کا کوئی غلاف نہیں۔ خورشید الاسلام اور رالف رسل نے ''تھری مغل پوئٹس'' میں اٹھارویں صدی کی ادبی سماجیات کا تجزیہ اسی تناظر کے ساتھ کیا ہے اور اس تجزیے کی روشنی میں اٹھارویں صدی کا اردو معاشرہ ہر طرح کے امتناعات اور حجابات سے آزاد نظر آتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے شعرا کی تخلیقات میں جذبے کا جو کھراپن اور احساسات کا جو تنوع ملتا ہے اور اپنی واردات کے تذکرے میں جو تندی اور تیزی، رگوں میں لہو کے اچھلنے ابلنے کی جو آہٹ محسوس ہوتی ہے، انیسویں صدی کی فکری اعتبار سے بہت گہری اور پیچیدہ حسیت میں بالعموم اس کا سراغ نہیں ملتا۔ وکٹورین اخلاقیات اور ضبط جذبات کی مسیحی روایت کے بڑھتے پھیلتے ہوئے اقتدار نے انیسویں صدی میں ہماری تخلیقی روایت کے نقطۂ عروج یعنی غالب تک رسائی کے باوجود، اردو معاشرے کو احتیاط، توازن اور تناسب کے ایک نئے ماحول کا راستہ دکھایا ہے۔ غالب (اور ان کے معاصرین) انسانی تخیل کی حیران کن اور معجزاتی پرواز کے باوجود کچھ معین مقاصد کے تابع دکھائی دیتے ہیں، چاہے یہ مقصد شاعری میں معنی آفرینی ہی سے عبارت کیوں نہ ہو۔ اس واقعے پر ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ جدید نشاۃ ثانیہ کے ساتھ مذہبی، تعلیمی، معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھانے والی انجمنوں کو اعتبار اور اقتدار انیسویں صدی کے دوران ہی میسر آیا۔ اسی صدی نے غالبؔ کے لفظوں میں ''آئین روزگار'' کے مطابق سوچنے، باتیں کرنے اور زندہ رہنے کے اسالیب وضع کیے۔ علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب کے واسطے سے نثر و نظم کی دنیا میں انقلابی تغیرات کی تفصیل سامنے آئی۔ اردو تہذیب کا تعارف مغرب سے ہوا۔ نثر و نظم کی نئی صنفیں وجود میں آئیں۔ ادب کی تخلیق اور تفہیم و تعبیر کے نئے ضابطے مرتب کیے گئے۔ اس وقت صاف لگتا تھا کہ وہ لوگ جو مغربیت اور جدت کے سیلاب کو روکنے کی جدوجہد میں مصروف تھے، ایک گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں

کھڑے تھے۔ اودھ پنچ یا قوم پرست اور دیسی مزاج رکھنے والے جن ادیبوں کی صف ان حالات میں آراستہ ہوئی، احتجاج اور مزاحمت اور حرف انکار کی جو غیر منظم کوششیں ان حالات میں سامنے آئیں وہ بارآور اسی لیے نہیں ہوسکیں کہ ان کی بنیادوں پر پڑنے والی عقلیت، روشن خیالی، نیچرلزم اور سائنسی شعور کی ضرب بہت سخت تھی۔ علی گڑھ تحریک اور نظم جدید کی تحریک کے معماروں سے قطع نظر، غالبؔ جیسے نابغہ روزگار کا، رفتہ رفتہ شاعری سے دور ہوتے جانا اور ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے آپ کو بیشتر مکتوب نویسی کے شغل میں کھوتے جانا اسی معاشرتی اور فکری پس منظر میں اپنے معنی کھولتا ہے۔ آسمان شاعری تک پرواز اور پہنچنے کی فرصت لوگوں کو تب ملتی جب ''زمین نثر'' کے ہنگاموں کا شور کچھ تھمتا دکھائی دیتا۔ مقصدیت، افادیت، اصلاح اور تعمیر کے شوق اور ''صحت مند'' خیالات عام کرنے کی لگن نے اردو کے تخلیقی معاشرے سے اس کی اندرونی توانائی ایک حد تک کھینچ نکالی۔ اجتماعی مقاصد، روحانی اضطراب اور اکیلے پن کی فضا میں رونما ہونے والی تخلیقی مقاصد کے مقابلے میں، بہرحال، کم عیار ٹھہرتے ہیں۔ سماجی مصلحوں اور قائدوں کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے اور ان کی بے لوث خدمات کی اہمیت اپنی جگہ پر، لیکن اس قیامت کے نتیجے میں آرٹ اور ادب کی تخلیق کا حشر معلوم۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے سوویت یونین میں بالشویک انقلاب سے پہلے اور بعد کے ادب کا موازنہ کافی ہوگا۔ انقلاب سے پہلے وہاں عظیم المرتبت ادیب اور آرٹسٹ پیدا ہوئے، انقلاب کے بعد ادب پڑھنے والے۔ انیسویں صدی کے اردو معاشرے میں بھی اجتماعی زندگی کو سدھارنے والے مصلحوں نے اعلا ادب سے زیادہ ایک تعلیم یافتہ نسل کی تربیت کا سامان مہیا کیا۔ علی گڑھ تحریک اور نظم جدید کی تحریک، دونوں کا نصب العین ایک روشن خیال، عقلیت پسند، اپنے عہد کی تبدیلیوں کا شعور رکھنے والے اور پسماندہ قدروں کے جنجال سے چھٹکارا پانے والے معاشرے کی تشکیل تھی۔ شعر دل فریب ہو نہ ہو، اسے دل گداز ضرور ہونا چاہیے ...... چنانچہ اس پوری صدی کے ادبی منظر نامے پر، میر امن، انیس، غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی، ذوق اور ظفر، سرشار اور شرر، رسوا اور اکبر کے ناموں کی کہکشاں کے ہوتے ہوئے بھی وہ تخلیقی نور اور نشہ ناپید ہے جس نے میرؔ اور ان کے معاصرین کے واسطے سے اردو معاشرے کو دربار سے بازار اور خانقاہ تک جگمگا رکھا تھا۔ انیسویں صدی میں تو تخلیقی کلچر کی جگہ پر اب ایک نئے کاروباری کلچر کی تعمیر ہو رہی تھی اور فضا میں راگ راگنیوں سے زیادہ مشینوں اور کارخانوں کا شور تھا۔ دست کاروں کی جگہ صنعت کار پیدا ہو رہے تھے اور شعر و ادب پر، آرٹ اور کلچر پر مفید مطلب تصورات اور اشیا کی

گرفت تنگ ہوتی جارہی تھی۔ ادب کی تحسین و تعبیر کے قرینے تبدیل ہورہے تھے۔ معروضی، کارآمد اور حقیقت پسندانہ تنقید کے پودے اسی موسم خیال میں پھل پھول لاسکتے تھے۔

لیکن ہماری ادبی اور تہذیبی روایت کے اس موڑ کا ایک مثبت اور قابل قدر پہلو بھی ہے، یہ کہ اسی موڑ پر ہماری روایت کا تعارف ایک وسیع تر انسان دوستی، لبرل ازم اور بین الاقوامی مناظر پر مبنی سائنسی شعور سے ہوا۔ رسم پرستی، احیا پسندی، توہمات اور از کار رفتہ تہذیبی تصورات کو مسترد کرنے کی روش مقبول ہوئی۔ مسلمان کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے کے بجائے ان پر سوالیہ نشان قائم کرنے کا چلن عام ہوا۔ نئی روشنی کے سلسلے میں حساس اور نئے علوم سے بہرہ ور افراد میں ادعائیت اور مطلقیت کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اجتہاد کے دروازے کھلنے لگے اور زندگی پر اثر انداز ہونے والی تمام قدروں کی بہ شمول مذہبی قدروں کے، نئی تعبیر پر زور دیا جانے لگا۔ علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب دونوں کا دائرہ کار بہت کشادہ تھا۔ سرسید، حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ، غالب، صہبائی، آزردہ، شیفتہ، منشی سجاد حسین اور ان کے علاوہ حلقہ اودھ پنچ سے وابستہ ادیبوں .... مثلاً اکبر، چکبست، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، سرشار، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی .... اور ان سب کے علاوہ اس عہد میں شرر، رسوا، میر ناصر علی اور راشد الخیری وغیرہ کے توسط سے ادب میں نئے تجربوں اور افکار کی معنویت، ادیب کی سماجی ذمے داری اور مجموعی طور پر ایک نئی دانشوری کے تصور کو ابھرنے اور پھیلنے کا موقعہ ملا۔ ہماری دانشوری کی وہ روایت جو اقبال، ابوالکلام آزاد سے ہوتی ہوئی ہمارے اپنے دور تک پہنچی اور جس نے مغرب کو سمجھنے کے بعد ایک نئی مشرقیت کے آثار مرتب کیے، اس کا نقطہ آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد کا یہی اضطراب آسا دور ہے۔ جس کی تہہ سے اردو معاشرے میں ایک نئی نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا تھا۔ انیسویں صدی میں رونما ہونے والی تہذیبی آویزش اور ثقافتی پیکار، قدیم و جدید کی ایک ہمہ گیر کشمکش، اور سیاسی، معاشرتی، فکری انحطاط کے اس عہد میں اپنے تشخص کو پھر سے قائم کرنے اور اپنے آپ کو بحال کرنے کی اجتماعی جدوجہد کتنی حوصلہ آزما اور دشوار تھی، اس کی طرف دھیان دیجیے تو ان بزرگوں کی استقامت اور قوت کار پر حیرانی ہوتی ہے۔ کیسے مشکل حالات میں انہوں نے ایک نئی دانشوری کا چراغ جلایا اور کتنی مخالفتوں کے ماحول میں ایک بار پھر سے اپنی شناخت متعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بارے میں آج، جب کہ شعور کے ڈی کولونائزیشن کی تحریک نے ایک فیشن کی شکل اختیار کرلی ہے، سوچنا تو آسان ہے مگر اُن بزرگوں کے اندوہ، انہماک اور

ایثار کی راہ پر چلنا بہت مشکل کام ہے۔ ہماری نئی دانشوری کی روایت دیوزاد شخصیتوں کے ایک عظیم الشان اجتماع کی پروردہ تھی۔ جدید نظم و نثر کے مختلف اسالیب اور اصناف کی رونمائی اسی اجتماع کی کوشش سے ممکن ہوئی۔ اردو شعر و ادب سے قطع نظر اردو صحافت اور اردو میں سماجی، سائنسی علوم پر لکھنے کی روایت، ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے اردو میں ترجمے کی روایتیں، انشائیہ، سوانح، سفرنامہ، تنقید، طنز و مزاح، ناول، افسانہ، جدید ڈراما، آزاد نظم، نظم معرا سے لے کر نثری نظم تک .... اس تمام رنگارنگ تماشے کو عقبی پردہ انیسویں صدی کے دوران انھی بزرگوں نے مہیا کیا۔ اور انھی بزرگوں کی بصیرت اور جدوجہد کے نتیجے میں ہمارے لیے نئے میلانات کو قبول کرنا اور اپنی روایت کو نئے، نامانوس راستوں پر لے جانا آسان ہوسکا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے برطانوی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ کے علاوہ اپنی دو اور انگریزی کتابوں، دی میکنگ آف انڈیا (The Making of India) اور انڈیا اینڈ یورپ (India And Europe) میں اور شیخ اکرام نے اپنی ٹرائلوجی (رودکوثر، آب کوثر، موج کوثر) میں اس مسئلے کا جائزہ تاریخی حقائق کی روشنی میں خاصی تفصیل کے ساتھ لیا ہے۔

اردو کی ادبی روایت کے سیاق میں مغرب و مشرق کے امتیازات اور اختلافات کی بحث انیسویں صدی کے ساتھ تقریباً تمام ہوگئی۔ بیسویں صدی کے ادب پر جو تصورات سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے اور اردو نثر و نظم میں جن نئے جمالیاتی رویوں اور اصولوں کا عمل دخل نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے وہ بالعموم جدید نفسیات، مارکزم اور وجودیت سے ماخوذ ہیں۔ عسکری صاحب کا خیال ہے کہ سگمنڈ فرائڈ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے ہمیں جذبات کے خوف سے نجات دلائی اور انسانی وجود کی گتھیوں کو ہر سطح پر یعنی کہ لسانی، تخلیقی، سری، شعوری، حسی اور جذباتی .... غرض کہ مختلف النوع حوالوں کی بنیاد پر سلجھانے اور سمجھانے کا اہتمام کیا۔ ادب کی تخلیق کا شعور کے ساتھ ساتھ ہمارے انفرادی اور اجتماعی لاشعور سے کیا رشتہ ہے اور ادبی اظہار کے پیرائے علامت اور تجرید سے کس طرح مستفید ہوتے ہیں، علاوہ ازیں انسان کی باطنی کائنات اس کی بیرونی دنیا سے کیونکر الگ ہوتی ہے، یہ مسائل قدیم یا Primordial انسانوں کے مسائل بھی رہے ہوں گے لیکن ان کی پہچان جدید نفسیات نے کی۔ بیسویں صدی کی ذہنی زندگی پر فرائڈ نے ہر چند کہ ایک سائنس داں کے طور پر اپنے اثرات مرتب کیے، لیکن ٹامس مان نے غلط نہیں کہا تھا کہ فرائڈ ہمارے لیے ایک سائنس داں سے زیادہ ایک فلسفی تھا۔ اس نے خود بھی اپنے افکار کی منطق کے معاملے میں

شعر و ادب کی روایتوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ فرائڈ کی موت (۱۹۳۰) پر آڈن کا یہ کہنا کہ: ''اگرچہ اکثر وہ غلط تھا اور بعض اوقات مہمل، (جب بھی) ہمارے لیے ایک شخص نہیں، ایک پورا ذہنی ماحول ہے.........'' مغربی دنیا کے ساتھ ساتھ مشرق کی زندہ زبانیں بھی اس ''ذہنی ماحول'' کے اکتسابات سے دور نہیں رہیں۔ ہماری اپنی روایت میں ادب لطیف اور رومانیت کے میلان سے لے کر حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ادیبوں (منٹو، میرا جی، راشد، غلام عباس، ممتاز مفتی اور ان کے متعدد ہم عصروں تک اس ذہنی ماحول کے نشانات بہت نمایاں ہیں۔ ادب اور آرٹ کی دنیا میں گہری باتیں ہمیشہ دھیمے اور مرموز لہجے میں کہی جاتی ہیں۔ جو پرشور، خطیبانہ، ڈرامائی اور مصلحانہ انداز افادی اور مقصدی ادب کے ترجمانوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں اختیار کیا تھا، اس کے مقابلے میں جدید نفسیات کے زیر اثر انسان کی باطنی کائنات کے اسرار پر توجہ دینے والوں کے اظہار اور اسلوب کی سطح بہت دھیمی اور مبہم ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ رومانی تحریک (یا میلان) کے ادیبوں پر یہ الزام کہ انہوں نے حسن اور جنس کو موضوعاتی اعتبار سے ایک طرح کی مرکزی حیثیت دی، درست نہیں ہے۔ مہدی افادی، سجاد انصاری، یلدرم، ل احمد اکبر آبادی اور سلطان حیدر جوش سے لے کر نیاز فتح پوری اور مجنوں تک ایک واضح سماجی وابستگی کا تصور رکھتے تھے۔ اپنے معاشرتی تصورات کے لحاظ سے انقلابی اور ریڈیکل تھے۔ چنانچہ رومانی تحریک بھی بعض معنوں میں انقلابی تحریک تھی اور اس تحریک میں شامل ادیبوں نے خواب و خیال کی جن باتوں سے علاقہ رکھا ان کی بنیادیں سماجی اور معاشرتی تبدیلی کے ایک حقیقت پسندانہ میلان پر قائم تھیں۔ ''فن برائے فن'' کی اصطلاح کو عام طور پر جو معنی پہنائے گئے وہ فرائڈ کے نظریات کی غلط تفہیم اور ادب کے ایک ناقص، محدود اور متعصبانہ تصور پر مبنی تھے۔

ترقی پسند تحریک جو ہماری ادبی تاریخ کی پہلی بین الاقوامی تحریک ہے اور جس کے واسطے سے ایک انتہائی منظم اور مدلل ادبی دستور العمل ترتیب دیا گیا سماجی وابستگی کے تصور کو ایک خاص رخ دیتی ہے۔ غور کیجیے تو سرسید کی علی گڑھ تحریک، حالی اور آزاد کی نظم جدید کی تحریک، سجاد انصاری، مہدی افادی اور یلدرم کی رومانی تحریک سے لے کر نثر کے میدان میں بیسویں صدی کے نصف اول کی سب سے بڑی شخصیت پریم چند اور اسی دور میں بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر اقبال کے ادبی افکار تک، ادب کے تاریخی اول، ادیب کی سماجی ذمے داری اور کمٹ منٹ (تعہد)

کا سلسلہ کہیں بھی ٹوٹا نہیں ہے۔ اپنی انقلاب پسندی کے باوجود اقبال اور پریم چند کی تخلیقات میں رومان اور آدرش واد کے عناصر بھی شامل ہیں۔

اب جو جدیدیت یا اس میلان کے علم برداروں پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ادب کو حقیقی زندگی کے مسائل سے الگ کرنے کی وبا پھیلائی، تو اس کی وجوہات جدیدیت کے بجائے جدیدیت کے پرجوش حامیوں اور اس میلان کے انتہا پسند مفروں کے بیانات میں تلاش کی جانی چاہئیں۔ مغرب میں جدیدیت کو جس فکری پس منظر کی تائید حاصل تھی، اس کا ایک اہم عنصر، احتجاج اور مستقبلیت کی رو بھی تھی۔ یہ حقیقت پہلی جنگ عظیم کے بعد کے مغربی ادب میں، جسے عمومی طور پر ایک ''مہیب اضمحلال'' کا دور کہا جاتا ہے اور جس کے بیشتر اہم لکھنے والے انسانی روح کے اضطراب، تنہائی اور بے سمتی کے احساس کے ترجمان کہے گئے، بالواسطہ طور پر ایک بہتر انسانی دنیا کی تعمیر اور اجتماعی مستقبل کی تکمیل کے طلب گار بھی تھے۔ ہئیت پرستوں اور ادب میں من مانے تجربوں کو جائز ٹھہرانے والے ایک کھلنڈرے گروہ کو چھوڑ کر اس پریشان ساماں دور کے زیادہ تر شاعر اور ادیب اجتماعی زندگی کے معاملات میں ایک تعمیری سوچ کے مالک تھے۔ مارکسیت کے مضمرات کو سمجھتے تھے اور زوال پسند رویوں کے مخالف تھے۔ ان کا مشرب ایک طرح کی ''وجودی انسان دوستی'' (Exintential Humamism) تھی۔ روایتی ترقی پسندی سے ان کا اختلاف بالعموم اس بات پر تھا کہ ادبی اور تخلیقی اظہار کے معاملے میں وہ کسی بھی بیرونی مداخلت کے قائل نہ تھے۔ ادب اور آرٹ کی تخلیق کو ایک آزادانہ اور انفرادی عمل سمجھتے تھے۔ ادب میں regimentation، منصوبہ بندی اور جماعتی وابستگی کے مخالف تھے، اور اوپر سے عاید کردہ بندشوں کے انکاری تھے۔ ان کا بنیادی واسطہ یا کمٹ منٹ زندگی سے تھا، کسی سیاسی پارٹی یا آڈیالوجی سے نہیں۔ انہیں سمجھنے میں جدیدیت کے معترضین سے غلطی یہ ہوئی کہ ایک تو وہ تخلیقی سرگرمی اور عام انسانی سرگرمی میں فرق قائم نہیں کرسکے، دوسرے یہ کہ انہوں نے وجودیت کو نشانہ بنالیا اور اس سچائی سے بے خبر گزر گئے کہ وجودیت کا فلسفہ یک رخا، محدود اور متعین نہیں ہے۔ ہائڈیگر اور نیتشے سے لے کر سارتر، کامیو اور کافکا اور مرلیوپونتی تک وجودی فکر کے بہت سے زاویے اور متعدد اسالیب رہے ہیں جن میں یکسانیت اور مماثلت سے زیادہ پہلو امتیاز اور اختلاف کے نکلتے ہیں۔ اسی لیے وجودیت کے زیر اثر ذاتی تجربے سے وابستگی کا جو ادب سامنے آیا اس میں رنگا رنگی اور تنوع بہت ہے۔ جدیدیت کے مظاہر کی کثرت کا سبب یہی ہے کہ اس میلان سے وابستہ ہونے والوں نے خود

کو کسی ایک نظریے کا پابند نہیں ہونے دیا اور اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں اپنا اظہار کرتے رہے۔ خالدہ حسین اور انور سجاد سے لے کر سریندر پرکاش اور بلراج مین را تک اور ایک نئی لسانی تشکیل کے ترجمان افتخار جالب سے لے کر افضال احمد سیّد تک جدیدیت کے بہت سے رنگ پھیلے ہوئے ہیں۔ باقر مہدی، وارث علوی، فضیل جعفری اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی تحریروں میں نئے تخلیقی تجربے کی تفہیم و تعبیر اور ادراک و اظہار کے باہم مختلف، بعض اوقات متضاد اسالیب اسی لیے دکھائی دیتے ہیں کہ انہوں نے کسی ایسی بوطیقا پر اصرار نہیں کیا جو نئے شعرا زر نئے فکشن کے تمام نمائندوں کا احاطہ یکساں اصولوں اور ضابطوں کی بنیاد پر کر سکے۔ جدیدیت کے میلان کو ہمارے لیے بامعنی بنانے والی سب سے اہم حقیقت اس میلان کی تہہ میں جاگزیں تخلیقی اور فکری آزادی کا تصور ہے۔ سارتر نے ''کھرے'' اور ''برہنہ'' شعور کی آزادی کا جو تصور پیش کیا تھا اس کا نصب العین ہی یہ تھا کہ افراد گرد و پیش کی کام حقیقتوں سے لاتعلق ہو کر اپنے تجربے تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس کے ایک کردار (Reprieve کے میتھیو) کی زبان میں:

ایک انسانی وجود کے لیے ''ہونے'' کا مطلب اپنے آپ کو منتخب کرنے (پہچاننا) ہے۔ اسے نہ تو اپنے خارج سے کچھ ملتا ہے، نہ اپنے اندروں سے۔ پس آزادی بجائے خود ''ہستی'' نہیں ہے۔ یہ انسان کی ہستی ہے، یعنی (گرد و پیش کی دنیا میں) نہ ہونا۔

لیکن تخلیقی آزادی کے من مانے تصور اور اس تصور کی مفروضہ سچائی پر انتہا پسندانہ اصرار نے جدیدیت کے میلان کو بالآخر انتشار اور خرابی کی ایک ایسی حد تک پہنچا دیا جہاں اشعار اور افسانے معمے اور چیستان بن گئے۔ علامت آپ اپنا مقصود ٹھہری اور جدیدیت جعلی قسم کی تخلیقیت کے پرفریب اظہار کا غیر دل چسپ وسیلہ بن گئی۔ تہذیبی اقدار اور ادب میں مابعد جدیدیت کا مقدمہ رسمی اور ادھوری جدیدیت کے اسی پس منظر سے نمودار ہوا۔ اشیاء کی طرح تخلیقی تجربے اور تصورات بھی جب مختلف طریقے سے ہوئے جاتے ہیں تو بے شک تبدیل کے ایک خود کار عمل سے گزرتے ہیں کیونکہ ان کا سیاق بدل جاتا ہے۔ ساختیات کے علم برداروں نے اسی زاویہ نظر کی بنیاد پر متن کی مطلقیت کے تصور کو مسترد کیا تھا اور ان کا اصرار اس نکتے پر تھا کہ ادب کے سیاق میں گرچہ یہ تخلیقی سلسلے کا محرک مصنف ہوتا ہے، لیکن اس سلسلے کی تکمیل قاری کی شمولیت سے ہوتی ہے۔ قاری متن کی قرات کے عمل میں متن کو تبدیل کر دیتا ہے اور اس کی حیثیت ایک شریک مصنف یا Co-author کی ہو جاتی ہے۔ ہر قرات ایک نئی وضع کی تعمیر کرتی ہے جس میں متن کو گویا کہ نئے

سرے سے دریافت کیا جاتا ہے۔ ساختیات کے ایک ترجمان Piaget نے اسی لیے ساختیات کو تعمیریت یا Constructionism کا نام دیا ہے اور اس کا جواز یہ بتایا ہے کہ کسی بھی خیال (تخلیقی تجربے) کا مطالعہ بنیادی طور پر کسی ساخت کا مطالعہ ہے۔ اختر احسن، جنہیں ہم مشرقی روایات کے سیاق میں مابعد جدیدیت کا پہلا باضابطہ شارح کہہ سکتے ہیں، اس شدت پسندانہ اور پرجوش روّیے کو ego-centric structuralism سے تعبیر کرتے ہیں۔ اختر احسن کا ذہن، مابعد جدیدیت کے بیشتر حامیوں کے برعکس، تقلیدی نہیں ہے اور انہوں نے فوکو، لیوی اسٹراس، سوسیور، لاکاں، رولاں بارتھ اور دریدا کے افکار کا مطالعہ ایک آزادانہ بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ زبان کو ایک نظام آیات (System of Signs) کے طور پر قبول کرنا برحق اور اس نکتے پر اصرار بجا کہ زبان کے ساتھ دراز دستیاں ادب کرتا ہے، سائنس نہیں۔ لیکن انسانی ادراک کا کوئی بھی مظہر، بہ شمول ادب، لسانی خلا میں سرگرم عمل نہیں ہوتا اور اس پر تاریخ وتہذیب کا اور روایت کا سایہ بھی ہوتا ہے۔ تاریخ کی مابعد الطبیعات کو ہم ڈی کانسٹرکشن (Deconstruction) کے نام پر تباہ تو نہیں کرسکتے۔ اختر احسن کا موقف یہ ہے کہ اصل معروض (Object) کا غائب ہوجانا اور صرف آیات (Signs) کا باقی رہ جانا، شعروادب کے سیاق میں ایک طرح کی فکری کج روی اور بے حصولی کی علامت ہے۔ ادب کے معاملات میں مجرد تعقل پر تکیہ کرنا اور تخیل کے عمل سے یکسر کنارہ کش ہوجانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے فی نفسہ اس مجموعی مشرقی طرز احساس اور روّیے کی ہی نفی ہوجاتی ہے جس کی تشکیل کا ایک اہم ماخذ اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت بھی ہے۔

خواتین وحضرات! اس مسئلے کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی اس موضوع کے مضمرات پر گفتگو کا حق دراصل ان اصحاب کو پہنچتا ہے جنہوں نے مغربی مفکروں اور دانش وروں کے افکار کو (بالعموم ناقص ترجموں کی مدد سے) اندھا دھند نقل کرنے کی بجائے اپنی ادبی اور تہذیبی روایت اور اردو نثر ونظم کی مثالوں کے حوالے سے سمجھنے کی جستجو کی ہے۔ نئی یا پرانی کوئی بھی ادبی تحریک ہو یا میلان ہو، ادب پڑھنے والوں کی طرف سے اس پر پہلی اور آخری شرط جو عاید ہوتی ہے، یہی ہے کہ خالی خولی تھیوری یا اصولوں کی ہوا باندھنے کی جگہ شعروادب کی نمائندہ مثالوں پر ان کا اطلاق کرکے، یہ دکھایا جائے کہ اس طرح ایک نئے جہان معنی تک رسائی کا راستہ کھلتا ہے۔ ہم اس لمحے کے منتظر ہیں جب کوئی بڑا شعر، بڑی نظم، ہمارے شعور میں ایک مستقل جگہ بنانے میں کامیاب ہونے والی ''مابعد جدید'' کہانی کا یا ناول کا ظہور ہوگا، اس مقدمے کے ساتھ کہ تمام گزشتہ

اور آزمودہ نسخوں کے باوجود یہ معجزہ صرف اس لیے ممکن ہوسکا کہ اسے ایک نئے نسخے کی تائید حاصل تھی۔ مردے از غیب بروں آید و کارے بہ کند!

ہمارے ایک معاصر ہندی ادیب (نرمل ورما) نے عرصے سے یوروپ میں مقیم ایک ہندوستانی دانشور (جے ایل مہیتی) کے حوالے سے ہائڈل برگ یونیورسٹی میں گفتگو کے دوران کہا تھا کہ ''ہمارا پچھلے تقریباً دو سو برسوں کا فکری تجربہ بس یوروپ سے ہوکر گزر جانے کے سوا اور کیا ہے؟'' ذہنی جدید کاری کے شور شرابے کے باوجود شاید ابھی تک ہماری اجتماعی زندگی میں جدیدیت کو ہی جڑ پکڑنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ ایسی صورت میں (بہ قول نکھلیشور) مابعد جدیدیت کا سوال بے معنی ہے۔ ہر ادبی روایت کی اساس کسی نہ کسی زبان (یا زبانوں) پر قائم ہوتی ہے۔ اور زبان بہ طور ایک ثقافتی مظہر کے کسی نہ کسی علاقے کی صدیوں کی تہذیب اور روایات سے مربوط ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بہت بڑی مشکل یہ ہے کہ اکیڈمک تنقید نہ تو روایت کا شعور بخشتی ہے نہ ادب کا۔ اس طرح کی تھیوریز تو صرف دیواریں کھڑی کرتی ہیں اور انسانی تجربوں کی میکانکی احاطہ بندی ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ ادب کی منطق حصار اور دائرے نہیں بناتی۔ جب تک ادب اور ادیب کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقعہ نہ ملے، دونوں کا دم گھٹتا ہے۔ نئے سے نئے ادبی تجربے کی سب سے بڑی طاقت اپنی روایت سے اس کے روابط کی دین ہوتی ہے اور اس تعلق کو بنائے رکھنے کے لیے ادیبوں میں اپنی تہذیبی زندگی کا شعور ناگزیر ہے۔ ایپاپنکر کا یہ خیال، اس پس منظر میں ہمارے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کہ ہماری داخلی تخلیقی توانائی کو اندھا دھند بیرونی اثرات اور درآمد کیے ہوئے تجربوں کی یلغار نے خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ کوئی بھی تھیوری، بہرحال، اس تاریخ سے زیادہ طاقت ور تو نہیں ہوتی جس کی کوکھ سے اس کی تخلیقی اور تہذیبی روایات کا جنم ہوتا ہے۔ یہ روایتیں انسانی تخیل کا کرشمہ کہی جاسکتی ہیں۔ کسی بھی قسم کی میکانکی یلغار کے باعث تخیل مرجائے یا مرجھا جائے تو آکٹیو یپاز کے لفظوں میں ہم اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھیں گے اور انتشار و ابتری کے ابتدائی زمانوں کی طرف لوٹ جائیں گے! خرابی کے اس مرحلے سے ہمیں ہر حال میں اپنی ادبی روایت اور تہذیبی روایت دونوں کو بچائے رکھنا ہوگا۔ ایڈورڈ سعید نے ہمیں مشرق کی تہذیبی اور ثقافتی روایتوں پر مغربی سامراج کے مسلسل حملوں سے بچاؤ کے لیے جو خبردار کیا تھا تو اسی لیے کہ سیاسی اقتدار ہر محکوم ثقافت کو اپنی مرضی کے معنی پہنانے پر مصر ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی فاشزم اور فرقہ پرستی کے ماحول میں اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت کو بھی یہ خطرہ لاحق ہے۔ ادبی اصول اور تصورات

چاہے جتنے وقیع اور منظم ہوں، انہیں جب بھی کسی اجنبی تہذیبی سیاق میں منتقل یا اس سیاق میں اخذ کیا جاتا ہے تو ان کے معنی کھو جاتے ہیں۔ جب تک کسی تنقیدی تصور اور ادبی روایت میں تال میل پیدا نہ ہو، ان دونوں کا باقی رہنا مشکوک ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ کے مختلف ادوار میں جن تحریکوں اور میلانات کو اعتبار میسر آیا ان سے وابستہ منظر ناموں پر نظر ڈالی جائے، تو کسی استثنا کے بغیر، یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ان تحریکات اور میلانات کو اپنے اپنے دور کے بہترین تخلیقی ذہنوں کا تعاون اور تائید حاصل رہی۔ مثال کے طور پر علی گڑھ تحریک، نظم جدید کی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، ادب لطیف کے میلان اور جدیدیت کے میلان کی مقبولیت اور فروغ کا بنیادی سبب یہی تھا کہ ان سے وابستہ ہونے والوں میں ان ادوار کی سب سے نمایاں اور ممتاز ادبی شخصیتیں شامل تھیں۔ انہیں شخصیتوں کے واسطے سے ان تحریکوں اور میلانات کی پہچان قائم ہوئی اور ان کے مقدموں کو استحکام ملا۔ یہ شخصیتیں اور ان کی وابستگی کا مرکز بننے والی تحریکیں اور تصورات، دونوں ایک دوسرے کا سہارا ثابت ہوئے اور ایک دوسرے کے وجود کی ضمانت.... جدیدیت کے بعد کسی اور میلان کے بارے میں ذمے داری کے احساس اور اعتماد کے ساتھ اس طرح کا دعوا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد کی صورت حال ابھی تک صرف یہ ہے کہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ

(اقبالؔ)

(دلّی اردو اکادمی کی دعوت پر یہ خطبہ ۲۷ ستمبر ۲۰۰۳ء کو غالب اکیڈمی، دلّی میں پیش کیا گیا۔)

جیلانی بانو

گن

میرے اوپر ایٹمی ہتھیاروں کے بادل چھائے ہوئے ہیں
کیا ایک پل میں یہ دنیا مٹ جائے گی؟
جھوٹ اور مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔
میں سر اُٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔
کوئی وعدہ؟ کوئی معجزہ؟

ننھی رمشا نے میرے ہاتھ سے قلم چھین لیا ہے۔
وہ سفید کاغذ پر جھکی کچھ لکھ رہی ہے۔
میں انتظار کر رہی ہوں
کچھ تو لکھو کہ حرف چمک اُٹھیں،
کچھ تو بولو کہ روشنی ہو جائے......

سچ کی تلاش

سچ کھو گیا ہے......
یقین کے گرم پتھر پر پاؤں دھرے
میں سچ کو ڈھونڈ رہی ہوں......
سیاست کی چیخ پکار میں،
سائنس کی گھن گرج میں،
سچ کی آواز گم ہو گئی ہے۔
خدا اور بھگوان کو بیچنے والے

بچ کو چرا کے لے گئے ہیں
ایف۔آئی۔آر کہاں لکھوائیں!
میں جھوٹ کے اندھیارے میں ڈوب رہی ہوں
ایک ہاتھ میں اُمید کا دیا ہے
دوسرے ہاتھ سے جھوٹ کی تیز ہوا کو رُوک رہی ہوں۔

اکیلا سمندر

میں اکیلا ہوں
اکیلا...... شانت، اور گھمبیر
مجھے کسی نے نہیں بلایا
میری سوچوں کا کرب
دل کا طوفاں
دل ہی میں اٹھ کر رہ جاتا ہے
مجھ سے کوئی نہیں ڈرتا
وہ جانتے ہیں
میں اپنی حد سے آگے نہیں بڑھوں گا
اُن پر جھاگ اڑا کر رہ جاؤں گا
میں پیاسی ریت سے لپٹ کر سوتا ہوں
اور اسے سیراب کر کے پلٹ جاتا ہوں
ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہوں
فنا اور بقا کے ہر راز کا محرم
گناہوں کی ساری گھڑیاں
میں نے چھپائی ہیں
دنیا بھر کے غارت گر

حرص و ہوس کے شیدائی
میرے اوپر سے گزرے ہیں
ہیرے موتی رولنے والے
دل کی مرادیں پانے والے
جھولی بھر کے کہتے ہیں
"اس کے دل کو مت چھونا
جوالامکھی بھڑک رہی ہے"

لاعلاج مرض

ظلِ سبحانی ڈر کے مارے کانپ رہے تھے
یہ سُن کر وہ دنیا کے ہر کونے سے دوڑے آئے
ہاتھوں میں مرہم، امرت، تریاق سنبھالے
اپنی سی کر کے ہار گئے وہ
ستر جانوں کی قربانی
سونا چاندی وارنے والے
گھبرا کر پوچھ رہے تھے
ظلِ سبحانی ڈر کے مارے کیوں کانپ رہے ہیں؟
ہاتھوں میں مرہم، امرت، تریاق سنبھالنے والے مسیحا
اپنی آواز دبا کر بولے
"ظلِ سبحانی اس ڈر سے آج کانپ رہے ہیں
اب ان سے کوئی نہیں ڈرے گا"

تہوار کا دن

دور کہیں رونے والوں نے مجھے جگا دیا

سڑک پہ بھگدڑ مچی ہوئی ہے
دوکانیں بند پڑی ہیں
آسمان پر دھواں پھیل گیا ہے
فائرنگ کی آوازوں سے ساری بستی گونج رہی ہے
میں نے کلینڈر کی طرف دیکھا
آج کون سا تہوار ہے؟

نروان

میں بھی سدھارت کی طرح نروان کی تلاش میں جانا چاہتی ہوں
مگر
سارے گھنے پیڑ کٹ چکے ہیں۔

اَن داتا کی دین

انہوں نے ہمیں سب کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے
وہ ہمارے بچوں کو شاندار مستقبل دیں گے
وہ ہمارے آنے والے دنوں کا پلان کریں گے
ہمیں کدھر جانا ہے؟
وہ راہ دکھائیں گے
ہیں کیا لکھنا ہے؟
وہ حکم دیں گے
ہیں کیا سوچنا ہے؟
وہ طے کریں گے
ہمیں کون سے خدا کی ضرورت ہے؟
وہاں گھسیٹ کر لے جائیں گے

اُن کی عنایتیں لامحدود ہیں
وہ سخی، اَن داتا ہمارے
ہم سے پوچھ رہے ہیں
"ہے کوئی مانگنے والا......
"بولو...... تمہیں کیا چاہیے؟
مگر
"وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے۔"

دنیا کا پہلا دن

ممتا کے اندھے غار میں
اپنی اَنا کے سرکش جذبوں سے سرشار
میں سرمار کے اس دروازے کو توڑ چکی ہوں
رنگ اور مٹھاس میں ڈوبی اس دنیا کو
پہلی نظر میں بھر لینے کو
جلتی بھڑکتی دنیا کے سب غم
اپنے وجود میں بھر لینے کو۔

اب میں تجربوں کے محلول بھرے
ایک طشت میں پڑی تھی۔
اپنی اپنی مصلحتوں کے ماسک باندھے۔
وہ سب مجھ کو گھور رہے تھے۔
میں ڈر کے مارے رونے لگی
"رو رہی ہے؟"
میرے خون میں رنگے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر وہ خوشی سے چلائے۔
"اب رونق ہی رہے گی......"

دوزخ

بیٹوں کی بیزار نگاہیں۔
بہو کا خوشی سے دمکتا چہرہ۔
شوہر کے بگڑے تیور۔
ڈاکٹر کی مایوسی سے بھری سرگوشی۔

اب میں مرجاؤں گی۔
موت کے ڈر سے نہیں، وہ دوزخ کے ڈر سے کانپنے لگی
بیٹے کی نوکری کے لیے جھوٹ بولی۔
بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے روٹیاں چرائیں۔
لوگوں کی خدمت کرنے میں کبھی نماز پڑھنے کا وقت نہ ملا۔
قران شریف کسی نے نہ پڑھایا
سر پر حجاب باندھنے کے لیے کپڑا نہ ملا۔
اتنے گناہ کیے ہیں۔
نہیں نہیں مجھے بچالو......
موت کے خوف سے نہیں، وہ دوزخ کے ڈر سے کانپ رہی تھی
پھر وہ مرگئی...
''اسے دوزخ میں ڈال دو...''
''بہت گناہ کیے ہیں اس نے......'' فرشتے چلّا رہے تھے۔
اور ایک انجانی طاقت نے اسے دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا...
ڈر کے مارے اس نے آنکھیں کھول کر دوزخ کو دیکھا۔
نفرت، انتقام اور ظلم کے خنجر اٹھائے خوف ناک بلائیں اسے گھیرے کھڑی تھیں۔
وہ اپنے گھر میں تھی...

رضیہ فصیح احمد

خوابوں کا جزیرہ

ہم نے بحرِ اوقیانوس میں تازہ وارد شدہ ایک جزیرے میں خوابوں کا کاروبار شروع کیا۔
یہ جزیرہ ہمارے پر دادا نے خریدا تھا جب وہ جزیرہ مڈغاسکر میں تھے۔ چار پانچ تہذیبوں سے ملی جلی زبان بولتے تھے اور اتنے ہی کلچر کا ملا جلا لباس پہنتے تھے۔ ان کے پاس پیسہ بہت تھا چنانچہ جیسے ہی سمندر میں یہ نیا جزیرہ برآمد ہوا، انہوں نے خرید لیا۔ یہ خوف اپنی جگہ تھا کہ جس طرح جزیرہ سمندر سے اُبھرا ہے کسی دن واپس سمندر میں ڈوب جائے گا مگر ہمارے پر دادا پُر حوصلہ اور مُہم جُو شخص تھے، ایسے نہ ہوتے تو پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر مڈغاسکر تک کا سفر طے نہ کرتے۔ ہمارے دادا یعنی ان کے بیٹے نے انہیں ٹوکا، تو انہوں نے کہا: ''چلو بیٹے، اب تو لے لیا، اگر خدا کی مرضی ہوگی تو ڈوب جائے گا۔ ہم سمجھیں گے کہ سامان سے لدا جہاز ڈوب گیا، وہ بھی ڈوب جاتے ہیں۔''
دادا یہ سن کر خاموش ہو گئے مگر ذہنیت تو سب کی تاجرانہ تھی، اس جزیرے کو اس خیال سے آباد نہ کیا کہ ڈوبے تو زیادہ نقصان نہ ہو۔ بس دو ایک ہٹ بنا لیے، دو ایک کشتیاں باندھ لیں۔ ایک موٹر بوٹ کھڑی کر دی۔ مچھلیاں پکڑنے کا ساز و سامان رکھ دیا۔ کوئی جانا چاہتا تو چند دن کے لیے کرائے پر دے دیا جاتا تاکہ تھوڑی بہت آمدنی کا سامان رہے۔ یہ جزیرہ اس کہاوت کی مثل تھا کہ آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجیے، جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے۔
اب ہمیں بغیر کمائے اتنی دولت مل گئی تھی جو کئی پشتوں کو کافی تھی، سو ہم نے اس جزیرے کو خوابوں کا جزیرہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے ہم نے آج تک جتنے خواب دیکھے تھے اس کے مطابق اسے آباد کیا۔ جب یہ طلسماتی دنیا بن گئی تو لوگوں سے پوچھ کر ان کے خواب بنانے شروع کیے۔ ایک عمارت تھی جس میں آدمی کو اس کی عمر کا بنا دیا تھا اور جتنی دیر کے پیسے دیتا تھا وہ اسی جون میں رہتا تھا۔ یہ بڑا مہنگا کام تھا مگر ہمیں معلوم تھا کہ چند گھنٹوں کے لیے جوان اور بچے بننے کے خواہش مند لوگوں کی کمی نہیں ہوگی اور وہ اس کے لیے بڑی رقمیں ادا کرنے کو تیار ہوں گے۔

اسی طرح ایک عمارت تھی جس میں لوگوں کو خوب صورت، ڈبلا، موٹا، لانبا گورا حسب خواہش بنایا جاتا تھا۔ اس کی اُجرت بھی خاصی تھی، نفع ہمارا مقصد نہیں تھا مگر اس پر خرچ بھی بہت آتا تھا۔

ایک عمارت میں طرح طرح کے ہتھیار سجے ہوئے تھے کہ لوگ جائیں اور اپنی پسند کے ہتھیاروں سے اپنی پسند کا شکار کریں۔ شکار کرنے سے پہلے انہیں لائسنس بھی لینا پڑتا تھا اور اس کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن لوگ اپنے دشمنوں کے شکار کے لیے بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار رہتے تھے۔

واضح رہے کہ یہ سب حقیقت میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ خوابوں کا جزیرہ تھا۔ لوگ پیسے دے کر اپنی خواہشات کو اس طرح پورا ہوتے دیکھ سکتے تھے کہ جیسے خواب میں سب کچھ اصلی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کی صوابدید اور پیسے پر منحصر تھا کہ وہ کتنی دیر تک اس خواب میں رہنا چاہتے ہیں۔

کچھ عرصے بعد ہم نے خوابوں کے محل کے احاطے کے باہر ایک دوکان کھولی جس پر لکھوایا ''کم استطاعت رکھنے والوں کے لیے خواب مفت'' یہ ایک طرح سے ہمارا پبلسٹی سیل تھا جہاں ہم نے کم مایہ لوگوں کے لیے ایسے خواب رکھتے تھے جن کو بنانے میں زیادہ لاگت نہیں آتی تھی۔ ہمیں حیرت تھی کہ باوجود اس کے کہ کشتیوں کا کرایہ برائے نام تھا اور وہاں غریب لوگ سیر کے لیے آتے بھی تھے اس دوکان پر بہت دن کوئی بھی نہ آیا۔

پھر ایک دن ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ اس کے کپڑے اُجلے نہیں تھے۔ پیروں میں بوسیدہ سی چپل تھی اور چہرے پر مایوسی کے نشان ابھی سے بیٹھنے شروع ہوگئے تھے۔

''ہاں، بچے آؤ، کیا چاہیے تمہیں؟'' میں نے اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر ہمت بندھائی۔

''کیا، کیا یہاں سچ مچ خواب ملتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں باہر لکھا ہوا تو ہے۔''

''ہاں، باہر لکھا ہوا تو ہے۔۔۔ مگر کیا مفت؟''

''ہاں بھئی مفت، شاید تمہیں یقین نہیں آرہا کہ مفت کوئی چیز کیوں دینے لگا۔ سمجھ لو کہ اپنی دوکان کی شہرت کے لیے ہم نے کچھ دن کے لیے مفت خواب دینے شروع کیے ہیں۔ اب بتاؤ، تم کون سا خواب لینا چاہتے ہو؟''

وہ دیر تک سر جھکائے خجل سا کھڑا رہا جیسے کوئی لڑکی پہلے پہل ڈاکٹر کے سامنے بے لباس

ہونے سے شرمائے۔

''ہاں ہاں بتاؤ۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، تمہارے دل کی جو سب سے بڑی خواہش ہے وہ بیان کرو، وہی تمہارا خواب ہوگا نا!''

''میں چاہتا ہوں'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا، ''کہ میرے پاس ایک کوٹھری بھری ہو بُھنے ہوئے چنوں کی اور ایک گُڑ کی اور میں اکیلا اسے کھاؤں۔''

''یہ تمہاری سب سے بڑی تمنا ہے؟''

''ہاں۔''

''ہمارے پاس یہ خواب تیار نہیں ہے مگر تمہارے لیے اسپیشل بنوادیں گے۔ تمہارا آرڈر لے لیا ہے۔ ایک ہفتے بعد آ کر لے جانا۔''

وہ میرا منھ تکتا رہا۔ اس کے چہرے پر بشاشت کا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا، جب میں نے اپنی بات دہرائی تو ''اچھا'' کہہ کر چلا گیا۔

مجھے اس لڑکے کی ذہنیت پر ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ بے وقوف، خواب میں تو کچھ نہیں لگتا۔ کیا یہ لڑکا اپنے ملک کے صدر ہونے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کسی سیارے پر سب سے پہلے پہنچنے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا، اور کچھ نہیں تو بڑے سے کیک اور مٹھائیوں کا خواب تو کہیں نہیں گیا تھا۔ احمق کو خواب بھی چاہیے تو چنے اور گڑ کا۔ فکرِ ہر کس......

پھر ایک دن ایک صاحبہ بگڑے تیور لیے داخل ہوئیں۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''کس کا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جو بورڈ لگا ہوا ہے۔''

''آسان اردو میں ہے'' میں نے کہا۔ ''آپ پڑھ سکتی ہیں۔''

''پڑھا نہیں ہوتا تو اندر کیوں آتی، مگر میں اس تحریر کا مطلب پوچھ رہی ہوں۔''

''مطلب یہ ہے کہ آپ کی کوئی ایسی خواہش، تمنا، خلش جو آپ کے لیے خواب کی طرح ہو اور آپ اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ ہم کوشش کریں گے وہ خواب آپ کے لیے مہیا کرسکیں۔''

''ارے رہنے دو، ضرور کوئی چکّر ہے۔ کوئی نہ کوئی فراڈ۔ اسی قسم کا دفتر جیسے جعلی زمین بیچنے والے چلاتے ہیں۔''

''مگر ہم نے تو لکھا ہے خواب مفت......''

''ہر فراڈیہ یہی کہتا ہے،'' انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''کبھی کوئی کام کی چیز مفت ملی ہے؟ یہ جو اشتہاروں میں لکھ دیتے ہیں ڈبّے میں یہ مفت، وہ مفت، وہ بھی اصل مال آدھوں آدھ نکال کر بچّوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کوئی کھلونا ولونا رکھ دیتے ہیں۔''

''مگر بہت سی کام کی چیزیں مفت بھی ملتی ہیں'' میں نے کہا۔

''مثلاً؟'' انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''مثلاً ہوا، پانی۔''

''دماغ چل گیا ہے آپ کا! پانی تو مفت ملتا نہیں۔ ہوا بھی دیکھیے کب تک ملتی ہے، میرا خیال ہے جلد ہی اس پر بھی بندش ہوگی۔ ہر ماہ لمبے لمبے بل آیا کریں گے۔''

''سوچیے، ایسے میں اگر خواب ہی مفت مل جائیں تو۔۔۔۔'' میں نے کہا۔

''اس دنیا میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ آپ سے بات کرنے میں بھی میرا وقت خراب ہو رہا ہے۔''

''آپ خود ہی اندر تشریف لائی ہیں''۔

''ہاں آپ کا اسٹوپڈ بورڈ دیکھ کر۔''

''اگر آپ آزمانے کے لیے ہی کوئی خواب......''

''رہنے دیجیے میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے''۔

کیسے عجیب لوگ ہیں جن کے پاس خواب دیکھنے کو وقت نہیں ہے۔ لوگوں کو اسٹوپڈ کہنے اور لوگوں کے کاموں میں ٹانگ اڑانے کا تو وقت ہے، لیکن خواب دیکھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ مجھے ان خاتون کی حالت پر بے اختیار رحم آیا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت سی لڑکی ڈرتی جھجکتی اندر داخل ہوئی۔ اس کے دمکتے ہوئے رنگ سے دکان میں اجالا سا پھیل گیا۔

''آپ کے ہاں خواب ملتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کس قسم کے؟''

''ہر قسم کے لیجیے، دیکھیے۔'' میں نے رجسٹر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بہت دیر تک اس کے صفحات الٹتی پلٹتی رہی۔ اس کے بعد اس نے چٹ پر ایک نمبر لکھ کر میری طرف بڑھایا۔ وہ میری طرف دیکھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ میں نے ریک پر سے اس کے نمبر کے خواب کا پیکٹ اسے نکال کر دیا۔ اس نے شکریہ کہہ کر لیا اور پوچھا:

''کب لوٹا دوں؟''

''جب جی چاہے!''

''اگر جی نہ چاہے تو؟''

''تو نہ لوٹایئے۔''

وہ میٹھی سی ہنسی ہنسی اور چلی گئی۔ وہ ایک خوب صورت، طرحدار منگیتر کا خواب لے کر گئی تھی۔

دوسرے دن ایک بڑے میاں آئے اور ہانپتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک گلاس پانی پینے کو مانگا۔ پھر پوچھا، ''کس چیز کی دکان ہے یہ؟''

عرض کیا، ''خوابوں کی''

''جرابوں کی۔'' انہوں نے کہا ''مجھے تو کہیں جراب نظر نہیں آرہے''۔

''جی نہیں خوابوں کی۔ کیا آپ خواب نہیں دیکھتے؟''

''دیکھ لیے۔ بہت دیکھ لیے اور ان کو دیکھنے کی سزا بھی خوب پائی۔''

''تو کیا اب آپ کوئی خواب دیکھنا نہیں چاہتے؟''

''نہیں بھئی، اب ہم کچھ دیکھنا نہیں چاہتے۔''

''مگر کیوں؟''

''ارے بھئی ہماری عمر کو پہنچتے پہنچتے تو نیند ہی خواب ہوجاتی ہے تو ہم خوابوں کا کیا کریں گے؟'' کہتے کہتے انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ جب ان کی طبیعت سنبھلی تو ہم نے کہا، ''آپ اپنی جوانی کا خواب دیکھ لیں۔ اپنی محبوبہ کا خواب لے لیں۔ زندگی میں آپ کی جو تمنائیں رہی ہوں ان کے خواب لے جائیں۔''

''نہیں۔ اگر دے سکتے ہو تو مجھے نیند ہی کا خواب دے دو۔ گہری، بہت گہری نیند، بچّے کی سی میٹھی نیند۔۔ اب اس سے اچھا خواب کوئی نہیں۔''

میں نے ان کے ہاتھ پر نیند کا خواب رکھا۔ وہ دعاؤں کے درمیان کھانستے ہوئے چلے گئے۔

پھر ایک دن ایک قوی ہیکل شخص بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دیتا آیا اور کرخت لہجے میں بولا،
"یہ کیا چکر چلایا ہے آپ لوگوں نے؟"

"کیسا چکر؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ خواب، وواب کا،" پھر اُس نے آواز دبا کر پوچھا، "کچھ ولائتی مال بھی ہے کہ سب دیسی ہے؟"

"جو آپ چاہیں، جیسا آپ چاہیں۔ یہ تو آپ کی اپنی پروازِ خیال پر منحصر ہے۔"

"کون سے خیال پر منحصر ہے۔ دیکھو مجھ سے صاف صاف بات کرو۔ تم ادھر خیال بیچتے ہو یا خواب بیچتے ہو؟"

"خیال بھی، خواب بھی۔ آپ جو چاہیں گے ملے گا، بتائیے آپ کو کیا چاہیے؟"

"ہم کو۔۔۔ کیا چاہیے" وہ آنکھیں بند کر کے خاصی دیر سوچتا رہا پھر بولا، "نہیں، ایسے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ باہر ہماری گاڑی کھڑی ہے تم یوں کروں کہ اس میں سو دو سو خواب ڈال دو۔ ہم پسند کر لیں گے۔ پھر امال تمہیں واپس کر دیں گے۔"

"مگر اس عرصے میں تو بہت سے لوگ خالی ہاتھ لوٹ جائیں گے۔"

"لوٹ جانے دو۔"

"نہیں سوری" میں نے کہا۔ "یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ دو چار دن، دس دون غور کر لیجئے پھر ہمیں بتائیے۔ ہم خواب مہیّا کر دیں گے۔"

"تو تم اس وقت ہمیں خواب دینے سے انکاری ہو؟"

"مجبوری ہے" میں نے کہا۔ "ابھی تو دکان پوری طرح متعارف ہوئی بھی نہیں ہے۔ ہم سو دو سو خواب آپ کو کیسے دے سکتے ہیں؟"

"سوچ لو"

"آپ ہی بتائیے اس طرح یہ دوکان کیسے چلے گی!" میں نے کہا۔

"دوکان تو تمہاری خیر کیا چلے گی، تم خود چلنے پھرنے کے قبل رہ جاؤ تو بہت سمجھنا"۔

یہ کہہ کر وہ مونچھوں پر بل دیتا چلا گیا۔

پھر چند لڑکے نہایت تنگ جینز پہنے داخل ہوئے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے "بلو (Blue) خواب ہوں گے آپ کے پاس؟"

"ہمارے ہاں ایسے خواب نہیں ہیں جو آپ کو کتابوں رسالوں میں یا دوسری کسی جگہ دستیاب ہو جائیں۔ ہماری دکان میں بڑے چنیدہ خواب ہوتے ہیں۔ ایسے جن کو صحیح معنوں میں خواب کہہ سکتے ہیں"۔

"وہاٹ نان سینس! بکواس بالکل بکواس۔" وہ دھڑ دھڑ کرتے دکان کی سیڑھیاں اتر کر چلے گئے۔

اسی رات ہماری دکان میں آگ لگ گئی۔ سارے خواب جل کر راکھ ہوگئے۔ ان خوابوں پر ہم نے بہت محنت کی تھی۔ ایک عرصے کی تحقیق کے بعد بنائے تھے۔ فہرستیں بنائی تھیں، رجسٹر تیار کیے تھے۔ آرڈر بک تک بنوالی تھی۔ سبھی کچھ جل کر خاک ہوگیا۔

پولیس میں رپورٹ لکھوانے گئے تو انہوں نے کہا،" تم نے آتش گیر مادّے کی دکان کھولی ہی کیوں۔ تم پر مقدمہ چلایا جائے گا۔"

"مگر ہم نے خواب......"

"ہمارے ہاں خوابوں کا شمار آتش گیر مادّے میں ہوتا ہے۔"

قسمت کی بات کہ اگلے دن سے ہمارا جزیرہ جو پردادا کے وقت سے سمندر پر تیر رہا تھا ڈوبنا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے وہ ساری عمارتیں پانی میں چلی گئیں جہاں لوگ خوبصورت اور کمسن بن جاتے تھے، جہاں وہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لیتے تھے۔ وہ ساری باتیں خواب وخیال ہوگئیں۔ رہے نام اللہ کا۔

فہمیدہ ریاض

دسترس

غل غپاڑے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ اکیسویں روزے کی بات ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ میں پڑوس کے انتہائی کام چلاؤ بیوٹی پارلر میں بیٹھی تھی۔ مجھے صرف بالوں کی ذرا سی ٹرمنگ کرانی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح افطار سے پہلے ہوجائے۔

یہ پارلر تو بس نام ہی کا تھا۔ میری گلی کی ایک لڑکی نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں دو چار آئینے اور بینچیں رکھ کر کمرے کو پارلر کا نام دے دیا تھا۔ اس نے کہیں سے بال کاٹنے کی اچھی تربیت لی تھی اور مہنگائی اس دور میں جبکہ بکری کا گوشت ایک سو بچانوے روپے فی کلو بک رہا تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر کم داموں میں بال کاٹ دیتی تھی۔ دراصل اوپر کا خرچ تھا ہی نہیں۔ کنگھا قینچی سب اپنی ہی لے کر جانا ہوتا تھا۔

کئی خواتین مجھ سے پہلے آئی بیٹھی تھیں۔ پارلر کی مالکہ رخسانہ ایک خوش مزاج عورت تھی۔ وہ اپنا کام کرتے کرتے باتیں بھی کرتی جارہی تھی۔ عورت اسے میں یوں لکھ رہی ہوں کیونکہ بال بچوں والی تھی، ورنہ میرے منھ پر تو رخسانہ کے لیے لڑکی کے دوسرا لفظ ہی نہیں آتا۔ میں نے اسے بچپن سے جو دیکھا تھا۔ یہیں گلی میں بستہ کاندھے سے لٹکائے اسکول جایا کرتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گلی کی بچیاں جوان ہوئیں۔ ان کے شادی بیاہ ہوئے اور یہ خود بال بچوں والی بن گئیں۔ رخسانہ کا گھرانہ لکھنو کا تھا۔ جب ہندوستان پاکستان کے تعلقات میں نرمی کا کوئی مختصر سا دور سال چھ مہینے کے لیے آیا تھا اس وقت ان لوگوں نے رخسانہ اور اس کے بڑے بھائی شاہد کی ادلے بدلے کی شادی لکھنو میں کردی تھی۔ رخسانہ لکھنو میں کزن سے بیاہی گئی اور شاہد وہاں سے دلہن لے آئے۔ مگر رخسانہ کا دل ہندوستان میں نہ لگا۔ ماں بیمار پڑیں اور وہ تیمارداری کے لیے کراچی آئی تو پھر واپس ہی نہ گئی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ رخسانہ کے شوہر ہر سال ویزا لے کر آتے چھ چھ مہینے قیام کرتے اور پھر کچھ دنوں کے لیے ہندوستان واپس چلے جاتے۔ اس آون جاون کا ایک فائدہ ہم محلے والیوں کو یہ تھا کہ رخسانہ

کے پارلر میں آئے دن لکھنو چکن اور دوسری ہندوستانی مصنوعات کی سیل لگتی رہتی تھی۔

پارلر میں ایف ایم ریڈیو بج رہا تھا۔ خواتین کے ساتھ آئے ہوئے بچے غل غپاڑہ کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ریڈیو کی آواز بھی سنائی دے جاتی ۔ رمضان کے اہتمام میں نعتیں اور حمدیں نشر ہو رہی تھیں۔ نیّرہ نور کی آواز گونج رہی تھی۔

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلِّ علیٰ کہتے کہتے

پرانی نعت تھی۔۔۔ پہلے بھی بہت مسحور کن ہوگی مگر نیرہ کی آواز نے تو جادو بھر دیا تھا۔ کیا حسین ادائیگی تھی! کیا نستعلیق لہجہ! میں عش عش کر رہی تھی دل آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔

نعت ختم ہوئی۔ ریڈیوں پر ایک دوسری آواز لہرائی:

'' کیا سحری اور کیا افطار۔۔ ڈان پراٹھا۔ ڈان پراٹھا۔ اس مقدس مہینے کا لطف دوبالا کرنے کے لیے ہر جگہ دستیاب ترم رم رم!''۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ عام حالات میں اس وقت رخسانہ سب کو چائے پلاتی تھی۔ مگر یہ تو رمضان کا مہینہ تھا۔ چائے کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ پھر بھی رخسانہ نے تکلفاً پوچھ لیا، '' آپ کا روزہ ہے؟''

تمام خواتین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بس ایک میں ہی چور، روزہ خور تھی۔ میں نے کہا۔

'' نہیں۔ مجھے دن میں تین بار دوا کھانی ہوتی ہے۔ چائے پلا دو تو عنایت ہوگی۔''

رخسانہ میرے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ میں شرمندہ ہو کر بیٹھ گئی۔ شرمندہ میں اپنے جھوٹ پر بھی ہو رہی تھی۔ دوا مجھے ضرور کھانی ہوتی ہے مگر دن میں ایک بار۔ وہ میں سحری یا افطار پر کھا سکتی تھی۔ پھر آخر میں روزہ کیوں نہیں رکھتی؟

'' کیوں رکھوں؟'' میں نے دل سے پوچھا۔

'' بھئی نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے''

میں دل ہی دل میں مایوسی سے کھی کھی کر کے ہنسی ۔ پھر دل سے کہا۔

'' بھئی میری عمر میں کیا نفس اور کیسا اس پر قابو! ایسا کوئی کمبخت موقعہ آنے والا نہیں ہے''

پھر بھی۔۔۔۔ دل نے اصرار کیا

'' بس چپ!!'' دل کو ڈانٹا۔۔۔ '' ہم اللہ میاں سے خود بات چیت کرلیں گے۔

حساب دوستاں دردل۔۔۔"

پھر میں درد بھری سوچ میں ڈوب گئی۔ اے خدا تو نے مجھے کسی گلّے میں شامل کیوں نہ کیا؟ کیوں میرا مقسوم بس الگ ہی چلتے رہنا ہے؟ گلّے میں شامل ہو کر کتنا سکون مل سکتا تھا۔ سب کے ساتھ اُٹھنا، سب کے ساتھ بیٹھنا! سجدہ، رکوع، قیام، سب کے ساتھ!

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز!"

مجھے ایرانی جواں مرگ شاعرہ فروغ فرخزاد کی نظم یاد آئی، اس کی درد بھری، دل چیرنے والی سطریں۔۔۔

آہ! میں گلّے سے کیوں اور کیسے بچھڑ گئی۔

کس طرح، کسی رات، میں چاند کے سحر میں گرفتار ہو کر اکیلی ہو گئی۔۔۔

"ہاں۔۔۔ آہ!" دل نے سوچا۔" وہ میری کوئی ہم روح تھی۔۔۔۔ اکیلی رہنا اس کی تقدیر تھی۔ تقدیر۔۔۔۔ تنہا، شرمندہ، چور بن کر رہنا ہی ہمارا مقسوم ہے۔۔۔ کیسی عجیب بات۔۔۔ کہ ہم پھر بھی خود کو بدلنے پر آمادہ نہیں۔

رخسانہ چائے لے آئی۔ روزہ دار خواتین نے نگاہیں پھیر لیں۔

میں چائے زہر مار کرنے لگی۔ ریڈیو پر اب شاہ نامہ اسلام سنایا جا رہا تھا اور اس کی تفسیر بتائی جا رہی تھی۔

مدینہ منورۃ میں یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ چند یہودیوں نے بھرے بازار میں ایک مسلمان عورت کے ساتھ دست درازی کی۔ اس پر بات بڑھ گئی اور ایک مومن نے ایک یہودی کو واصل جہنم کر دیا۔ ایک بد بخت یہودی شاعر نے اس کا مرثیہ لکھا تو آخر کار اس بد بخت شاعر کا بھی تلوار کے ایک وار سے منہ بند کرنا پڑا۔"

ریڈیو پر "شاعر" کا لفظ سن کر مجھ پر مزید گھڑوں پانی پڑ گیا۔

یہ شاعر۔۔۔ شاعر ہوتے ہی ایسے ہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ شاعری ایک مکروہ فعل ہے اسلام میں۔ شاعروں کا دماغ و دل باغی ہوتا ہے۔ جانے کہاں کہاں کے خیالات ان کے دماغ میں بھرے ہوتے ہیں۔ شاعر ہمیشہ ہر کام الٹا کرتے ہیں اور نت نئے فتنے کھڑے کرتے رہتے ہیں۔ پھر جیل جاتے ہیں۔

ایک مصرعہ ذہن میں گونجا۔" قلب او مومن دماغش کافر است"

اچھا! تو کیا میرے اندر بھی مسلمان اور منکر کے درمیان جنگ ہے؟
نہیں۔۔۔ ایسی کوئی خاص جنگ ونگ نہیں ہے۔ بس میلنکولی ہے۔
میلنکولی۔۔۔ مالی خولیا۔۔۔ اداسی، آنسو آہیں۔۔۔ یہ بھی ایک طرح کی ''خودرحمی'' اور نفسیاتی بیماری ہے۔ شاعر یا فنکار کیا نفسیاتی مریض ہوتے ہیں؟ فرائڈ نے فنکاروں کے نفسیاتی تجزیے کی جان توڑ کوشش کی تھی۔ اور پھر منہ کی کھائی۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔ دل نے قہقہہ لگایا۔ عین اس گھڑی جب تمام شواہد کے مطابق، شاعر یا فنکار قابل رحم، ذلتوں کے مارے، ممکنہ خطرناک نفسیاتی مریض ثابت ہوسکتے تھے جو معاشرے کے کوڑے دان میں پھینکنے کے لائق ہوں۔ عین اس وقت وہ کوئی ایسی تصویر بنائے۔ شاعری کرتے یا ناچتے گاتے ہیں کہ خلقت مسحور ہوکر رہ جاتی ہے۔ مسحور مبہوت نگراں ان کے دلوں سے ایک خاموش آواز اٹھتی ہے۔۔۔ ''واہ!'' اور صدیوں تک کہیں فضا میں تھرتھراتی رہتی ہے۔''

''اور پھر کیا ہوتا ہے؟''

''ماہرین نفسیات پھر ان تخلیقات کا کوئی نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔ مگر۔۔ ہا ہا ہا۔۔ کوئی رمز ہے جو اپنے ہاتھ میں آتی۔۔ کوئی بھید، کوئی اسرار!! ہاہاہا وہ تو بس صرف فنکار ہی جانتا ہے۔۔''

پھر گھبرا کر سوچا کہ دراصل بدبخت فنکار خود بھی اس بھید یا اسرار یا رمز کو نہیں جانتا اور نہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ جاننے کا دعویٰ ہر وقت کرتا رہتا ہے۔ چائے ختم ہوگئی۔ اب تک تمام خواتین جا چکی تھیں۔ میں سب سے آخر میں آئی تھی۔ اب کہیں جا کر میری باری آئے گی۔ کمرے میں اچانک خاموشی چھا چکی تھی۔ اب ریڈیو کی آواز آسانی سے سنائی دے رہی تھی۔ شاہنامہ کی تفسیر جاری تھی مگر ایک بریک آیا تھا۔ ایک نوجوان مردانہ آواز نے کہا:

''ہماری دانے دار چائے خریدیئے اور انعامی ٹوکن حاصل کیجئے۔ قرعہ اندازی عید سے پہلے۔ بالکل نئی کار حاصل کیجئے۔ رمضان مبارک کا خصوصی منصوبہ۔ امت مسلمہ کو اکیسویں روزے کی دلی مبارکباد۔۔ اسی کو کہتے ہیں۔۔۔ عید سے پہلے عیدی۔۔۔ ترم رم رم۔۔۔''

میں مسکرانے لگی۔ رخسانہ قینچی اور کنگھا سنبھالے میری طرف آرہی تھی۔
میرے ذہن میں پھر وہ مصرعہ گونجا، قلب او مومن دماغش کافر است
میں نے سوچا۔۔ نہیں۔۔ میرے ساتھ معاملہ الٹا ہے۔ میرا دماغ غالباً اسلامی ہے، یہ میرا دل ہے۔ میرا قلب۔۔ جو آخری گہرائی تک کافر ہے۔ اور۔۔۔ رہے گا۔۔۔

ریڈیو کہہ رہا تھا۔ رمضان مبارک کا خصوصی پروگرام: افطار کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا ہے۔ اب افطار میں پندرہ منٹ رہتے ہیں۔ صرف پندرہ۔۔۔۔ منٹ۔۔۔۔!"

اتنے میں دروازے سے رخسانہ کا شوہر اندر آیا۔ یہ پرویز ہے۔ میں نے اس کبھی کبھار دیکھا تھا۔

"آداب بیگم صاحبہ" اس نے شستہ لکھنوی لہجے میں کہا اور جھک کر آداب کیا۔

"وعلیکم۔۔۔" میں نے ہکا بکا ہو کر کہا۔

"معاف فرمائیے گا میں مخل ہو رہا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ مسئلہ ہی کچھ ایسا آن پڑا ہے۔ شاید آپ میری کچھ مدد کر سکیں۔"

"فرمائیے۔۔" میں نے مستعدی سے کہا۔

"آپ تو جانتی ہیں۔" پرویز نے کہنا شروع کیا" ہماری شادی کو سات برس ہو گئے ہیں۔ مجھے ہر سال ویزا لے کر آنا پڑتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح مجھے پاکستانی شہریت مل جائے تو بے یقینی کا یہ عالم ختم ہو۔۔۔"

میں سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے کہا۔" تو اس سلسلے میں آپ کی میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟ آپ درخواست دے دیجئے"

"آپ کی ملاقات تو بڑے بڑے لوگوں سے ہوگی۔"

"افسوس! میری ملاقات کسی سے بھی نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

پھر مجھے ایک بات سوجھی ۔ میں نے کہا۔" صاحبزادے آپ خوامخواہ اپنے تئیں الجھن میں ڈال رہے ہیں۔ اپنا ہندوستانی پاسپورٹ پھاڑ کر پھینکئے اور شناختی کارڈ بنوا کر پاکستانی پاسپورٹ حاصل کر لیجئے۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔"

ریڈیو کی آواز گونجی،" افطار میں اب بارہ منٹ رہتے ہیں۔ افطار کاؤنٹ ڈاؤن۔۔۔"

میں نے پرویز کو یہ صلاح اس لیے دی تھی کیونکہ مجھے خیال آیا تھا کہ پاکستانی شہریت حاصل کرنے کے لیے درست راستہ اختیار کرنے پر یہ معصوم سا، دبلا پتلا، معنک ہندوستانی، جو کورنش بجاتے ہوئے دوہرا ہوا جا رہا تھ، کسی مشکل میں پھنس سکتا ہے۔ قدم قدم پر اہلکار اس سے رشوت اینٹھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات قطعاً ناگزیر تھی۔ یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ اسے ہندوستان واپس بھیج دیا جائے۔ نہیں تو سب سے آسان اور محفوظ راستہ کیوں نہ اپنایا جائے۔

پرویز اور رخسانہ دونوں خاموش رہے۔ پھر رخسانہ نے دبی زبان سے کہا،" باجی۔۔۔ بات

یہ ہے وہ یہ اب آنکھوں میں آگئے ہیں۔ جب وہ دھماکہ ہوا تھا نہ۔۔۔''

کون سا دھماکہ؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

رخسانہ نے کہا،'' نائن الیون کے بعد۔۔۔''

'' نائن الیون !!'' اب تو میرے حواس باختہ ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے پرویز پر نظر ڈالی۔ کیا اس بے چارے مسکین پر امریکا کے ٹریڈ ٹاورز گرانے کا الزام تھا!

'' نہیں نہیں۔۔۔'' رخسانہ نے کہا۔ ٹریڈ ٹاورز کا دھماکہ نہیں ۔۔ اس کے بعد جب اس ہوٹل کے سامنے دھماکہ ہوا تھا۔ سترہ فرنچ سیلرز جب مارے گئے تھے۔۔۔

تب ۔۔۔! انہیں سی آئی اے نے اُٹھالیا تھا۔۔ کہتے تھے، بتاؤ تمہارے دوسرے ساتھی کون ہیں۔ کہتے تھے، تم ہندوستانی ہو۔ ویزا کی مدّت ختم ہونے کے بعد بھی یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ یہ دھماکہ ہمارے دشمن ملک ہندوستان نے کرایا ہے۔ تم را کے ایجنٹ ہو۔''

'' سی آئی اے نے اُٹھالیا تھا!'' میں نے سہم کر دوہرایا۔

'' افطار کاؤنٹ ڈاؤن : اب صرف چار منٹ رہتے ہیں''

'' پانچ لاکھ مانگ رہے تھے۔'' رخسانہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔'' بڑی مشکل سے ساٹھ ہزار دیئے۔ وہ بھی تب چھوڑا جب انہیں یقین ہوگیا کہ اس سے زیادہ ایک پائی بھی اس گھر سے نہیں نکل سکتی چاہے پرویز کو مار مار کر ہلاک ہی کیوں نہ کردیں۔ اس سے زیادہ ہم دے ہی نہیں سکتے تھے۔ میں نے اپنی چوڑیاں۔۔'' اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

'' سامعین! کراچی اور گردونواح میں افطار کا وقت ہو چکا ہے۔''

'' اللہ اکبر۔۔۔ الا۔۔۔ ھو۔۔ اکبر۔۔۔'' اذان کی دلنشین، سحر آگیں صدا بلند ہوئی اور پورا نیلا آسمان اس آواز سے بھر گیا۔ اذان سے ارض و سماوات وجد میں آئے۔

تھری۔۔۔ ٹو۔۔۔۔ ون۔۔ گو!'' کسی نے اُلٹی گنتی گنی، زمین پر دور دور تک۔۔۔ مسجدوں میں بارگاہوں میں، ہوٹلوں میں، چوپایوں میں صحراؤں کے خیام میں اور گھروں کے صاف ستھرے آنگنوں میں مسلمان کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

یہ ایک طرح کی ریس تھی۔ یا شاید وہ میزائل کی مانند خلا میں بلند ہو رہے تھے۔ اندھیروں میں دور دور تک سبز بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ مرغی کی ٹانگیں، تکّے ، چرغے، تیزی سے ہلتے ہوئے جبڑے، دانت، زبان، حلقوم۔۔۔ پوری خلا میں پھیلتے جا رہے تھے۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک نیم اندھیرے کمرے میں، کمزور سے بجلی کے بلب کے نیچے پرویز ایک گول اسٹول پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف خاکی وردی میں بڑی بڑی مونچھوں والے فربہ جوان کھڑے ہیں۔

زرد روشنی ان کے رخ پر کانپ رہی ہے۔

''پانچ لاکھ۔۔۔'' وہ دوہرا رہے ہیں۔

آنکھیں کھولیں تو پرویز جا چکا تھا۔ رخسانہ میرے بال کاٹ رہی تھیں۔

''نہ جانے کتنوں سے وصول کیا ہوگا!'' میں نے خفیف سی جھرجھری لے کر کہا

بیسیوں سے۔۔۔'' رخسانہ نے کہا۔ '' وہی تو تھے ان کے چاندی بنانے کے دن۔۔۔''

بال کٹوا کر میں پارلر سے باہر آگئی۔ سڑک اب تک سنسان تھی اور دکانیں بند تھیں۔ عوام روزہ افطار کر رہے ہیں۔ یہ دکانیں اب تراویح کے بعد کھلیں گی۔ سڑک قمقموں سے آراستہ تھی۔ جگمگاتی سنسان سڑک کا یہ ایک غیر یقینی منظر تھا۔ سرمئی اندھیرے میں جگمگاتی شاہراہ۔۔۔ میں آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی سمت جا رہی تھی۔ مجھے کوئی روزہ نہیں افطار کرنا تھا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ ڈرائی کلیننگ کی دکان کے بڑے سے شیشے کے دروازے پر ایک نیا بینر آویزاں تھا۔ عمرے کی ارجنٹ سعادت حاصل کرنے کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔۔۔'' اردو اور انگریزی الفاظ کو اب سب نے قبول کرلیا ہے۔ یہ سوچتی ہوئی میں چلتی گئی۔ ایک دکان کی ونڈو میں چھوٹا سا اشتہار۔۔۔ دو منٹ میں تمام گناہ معاف کرائیں۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر نیچے لکھی ہوئی تحریر پڑھی۔ کوئی قرآنی آیت تھی۔ جس کا سولہ مرتبہ نہار منہ ورد کرنے پر تمام گناہ معاف ہو سکتے تھے۔ ''وی ہیو بی کم ٹائم کانشس'' میں نے تعریفی جذبے کے ساتھ انگریزی میں سوچا۔ انگریزی میں۔۔۔ کیوں کہ میں مغرب زدہ ہوں؟ سب ہی تو یہ کہتے ہیں۔۔۔ اسی سے تو چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے آج دنیا بھر کے مسلمان جدوجہد کر رہے ہیں۔ میری جواں سال، امریکا میں تعلیم یافتہ دوست بھی یہی کہتی ہے۔ وہ نماز میں پڑھنے لگی ہے اور روزے رکھ رہی ہے۔ اس کے دلکش چہرے پر اب سکون اور طمانیت کی مدھم روشنی بکھری رہتی ہے۔ پہلے کتنی مضطرب رہتی تھی۔ میری طرح۔۔۔ خیر میں تو آہ و بکا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس سنہ دوہزار تین میں۔ جبکہ سمندر کی ایک بڑی، تازہ اور توانا لہر کی طرح ایک مذہب، اسلام اپنے پیروکاروں کو صداقت، پاکیزگی، خود اعتمادی اور طاقت کے منزہ، سپید جھاگ بھرے نمکین پانی سے نہلانے کے لیے چاروں کھونٹ سے امنڈتا ہوا پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔

مسعود اشعر

میں نے جواب نہیں دیا...

اب جو ای میل آیا تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا ہے۔ شوہر بھی اور وہ ملک بھی۔ کیوں؟ یہ اس نے نہیں لکھا۔ بہت ہی سرسری سا ای میل تھا۔ روکھے سوکھے لفظوں میں بس ایک خبر۔ یہ بھی نہیں لکھا کہ آج کل وہ کہاں ہے۔ یہ ای میل بھی ڈیڑھ دو سال بعد آیا تھا۔ یہ پورا عرصہ وہ غائب رہی تھی۔ نہ خط نہ ای میل۔ خیر، خط تو وہ لکھتی ہی نہیں تھی۔ ای میل پر ہی ہماری باتیں ہوتی تھیں۔ ڈیڑھ دو سال پہلے تک روزانہ نہیں تو ہفتے میں ایک دو ای میل ضرور آجاتے تھے اور میں بھی فوراً ہی جواب دے دیتا تھا۔ کبھی کبھی انٹرنیٹ پر چیٹ بھی ہو جاتی تھی۔ ہر موضوع پر بات ہوتی تھی ہماری۔ ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا اور سنجیدہ باتیں بھی۔ وہ مجھے بدھ مت کے بارے میں بتاتی تھی اور میں اپنی استطاعت کے مطابق اسلام پر اس کے سوالوں کے جواب دیتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی مہینے چلتا رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے ای میل آنا بند ہو گئے۔ میں ای میل کرتا تو کوئی جواب نہ آتا۔ میں نے بار بار ای میل کیے۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ کچھ دن بعد میرے ای میل بھی واپس آنا شروع ہو گئے۔ اس نے اپنا ایڈریس ہی بدل لیا تھا۔ کیوں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ سلسلہ آہستہ آہستہ ٹوٹتا تو شاید مجھے محسوس بھی نہ ہوتا کہ ہر رشتے اور ہر تعلق کی گرمی اور جوش وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوئی جاتا ہے اور پھر ہم تو اتنی دور الگ الگ دو ملکوں میں بیٹھے تھے۔ لیکن یہ ایکا ایکی سلسلہ ٹوٹنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ کچھ ہفتے یا ایک دو مہینے میں سوچتا رہا۔ یہ اسے ہوا کیا ہے؟ کہاں غائب ہو گئی ہے؟ پھر میں بھی بھول بھال گیا۔ آخر ہمارا تعلق ہی کتنا تھا؟ یہی دو چار دن کی ملاقات اور ایک رات اس کے گھر۔ اس کے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ تو اپنے سوامی کو بہت چاہتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کا سوامی بھی اس پر جان چھڑکتا ہے۔ جی ہاں، وہ اپنے شوہر کو سوامی کہتی تھی کہ اس ملک میں ہر بیوی اپنے شوہر کو سوامی کہتی ہے اور میں نے جب اسے بتایا تھا کہ سوامی کا مطلب آقا یا مالک ہوتا ہے تو اس نے بڑے فخر سے کہا تھا، ہاں، وہ میرا مالک ہی ہے، وہ میرا مالک اور میں اس کی مالک۔ یہ کہہ کر وہ

خوب ہنسی تھی۔ بعد میں جب ہمارے درمیان ای میل کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ لکھتی تھی، ''دعا کرو، میں مرتے دم تک اپنے سوامی اور بدھ مت کے ساتھ وفادار رہوں۔'' یہ بات خاص طور پر وہ اس وقت لکھتی جب میں مذاق مذاق میں اس کے ساتھ فلرٹ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ میں اس کے شوہر سے بھی ملا تھا۔ اب ایک دو دن میں تو میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ مگر ملنے جلنے میں وہ ٹھیک ٹھاک انسان معلوم ہوتا تھا۔ بہت خوش مزاج اور ملنسار۔ دونوں ہی بہت خوش نظر آتے تھے۔

اب میں نے فوراً ہی اسے ای میل کیا۔ یہ حادثہ کیسے ہوگیا؟ اس کی وجہ کون بنا؟ یہ رشتہ کیوں ٹوٹا؟ تھوڑی بہت تفصیل تو بتاؤ؟ مگر وہ پھر غائب ہوگئی تھی۔ اس نے پھر جواب دینا پھر بند کر دیے تھے۔

☆☆☆

میرے ہاتھ میں بھری ہوئی پلیٹ تھی اور میں کھڑا ہنس رہا تھا۔ شیرٹن کا ڈائننگ ہال یہاں سے وہاں تک خالی پڑا تھا۔ سفید جھک میز پوش سے ڈھکی ہر میز مجھے للچا رہی تھی اور مجھے ہنسی آرہی تھی کہ اتنی بہت سی میزوں میں سے مجھے کسی ایک میز کا انتخاب کرنا تھا۔ اگر اس وقت کوئی اور بھی وہاں ہوتا تو شاید میں یہ حرکت نہ کرتا۔ جو میز بھی اپنے قریب نظر آتی شرما حضوری کو وہیں بیٹھ جاتا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور صبح دس بجے کے بعد وہاں ہوتا بھی کون۔ سب لوگ ناشتہ کرکے چلے گئے تھے۔ میری فلائٹ رات کو دیر سے پہنچی تھی۔ صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ جلدی جلدی تیار ہوکر نیچے آ گیا تھا۔ شکر ہے ابھی دسترخوان بڑھایا نہیں گیا تھا۔ ہال کے بیچوں بیچ کئی میزوں پر ناشتے کا سامان سجا ہوا تھا۔ پہلے تو ان میزوں پر اتنی بہت سی چیزیں دیکھ کر ہی فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ کیا کھاؤں، کیا نہ کھاؤں (اور یہ میرے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے) اور جب کامیابی کے ساتھ یہ مرحلہ طے کرلیا تھا تو اب اس سوال کا سامنا تھا کہ کہاں بیٹھوں؟ پہلے ایک دیوار کے ساتھ پڑی میز کی طرف دیکھا۔ پھر خیال آیا اِدھر تو میں بہت کونے میں چلا جاؤں گا۔ ہال کے بیچ میں پڑی میزوں میں سے ایک میز کی طرف قدم بڑھایا تو سوچا، اتنے بڑے ہال کے بیچوں بیچ اکیلا ٹڑوں ٹوں بیٹھا کیا اچھا لگوں گا؟ اسی شش و پنج میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک الگ تھلگ سا گوشہ نظر آیا، گوشہ یا کنج جسے انگریزی میں alcove کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شیشے کی دیوار کے پیچھے سوئمنگ پول تھا اور اس کے اردگرد ہری کنچل گھاس اور پھولوں کی کیاریاں۔ ایک آدمی لمبا سا بانس ہاتھ میں لیے

سوئمنگ پول کی صفائی کر رہا تھا۔ سوچا یہی سب سے اچھی جگہ ہے۔ تنہائی بھی ہے اور دوسرا ہٹ بھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں پہنچا اور سوئمنگ پول کی طرف منھ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ہلکی سی کٹاک کی آواز آئی، جیسے پلیٹ پر کانٹا یا چمچہ لگا ہو۔ میں گھبرا گیا۔ ارے، یہاں تو کوئی ہے؟ اگر کوئی ہے تو اس نے میری عجیب وغریب حرکتیں بھی دیکھ لی ہوں گی؟ شکر ہے اس وقت تک پلیٹ میز پر رکھ چکا تھا ورنہ وہ فرش پر ہوتی۔ ہاں، ہاتھ سے وہ نیپکن گر گیا جسے گھٹنوں پر پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیپکن اٹھانے کے لیے جھکا تو کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ جہاں سے وہ گوشہ شروع ہوتا تھا اس کے ساتھ ہی آگے کو نکلی ہوئی پتلی سی دیوار کا ایک کولا سا بن گیا تھا۔ اس کولے کو اوٹ میں ایک صاحبہ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں۔ ایک نظر میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا کہ وہ بھرے بھرے بدن اور کھلتے رنگ کی عورت ہے۔ جلدی جلدی نیپکن گھٹنوں پر پھیلا دیا اور پلیٹ کی طرف جھکا۔ لیکن ابھی چھری اور کانٹا اٹھایا ہی تھا کہ ایک کوندا سا لپکا: اوہو، یہ تو وہی عورت ہوگی جس کا ذکر ڈونا نے کل رات کیا تھا؟ رات کو ہوٹل پہنچتے ہی ڈونا کے کمرے میں فون کیا تھا کہ میں حاضر ہو گیا ہوں تو اس نے آدھی سوئی آدھی جاگی آواز میں کہا تھا۔ ''تم بہت دیر سے پہنچے۔ جلدی آجاتے تو تمھیں ہائی ایٹ میں کھانا کھلاتے اور ایک بہت ہی زوردار عورت سے ملاقات کراتے۔ وہ تھائی لینڈ کی نمائندگی کر رہی ہے۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ بہت ہی ہنس مکھ اور نہایت جوشیلی عورت ہے۔'' اور پھر یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا، ''اب سو جاؤ۔ صبح مل لینا۔''

اب میں نے ہمت کی اور تھوڑا سا مڑ کر اس عورت کو پھر دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ ظاہر ہے ڈونا نے اسے بھی تمام نمائندوں کے بارے میں بتایا ہوگا اور ان میں میرا بھی ذکر آیا ہوگا۔ اس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر میں نے سلام کے لیے سر ہلایا۔ اس کا سر بھی ہلا اور مسکراہٹ موٹے موٹے ہونٹوں پر پھیل کر کانوں کی گدیوں کو چھونے لگی۔ اب میں نے پلیٹ اٹھائی اور اس کی میز پر چلا گیا۔

''آپ شاید......'' میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ شاید تھائی لینڈ سے آئی ہیں۔ مگر اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی۔

''میرا نام بینگ ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ بہت ہی نرم اور خاصہ گدگدار سا ہاتھ تھا۔ ''نام تو بہت لمبا ہے مگر سب مجھے بینگ کہتے ہیں۔''

''Bang؟'' مجھے بے ساختہ ہنسی آئی مگر فوراً ہی میں نے دبالی۔ دل میں آیا کہ پوچھوں

اس بینگ کا Big Bang سے کیا تعلق ہے؟ مگر ابھی اس کے ساتھ اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی کہ ایسا مذاق کرتا۔ لیکن یہ بات میرے پیٹ میں رہ بھی نہیں سکتی تھی اسی لیے اس سے یہ مذاق میں نے کیا، مگر دوسرے دِن، جب اس سے خوب بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اس کا جواب تھا، ابھی تک تو میں نے کوئی نئی دنیا پیدا نہیں کی مگر ارادہ کچھ ایسا ہی ہے...... پھر اس نے وضاحت کی کہ یہ Bang نہیں Beng ہے۔ اس نے خود ہی اس بینگ کا مطلب نہیں بتایا تو میں نے بھی نہیں پوچھا۔

''میں نے آپ کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب آپ اندر آئے تھے۔'' اس نے کہا اور میں گھبرا گیا۔ اس نے ضرور میرا تماشہ دیکھ لیا ہوگا۔ ''مگر آپ وہاں کھڑے ہنس کیوں رہے تھے؟'' ہاں، اس نے چوری پکڑلی تھی۔

''بس ویسے ہی:'' میں جھینپ گیا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کہاں بیٹھوں؟ ہے نا یہی بات؟'' اس کے ساتھ ہی وہ اس زور سے ہنسی کہ دونوں باچھیں چر کر کانوں تک پھیل گئیں اور آنکھیں بند ہوگئیں۔

''ٹھیک پکڑا آپ نے'' میں نے اپنی شکست مان لی تھی۔

''ہوں،'' اس نے کچھ مذاق اور کچھ سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''بہت سی چیزوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنا مشکل کام ہے۔''

''جی، جی۔'' یہ جی جی میں نے ایسے لہجے میں کہا کہ اس کا کوئی بھی مطلب لیا جاسکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی سوچا۔ یہ پہلی ہی ملاقات میں کیا فلسفہ شروع ہوگیا۔

اب اس کی گہری کالی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ کالی اور تھوڑی سی بھینگی آنکھیں اور میں اپنی آنکھیں جھکائے سوچ رہا تھا کہ بعض بھینگی آنکھیں بھی اچھی لگتی ہیں اور اس عورت میں اگر کوئی خوبصورتی ہوسکتی ہے تو وہ یہی اس کی بھینگی آنکھیں ہیں۔ مگر جب ہنستے ہوئے وہ اپنی آنکھیں میچ لیتی ہے تو اس کی عجیب سی شکل بن جاتی ہے۔

''آپ بینکاک سے آئی ہیں؟'' میں نے جلدی سے موضوع بدلا کہ کہیں انتخاب کے مسئلے پر ہی بات نہ شروع ہوجائے۔

''نہیں، میں ہوں تو تھائی لینڈ کی مگر اب انڈونیشیا میں ہی رہتی ہوں۔'' اس کے ہونٹوں پر ہنسی ایسے چپکی ہوئی تھی جیسے اس کے چہرے کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔ ''میرے شوہر یہاں کے ہیں۔ تھائی لینڈ سے کوئی آیا نہیں تھا اس لیے ڈونا نے مجھے پکڑ لیا۔''

''ہاں، ڈونا اس معاملے میں بہت سمجھ دار ہے۔ اچھے لوگوں پر ہی ہاتھ ڈالتی ہے۔'' میں نے اسے خوش کیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ میری تعریف پر وہ شرمائی تو نہیں مگر کچھ بولی بھی نہیں۔

پھر ہم دونوں ناشتے پر جھک گئے۔ دونوں نہیں صرف میں کہ وہ تو ناشتہ کر چکی تھی اور کافی کی چسکیاں لے رہی تھی۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ہوگی یہی تیس پینتیس سال کی۔ سادہ سی عورت ہے۔ بہت ہی سادہ کپڑے پہنے ہے۔ سفید بلاؤز اور گلابی اور نیلی دھاریوں والا میل خورا سا اسکرٹ۔ چہرے پر میک اپ کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ جیسی ہے بس ویسی ہی ہے۔

''آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے آپ کو پہچانا کیسے؟'' اس نے خاموشی توڑی۔

''جی، ڈونا نے بتایا ہوگا؟''

''ڈونا نے بھی بتایا تھا۔ لیکن امریکا میں ایک پاکستانی عورت میری دوست تھی۔''

''اچھا......؟ تو آپ پہلے ایک پاکستانی سے مل چکی ہیں؟''

''میں نے تو پاکستانی روٹی بھی کھائی ہے'' اس کی باچھیں پھر کانوں تک چر گئیں۔ اب وہ ادھ کھلی پلکوں کی جھریوں میں سے دیکھ رہی تھی۔ ''میری اس دوست نے ہی سب سے پہلے مجھے روٹی کھلائی تھی۔ وہ روٹی مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں ہر ہفتے دو ہفتے بعد اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر کھلاتی تھی۔''

''تو گویا آپ پاکستان کی نمک خوار بھی ہیں؟'' یہ کہہ کر میں نے اسے نمک خواری کا مطلب بتایا۔ جی تو چاہا تھا کہ نمک حلالی اور نمک حرامی کا مطلب بھی بتا دوں مگر ابھی پہلی ہی ملاقات تھی اور وہ بھی چند منٹ کی۔

اس نے بتایا، وہ ماحولیات میں ماسٹرز کرنے امریکا گئی تھی۔ وہ پاکستانی عورت بھی وہیں پڑھتی تھی۔ دونوں میں خوب دوستی ہوگئی تھی اس خاتون نے پاکستان کے بارے میں شاید اسے سب کچھ ہی بتا دیا تھا کہ میں اس پریشانی سے بچ گیا جو کسی غیر ملکی سے پہلی ملاقات میں اٹھانا پڑتی ہے۔ کسی بھی غیر ملکی سے صرف اپنا تعارف ہی نہیں کرانا پڑتا، اپنے ملک کے تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حالات کے بارے میں بھی بہت سے سوالوں کے جواب دینا پڑتے ہیں۔ ہینگ نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو ہمارے متعلق ایسی باتیں بھی جانتی تھی جن کی طرف میری ہی کیا کسی بھی پاکستانی کی کبھی توجہ نہیں گئی ہوگی۔ کافی ختم کر کے ہم اُٹھنے لگے تو اچانک وہ بولی ''مارننگ گڈ'' اس کے ساتھ ہی اس نے شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں کچھ نہیں سمجھا اور بے وقوفوں کی طرح اس کا منھ تکنے لگا۔ اب اس نے آنکھیں میچ کر زور کا قہقہہ لگایا'' اچھا بتایئے۔ آپ کے ہاں گڈ مارننگ کو کیا کہتے ہیں؟''

میں صبح بخیر کہنے ہی والا تھا کہ ایک دم مجھے خیال آیا کہ اصل میں وہ میرے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔ وہ صبح بخیر کا انگریزی ترجمہ کر رہی تھی۔ اسی لیے میں نے اس سے مذاق شروع کر دیا '' ہمارے ہاں گڈ مارننگ یا گڈ نائٹ کہنے کا رواج نہیں ہے۔ ہم ہر موقع پر السلام علیکم سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔ صبح ہو یا شام یا رات، ہر جگہ یہ سلام ہی کام آجاتا ہے اور سلامتی کے معنی آپ جانتی ہی ہوں گی۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا کی ہر سڑک اور ہر گلی میں سلامت اور سلامتی لکھا نظر آتا ہے۔''

ہم تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ ڈر تھا کہ نمائندوں کی رجسٹریشن کا مرحلہ ختم ہو چکا ہوگا اور ڈونا غصّے میں بھری ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔ ڈونا امریکی ہے اور اس ادارے کی مشیر ہے جس میں کام کرتا ہوں۔ بلکہ وہ تو قریب قریب پورے ایشیا میں اس قسم کے تمام اداروں کی مشیر ہے۔ یہ کانفرنس اس کی فاؤنڈیشن نے ہی کرائی تھی۔

'' یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی'' وہ میرے لمبے قدموں کے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے قدم ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔ '' یہ بتایئے، گڈ مارننگ کو آپ مارننگ گڈ کہتے ہیں یا نہیں؟''

'' ہاں، کہتے تو ہیں۔ مگر گڈ مارننگ یا مارننگ گڈ ہمارے ہاں باہر سے آئے ہیں، یہ ہمارے نہیں ہیں۔'' میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

'' مانو گے نہیں تم؟'' یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے پر ہلکا سا چپت لگایا۔ میں نے کہا، '' جلدی چلو۔ ڈونا ہم دونوں کو مارے گی۔ وہ ہماری اماں ہے۔''

اوّل تو امریکا میں رہنے والی پاکستانی عورت ہی ہم دونوں کی قربت کا وسیلہ بن گئی تھی اوپر سے خود اس کانفرنس نے بھی ہمارے درمیان شناسائی اور بے تکلفی بڑھانے کا کافی موقعے فراہم کر دیے۔ کانفرنس میں جتنے بھی ملکوں کے وفد آئے تھے ان کے دو دو تین تین ممبر تھے۔ صرف میں اور بینگ ہی ایسے تھے جو اکیلے اکیلے ہی اپنے ملکوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور پھر پہلے دن ہی بینگ کو میرے اور ڈونا کے لیے ترجمان کا کام بھی کرنا پڑ گیا تھا۔ وہاں باہر سے آنے والے نمائندے تو انگریزی میں تقریریں کر رہے تھے یا انگریزی میں مضامین پڑھ رہے تھے مگر مقامی نمائندے اپنی زبان میں ہی بات کرتے تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آرہا ہے یا نہیں۔ ترجمے کا انتظام بھی نہیں تھا۔ ڈونا ان ملکوں میں ہونے والی کانفرنسوں سے خوب واقف تھی

اس لیے اس نے اپنے اور میرے بیچ بینگ کو بٹھالیا کہ بی بی، تم ہمارے لیے ان مقالوں اور تقریروں کا انگریزی میں ترجمہ کرتی جاؤ۔ پہلے تو بینگ نے بہت شور مچایا کہ میں خود ہی اچھی طرح یہ زبان نہیں جانتی، ترجمہ کیا کروں گی۔ لیکن جب ڈونا نے بہت اصرار کیا تو مان گئی۔ اب حال یہ تھا کہ بینگ کا منہ کبھی ڈونا کے کان کی طرف ہوتا، کبھی میری طرف۔ میری سمجھ میں کچھ آرہا تھا، کچھ نہیں آرہا تھا مگر میں ان دونوں کو خوش کرنے کے لیے یونہی سر ہلاتا رہا۔

پہلے دن تو میں نے کسی نہ کسی طرح یہ تماشا برداشت کرلیا لیکن دوسرے دن بینگ سے کہا، ''میں تو شہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایسی کانفرنسیں میں نے بہت دیکھی ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی کانفرنس ہو اور کسی بھی موضوع پر ہو ایک سی ہی ہوتی ہے۔ اس کے ہر اجلاس میں شرکت کرو نہ کرو تمہیں سب معلوم ہوجاتا ہے کہ کس نے کیا کہا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اگر بولنے والے کا نام معلوم ہو تو خود ہی علم ہوجاتا ہے کہ وہ کیا کہے گا۔ اس لیے میں تو صبح کے اجلاس میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی شکل دکھاؤں گا اور پھر غائب ہوجاؤں گا۔ یعنی شہر کی سیر کروں گا۔ اگر ان اجلاسوں اور اجلاسوں کے بعد کھانے پینے میں ہی لگا رہا تو اپنے ملک لوٹنے کا دن آجائے گا اور میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔''

یہ کام میں اسے بتائے بغیر بھی کرسکتا تھا لیکن اسے بتانے میں میری ایک غرض تھی۔ مجھے کسی گائیڈ کی ضرورت تھی اور اس سے اچھا گائیڈ اور کون ہوسکتا تھا۔ ایک اچھا اور مفت کا گائیڈ۔ وہ بھی میرا حسنِ طلب فوراً ہی سمجھ گئی اور ساتھ چلنے کو تیار ہوگئی۔ اس نے بھی بہت سی کانفرنسیں دیکھی تھیں۔ کہنے لگی۔ ''میں نے بھی پورا شہر کہاں دیکھا ہے۔ میں جس شہر میں رہتی ہوں وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے لیکن اتنے سال سے ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ فرصت ملی تو دیکھ لیں گے۔ میں چھٹیوں میں اپنے باپ کے پاس بینکاک چلی جاتی ہوں۔ وہ بیمار ہیں اور اکیلے ہیں۔ باقی دنوں میں ہم دونوں کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہم دونوں کو، یعنی میاں بیوی کو۔''

اب ہم ڈونا کی آنکھ بچا کر ہوٹل سے نکلتے اور شہر دیکھنے چل پڑتے۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک بازار سے دوسرا بازار اور ایک میوزیم سے دوسرا میوزیم۔ دو دن میں ہم جتنا بھی دیکھ سکتے تھے دیکھ لیا اور جو کچھ بھی خرید سکتے تھے خرید لیا۔ حتیٰ کہ میں نے ایک تحفہ خرید کر بینگ کو بھی دے دیا۔ یہ بہت ہی سستا سا تحفہ تھا۔ لکڑی کا فروٹ بول۔ لکڑی پر بنا ہوا کیلے کا بہت ہی خوبصورت پتہ۔ اوّل تو وہ لیتی نہیں تھی اور جب میں نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس پر وہ پتہ رکھ دیا تو شکریہ ادا کرکے اس کا برا حال ہوگیا۔ اب ہماری دوستی پکی ہوگئی۔

میرے لیے چیزوں کی خریداری بھی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کس کے لیے کیا خریدوں۔ بینگ سے مدد چاہی تو وہ مجھ سے بھی دو قدم آگے نکلی۔ کہنے لگی یہ کام میں نہیں کر سکتی۔ میں خود ہی گھبرا جاتی ہوں تو تمہارے لیے کیسے خرید سکوں گی اور پھر مجھے کیا معلوم تمہارے گھر والے کیا پسند کریں گے۔ تم خود ہی پسند کرو۔ اس پر میں نے اسے چھیڑا۔ تم نے اپنا سوامی کیسے پسند کیا تھا؟ یہ سن کر وہ رتن کی بنی ہوئی ٹوکریوں اور کھلونوں کے درمیان رُک کر کھڑی ہوگئی اور اتنی دیر کھڑی رہی جب تک اس نے مجھے یہ نہیں بتا دیا کہ ان کی شادی پہلی نظر کی محبت والی شادی نہیں تھی۔ یہ تعلق آہستہ آہستہ پروان چڑھا تھا۔ امریکا کی جس یونیورسٹی میں وہ پڑھتی تھی وہاں وہ دونوں ہی جنوب مشرقی ایشیا کے تھے باقی امریکا یا دوسرے علاقوں کے طالب علم تھے۔ وہ تو اپنے ملک میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر وہاں اسے یہ آدمی پسند آ گیا اور پسند بھی اس لیے آیا کہ وہ اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ ''آدمی زیادہ سوچے تو اُلجھن میں پھنس جاتا ہے۔'' وہ بید کی نہایت ہی نازک تیلیوں والی ٹوکری ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ ''اور جب اُلجھن زیادہ ہو جائے تو آدمی ایک دم چھلانگ لگا دیتا ہے۔ گھبرا کر کوئی بھی فیصلہ کر لیتا ہے۔'' وہ ٹھہری۔ پھر جلدی سے کہا ''مگر میری پسند بہت اچھی نکلی۔ میرا سوامی سچ مچ بہت ہی اچھا انسان ہے۔ ہم نے امریکا میں ہی شادی کی تھی۔ رجسٹرار کے پاس۔''

اس کے بعد میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اب پوچھنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو بتا دیا تھا اس نے اپنے بارے میں۔ میں بھی اپنے متعلق سب کچھ بتا چکا تھا۔ دو دن جو ہم نے شہر چھانا تھا اس میں ہم خاموش تو نہیں رہے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے تھے۔ کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس پر ہم نے باتیں نہ کی ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب اس نے ڈونا کو بتایا کہ اس کا شوہر مسلمان ہے۔ حیرت بھی اور افسوس بھی۔ یہ اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ اس نے اپنی شادی اور شوہر کے بارے میں تو سب کچھ بتا دیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا شوہر مسلمان ہے۔ کیوں؟ اب ڈونا کے سامنے یہ بات کیوں بتا رہی ہے؟ معلوم نہیں میرا یہ افسوس یا غصہ صحیح تھا یا غلط لیکن افسوس تھا مجھے۔

یہ دوسری شام کی بات ہے۔ بینگ نے روٹی روٹی کا اتنا شور مچایا تھا کہ ڈونا ہم دونوں کو ایک انڈین ریستوراں میں لے گئی تھی۔ اس وقت ہم بالٹی گوشت، کباب اور گرم گرم تنوری روٹی کھانے کے بعد پان کھا رہے تھے۔ پان میں نے اس لیے کہا کہ ہمارے سامنے واقعی ایک پرانا

دھرانا پاندان رکھا تھا۔ پان تو نہیں تھے مگر پاندان کی ننھی ننھی کلھیوں میں چھالیہ، سونف اور سوکھا دھنیہ رکھا تھا اور میں اِن دونوں کو سمجھا رہا تھا کہ اسے کیسے کھاتے ہیں۔ اس ریستوراں میں چوڑی دار پاجامے اور رنگ برنگے ململ کے کرتے پہنے جو لڑکیاں پھر رہی تھیں وہ تو اسی ملک کی تھیں مگر پاندان واقعی مراد آبادی تھا۔ بینگ نے چٹکی بھر چھالیہ اور سونف منھ میں ڈالی اور ڈونا کی طرف منھ کر کے بولی، ''میرا شوہر مسلمان ہے۔''

''ریلی......؟'' ڈونا نے اس ریلی کو اتنا کھینچا کہ اس کی کچھ ہری اور کچھ نیلی آنکھیں باہر اُبل پڑیں۔

''ہاں......'' بینگ ہنس رہی تھی۔

پہلے تو میں نے سوچا میں خاموش ہی رہوں۔ پھر میں نے کہہ دیا...... ''یہ آگ اور پانی کا ملاپ کیسے ہوگیا؟'' میرے لہجے میں غصہ بول رہا تھا۔

''یہ آگ اور پانی تمہارے ملک میں ہو سکتے ہیں یہاں نہیں'' بینگ کے بجائے ڈونا نے مجھے جواب دیا۔ وہ دونوں ملکوں کو خوب جانتی تھی۔ ''یہاں کا کلچر بالکل ہی مختلف ہے۔ یہ ملا جلا کلچر ہے۔ یہاں سب کو قبول کرلیا جاتا ہے۔تم نے یہاں لوگوں کے نام نہیں سنے۔ یہاں ایک مسلمان بزرگ کا نام مولانا وشنو ہے۔''

''لیکن ہماری شادی کو یہاں کا قانون نہیں مانتا۔'' بینگ نے یہ شاید اس لیے جلدی سے کہا کہ کہیں دوسرا موضوع نہ چھڑ جائے۔ ''یہاں کا قانون یہ ہے کہ میاں بیوی کا ایک ہی مذہب ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر مجھے دیکھا۔ اس نے میرا غصہ محسوس کرلیا تھا۔

''یعنی تم مسلمان ہو جاؤ یا وہ بودھ ہو جائے؟'' ڈونا نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''قانون یہی کہتے ہیں۔'' بینگ نے کہا اور ایسے ہنسی جیسے وہ اس قانون کا مذاق اڑا رہی ہو۔

''تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہو جاؤ ایک ہی مذہب کے۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''یہ تم نے تبلیغ شروع کردی؟'' ڈونا نے جھٹ سے کہا ''ہونا مسلمان۔''

''میں بدھ مت نہیں چھوڑ سکتی۔'' بینگ میری بات کا جواب دے رہی تھی مگر اس کا منھ ڈونا کی طرف تھا۔ ''اور وہ بھی اپنا مذہب کیوں چھوڑے؟''

''تو تمہیں اس سے کوئی پریشانی تو نہیں ہوتی؟'' ڈونا خود پریشان معلوم ہو رہی تھی۔

''ہمیں تو کوئی پریشانی تو نہیں ہوتی؟'' بینگ اسی جوش میں بولی۔ ''ہماری شادی کو چار سال

ہو گئے ہیں۔ مگر کسی نے ہم سے کچھ نہیں کہا۔ یہاں عام آدمی اس کی پروا ہی نہیں کرتا۔ میں جہاں رہتی ہوں وہاں کبھی کسی کو خیال تک نہیں آیا کہ ہمارا مذہب کیا ہے اور ہماری شادی کیسے ہوئی ہے۔''

''تو پھر آرام سے زندگی گزارو۔'' ڈونا نے یونہی رواروی میں کہا اور سونف چبانے لگی۔

میں نے حیرت سے ڈونا کو دیکھا۔ ڈونا کویکر عیسائی ہے۔ کویکر اپنے عقائد میں بہت ہی پکے اور خاصے قدامت پسند ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں شادی کے ارادے کے بغیر عورت مرد کا ملنا جلنا پسند نہیں کیا جاتا۔ وہ گانا بجانا بھی حرام سمجھتے ہیں۔ ان کے چرچ بالکل سادہ سے ہوتے ہیں۔ وہاں کوئی مورتی، کوئی شبیہ یا کوئی ایسی علامت نہیں ہوتی جس میں بت پرستی کا شائبہ تک بھی ہو۔ ان کے ہاں پاکیزگی اور ستر پوشی تک کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ عبادت کرتے ہوئے مرد سر پر ٹوپی رکھتے ہیں اور عورتیں شال اوڑھتی ہیں۔ مرد عام طور پر سیاہ سوٹ پہنتے ہیں اور عورتیں لمبے لمبے اسکرٹ پہنتی ہیں کہ کہیں سے جسم کھلا نہ رہ جائے۔ ان کی عبادت خاموشی کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسے سب مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ ان میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ترقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

یہ سب باتیں مجھے ڈونا نے بتائی تھیں۔ اس لیے جب ڈونا نے یہ بات کہی تو مجھے حیرت ہوئی۔ تو گویا ڈونا کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ ڈونا کو کچھ اور یاد آ گیا۔ اس نے بینگ سے پوچھا ''چار سال ہوئے ہیں تمہاری شادی کو اور بچہ کوئی نہیں ہوا۔ کیوں؟'' یہ بات ایک عورت ہی دوسری عورت سے پوچھ سکتی تھی۔ بینگ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سمجھا، یہ کوئی طبی معاملہ ہوگا۔ وہ بچے پیدا نہیں کرسکتی یا پھر اس کے شوہر میں کوئی خرابی ہے۔ بینگ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لیے ڈونا نے بھی اصرار نہیں کیا۔

پھر مختلف مذاہب میں شادی بیاہ کے قوانین پر باتیں شروع ہو گئیں۔ اب ڈونا کو کچھ یاد آیا اور اس نے کہا۔ ''ہر مذہب میں شادی کے سلسلے میں کچھ قاعدے قانون مقرر ہیں۔ آج کی دنیا نے ان قوانین سے بچنے کے کئی طریقے نکال لیے ہیں مگر پابندیاں اپنی جگہ موجود ہیں۔''

''جیسے میں تمہارے ساتھ شادی کرسکتا ہوں، ان کے ساتھ نہیں کرسکتا۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

اس پر ڈونا اور بینگ دونوں ہی ہنس پڑے۔ بینگ کو انڈونیشیا میں رہتے اتنے برس ہو گئے تھے۔ وہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سے شادی کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی اور ڈونا تو سب کچھ ہی جانتی ہے۔

''لیکن میرے مذہب میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے'' بینگ نے زور سے کہا۔ ''میں جس سے چاہوں شادی کر سکتی ہوں۔ میرا مذہب فرد کو مکمل آزادی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ نروان تک پہنچنے کے لیے بھی آدمی کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اس نے نروان کو ''نبان'' کہا تھا کہ پالی زبان میں یہی کہا جاتا ہے۔

دوسرے دن بینگ اس جوش خروش سے ملی کہ میں اپنا رات والا افسوس یا غصہ سب بھول گیا اور پھر مجھے اس سے شکایت کا کوئی حق بھی تو نہیں تھا۔ دو دن کی ملاقات میں شکایت کیسی؟ ہوگی کوئی مصلحت اس کی۔ وہ اکیلے میں مجھے نہیں بتانا چاہتی ہوگی کہ اس کا شوہر مسلمان ہے۔

بینگ بوگور میں رہتی تھی۔ یہ شہر جکارتا سے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ اس نے دوسرے دن سے ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہاں تک آئے ہو تو بوگور کا باغ ضرور دیکھ کر جاؤ۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا باغ ہے اور جب میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا تھا، ''دنیا کا سب سے بڑا باغ؟'' تو اس نے کہا تھا، دنیا کے بڑے باغوں میں سے ایک کہہ لو۔ لیکن وہ ایسا باغ ہے کہ ایک بار دیکھ لو گے تو کبھی بھولو گے نہیں۔ ''میرے سوامی اس باغ کے انچارج ہیں۔ تم میرے سوامی سے بھی مل لینا۔ بہت خوش ہوگا وہ تم سے مل کر۔'' میں نے سمجھا وہ یونہی مجھے خوش کرنے کے لیے اخلاقاً کہہ رہی ہے، کہاں لے جائے گی مجھے وہاں۔ لیکن کانفرنس کے آخری دن صبح ہی صبح اس نے بتایا ''میں نے سوامی کو فون کر دیا ہے۔ وہ آج شام یہاں پہنچ جائے گا اور کانفرنس ختم ہوتے ہی ہم بوگور چلیں گے۔''

اور شام کے آخری اجلاس میں اس کا سوامی موجود تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا۔ بینگ نے تمہاری اتنی تعریف کی تھی کہ میرا بھی جی چاہا تم سے ملنے کو۔ ''اور پھر تم مسلمان بھی تو ہو، اور پاکستان سے آئے ہو۔ میرا بھائی بھی کراچی کے ایک مدرسے میں پڑھتا ہے۔'' اچھا، تو یہ رشتہ ہے ہمارا؟ میں نے سوچا اور ہنسا۔ اس نے اپنا نام گوت جالی بتایا۔ جب میں نے ٹھہر ٹھہر کر یہ نام دہرایا تو ہنسا اور بولا، ''آپ اسے غزالی کہیں گے۔ ہماری زبان میں غزالی گوت جالی ہو گیا ہے۔'' وہ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ مزے مزے کی باتیں کرتا تھا۔ پہلے تو مجھ سے ادھر اُدھر کے سوال کرتا رہا۔ میرے بارے میں۔ میرے ملک کے بارے میں۔ پھر اپنی باتیں شروع کر دیں۔ اپنی کم اور بینگ کی زیادہ۔ بینگ کی تعریفیں کرنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ اس کے لیے بینگ میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو کسی بھی اچھی بیوی یا اچھے ساتھی میں ہو سکتی ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ بینگ ہی زیادہ

بولتی ہے مگر وہ تو اس کا بھی استاد نکلا۔ جب تک ساتھ رہا بولتا ہی رہا اور ہمارا یہ ساتھ اس اجلاس کے علاوہ اس بس میں بھی رہا جو شام کو ہمیں بوگور لے گئی اور بوگور کے اس ڈرائیور ہوٹل میں بھی جو ہوٹل سے زیادہ سرائے یا لنگر معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کچھ بھی پکا تھا وہ سب کا سب چھوٹے چھوٹے پیالوں میں ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا گیا تھا۔ ہم نے کسی کھانے کا آرڈر نہیں دیا تھا۔ ہمارے کہے بغیر ہی سب کچھ سامنے آ گیا تھا۔ ''یہ سماترا کا طریقہ ہے'' بینگ نے کہا تھا۔ آپ جو چیز جتنی چاہیں کھالیں۔ اسی کے حساب سے بل بن جائے گا۔'' اور واقعی، ہم نے ہر پیالے میں سے تھوڑا تھوڑا چکھ لیا تو بیرا آیا۔ اس نے ہر پیالے کا جائزہ لیا اور وہیں کھڑے کھڑے بل بنا دیا۔

''دیکھا ہمارا پرولتاری کلچر؟'' غزالی نے قہقہہ لگایا اور میں نے سوچا۔ تمہاری یہی باتیں تو بینگ کو بھا گئی ہوں گی کہ دو ملک اور دو مذہب ایک ہو گئے۔

وہ رات میں نے ان کے گھر گزاری۔ یہ صاف ستھرا چھوٹا سا گھر تھا۔ سرکاری گھر جو غزالی کو اس کے محکمے کی طرف سے ملا تھا۔ چار فٹ کی باؤنڈری وال۔ اندر دس بارہ فٹ کا باغیچہ۔ چھوٹا سا تکونا برآمدہ۔ اندر داخل ہوتے ہی صرف ایک صوفہ سیٹ کا تنگ سا لونگ روم، ساتھ ہی چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل پڑی ہوئی، اس کے ساتھ اتنی سی کھلی جگہ کہ اس میں سے ہوکر بیڈروم اور غسل خانے اور باورچی خانے تک جایا جاسکے۔ ہم کافی رات گئے گھر پہنچے تھے۔ اندر جاکر میں نے دیکھا تو مجھے ایک ہی بیڈروم نظر آیا۔ میں گھبرا گیا کہ مجھے لونگ روم میں ہی صوفے پر سونا پڑے گا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا کہ بینگ نے میری پریشانی بھانپ لی۔ وہ ہنسی اور جلدی سے میرا بیگ اٹھا کر ایک کونے کی طرف چل دی۔ اس کونے میں مشکل سے ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا دروازہ تھا۔ دیکھنے میں تو وہ باکس روم معلوم ہوتا مگر اندر ایک تنگ سا پلنگ پڑا تھا جس پر خدا جانے کتنا کاٹھ کباڑ تھا کہ بینگ اور غزالی کو اُسے اٹھانے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ بنانے والوں نے اسے باکس روم ہی بنایا ہوگا مگر ان لوگوں نے اسے کمرہ بنالیا تھا۔ ایک پلنگ، ایک سنگار میز اور ایک الماری کے بعد وہ کمرہ ختم ہوجاتا تھا۔ میں کانفرنس کی جھک جھک اور اس کے بعد کئی گھنٹے بس کے سفر سے اتنا تھک گیا تھا کہ ویلیم کی ایک گولی کھا کر فوراً ہی سوگیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ صبح آنکھ اس وقت کھلی جب کسی عجیب وغریب سے پرندے نے کھڑکی کے باہر شور مچانا شروع کردیا تھا۔ میں نے ایسی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مجھے اشتیاق ہوا کہ دیکھوں یہ کیسا پرندہ ہے۔ کمرے سے نکلا تو بینگ باورچی خانے کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون سا پرندہ ہے؟ میرا سوال سن کر وہ ہنس

دی۔ کہنے لگی یہ پرندہ نہیں ہے، باہر ایک آدمی ناشتے کی چیزیں بیچ رہا ہے۔

اب میں اس کے ساتھ باورچی خانے میں کھڑا تھا۔ وہ پین کیک بنا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ صرف تین دن اور ایک رات میں کسی کے ساتھ اتنی بے تکلفی ہوجائے۔ کسی ایک شخص کے ساتھ نہیں پورے گھر کے ساتھ اور گھر میں صرف اس کا شوہر ہی تو تھا۔ اس کا سوامی۔

☆☆☆

''اسلام کا عدل و احسان ہی اس کا لبرلزم ہے'' بینگ نے کہا اور مجھے ایسے دیکھا جیسے جتا رہی ہو کہ دیکھو میں تمہارے مذہب کو کتنا جانتی ہوں۔

ہم بوگور کے جنگل نما باغ یا باغ نما جنگل میں صدیوں پرانے ایک پیڑ کی چار چار فٹ اونچی ان جڑوں میں سے ایک جڑ پر بیٹھے تھے جو چھوٹی چھوٹی دیواروں کی طرح پیڑ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ غزالی صبح ہی صبح اپنی گاڑی میں ہمیں وہاں چھوڑ گیا تھا اور کہہ گیا تھا، دوپہر کے کھانے پر ملیں گے۔ اس وقت گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔ سڑکوں پر دھوپ خوب چمک رہی تھی مگر آسمان کو چھوتے اونچے اونچے گھنے پیڑوں کے نیچے سورج کی ایک ننھی سی کرن بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ ہم صبح سے گھوم گھوم کر تھک چکے تھے اور تھوڑی دیر کو سانس لینے وہاں بیٹھ گئے تھے۔ ابھی باغ کے بہت سے حصے دیکھنے کو رہ گئے تھے۔ مگر میں نے ہار مان لی تھی اور بینگ سے کہا تھا، ''اب تم پھر کبھی اپنے ملک بلاؤ گی تو اس وقت باقی باغ بھی دیکھ لیں گے۔'' اصل میں اس نے مجھے اس لالچ میں میلوں پیدل چلا دیا تھا کہ وہ پیڑ تو دیکھ لو جس پر دس بارہ برس میں ایک بار ہی دنیا کا سب سے بڑا پھول کھلتا ہے اور میں جب اس پیڑ کے پاس گیا تھا تو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی تھی کہ وہ دس پندرہ فٹ اونچا چھدری چھدری شاخوں والا چھوٹا سا پیڑ تھا۔ بینگ نے بتایا ''اس پیڑ پر ایک تو دس بارہ برس میں پھول کھلتا ہے، دوسرے وہ پھول اپنے قطر میں دس بارہ فٹ چوڑا ہوتا ہے، تیسرے اس میں اتنی گھناؤنی بدبو ہوتی ہے کہ اس کے آس پاس دور دور تک ناک نہیں دی جاتی۔ لیکن جب بھی وہ پھول کھلتا ہے تو دنیا بھر کے لوگ اسے دیکھنے دوڑے چلے آتے ہیں۔'' دیکھنے میں تو وہ کوئی ایسا قیمتی پیڑ نظر نہیں آتا تھا مگر اس کے اردگرد جس طرح لوہے کا جنگلا لگایا گیا تھا اور اس جنگلے کے دروازے میں جس طرح ایک بڑا سا قفل پڑا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی وہ کوئی بہت ہی قیمتی پیڑ ہے۔ ایک تو میں چل چل کے تھک گیا تھا اوپر سے اس پیڑ کو دیکھ کر ایسا بیزار ہوا

کہ فوراً ہی کہیں بیٹھنے کو دل چاہنے لگا تھا۔

''یہ تمہارے سوامی نے بتایا ہوگا؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''یہ تم نے کیوں کہا؟'' اس نے مجھے ڈانٹا۔ ''یہ میں نے خود پڑھا ہے۔''

''اچھا......؟ تو سوامی نے اسلام پر کتابیں پڑھوا دیں؟'' میں نے پھر مذاق کیا۔

''سوامی کو تو فرصت ہی نہیں کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں مجھے کچھ بتائے۔ میں نے خود ہی کتابیں پڑھنا شروع کر دی ہیں'' وہ بڑے جوش میں بول رہی تھی۔

''ہاں، جس نے بھی یہ لکھا ہے بہت صحیح لکھا ہے۔'' میں چونک گیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں نے بھی پہلی بار ہی عدل و انصاف کی یہ تعریف سنی تھی۔ لبرلزم کا یہی تو مطلب ہے کہ دوسروں کی رائے اور ان کے خیالات کا احترام کیا جائے۔ یہی رواداری ہے اور یہی انصاف۔ ''ہر ایک کے ساتھ انصاف کا یہی تو مطلب ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک اور بات بھی میں نے پڑھی۔ اور مجھے اچھی لگی'' وہ پھر بولی۔

''وہ کیا ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مسلمانوں کے قانون وراثت نے ان میں سرمایہ داری پیدا نہیں ہونے دی۔'' اب وہ مجھے سبق پڑھا رہی تھی۔ ''مسلمانوں نے اتنی سلطنتیں قائم کیں، دنیا بھر میں تجارت کی، لیکن کہیں بھی وہ نظام پیدا نہیں ہوا جسے مغرب میں سرمایہ داری نظام کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی وراثت کا قانون تھا۔ یہاں تم بدھ مت کے قریب آ جاتے ہو۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

ابھی یہ باتیں اور بھی چلتیں مگر ایک چمگادڑ نے ان میں رکاوٹ ڈال دی۔ سامنے سے چار لڑکے ایک مری ہوئی چمگادڑ اس طرح اٹھائے چلے آ رہے تھے کہ دو لڑکوں نے ایک طرف سے اس کا ایک پر پکڑا ہوا تھا اور دو لڑکوں نے دوسری طرف سے دوسرا پر۔ اس طرح بیس پچیس فٹ چوڑا گھاس کا وہ قطعہ چمگادڑ سے گھر گیا تھا جو ہمارے سامنے تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' بینگ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ لڑکے بھی ایک ہی شریر تھے۔ ہمارے پاس آ کر کھڑے ہوگئے اور چمگادڑ کی لاش کو فرشی پنکھے کی طرح جھلانے لگے اور وہ اس وقت تک نہیں ٹلے جب تک میں نے ان کی تصویر نہیں کھینچ لی۔ میں تو چمگادڑ کے ساتھ بینگ کی تصویر بھی کھینچنا چاہتا تھا مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ وہ مردہ چمگادڑ سے ڈر رہی تھی۔ وہ اس پر بھی تیار نہیں ہوئی کہ میرا کیمرہ لے کر اس چمگادڑ کے ساتھ میری تصویر ہی کھینچ دے۔

چمگادڑ نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ وہ فوراً اٹھی اور چل دی۔ میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھنا چاہتا تھا، ابھی میری تھکن بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ نہ مانی۔ وہ تیز تیز قدموں سے باغ کے دروازے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اب وہ اپنے چھوٹے قد کے باوجود مجھ سے آگے تھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔

غزالی دروازے پر ہی مل گیا۔ اس نے پہلے تو یہ خوش خبری سنائی کہ اس کا بھائی تعلیم سے فارغ ہوگیا ہے اور وہ چند مہینے بعد پاکستان سے واپس آجائے گا۔ اس کے بعد وہ ہمیں ایک ہوٹل میں لے گیا۔ خوب مزیدار کھانا کھلایا۔ میں کہتا ہی رہ گیا مگر اس نے مجھے بل ادا نہیں کرنے دیا۔ کھانے کے بعد جکارتا جانے والی بس پر وہ مجھے سوار کرانے آئے تو دونوں ایسے گلے ملے جیسے اپنے کسی قریب ترین عزیز کو رخصت کر رہے ہوں۔ سچی بات ہے میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں لوگ؟ ایسے بے لوث اور اتنے بے غرض؟

☆☆☆

بینگ کو ای میل کر کے جب میں مایوس ہوگیا تو ڈونا کا سہارا لیا۔ اسے ای میل کیا کہ کچھ تم ہی بتاؤ۔ بینگ کو کیا ہوا؟ شوہر سے علیحدگی کوئی ایسا واقعہ تو ہے نہیں کہ سب سے تعلق ہی توڑ لیا جائے اور پھر کسی کو اصل بات بھی نہ بتائی جائے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بڑا حادثہ ہوا ہے؟ ڈونا نے جواب دینے میں کئی دن لگا دیے۔ قریب ایک ہفتے بعد اس کا ای میل آیا۔

''بینگ کے ساتھ میرا رابطہ بھی کافی عرصے پہلے ختم ہوگیا تھا۔ پہلے وہ مجھے ای میل کرتی رہتی تھی اور یہ بھی بتاتی تھی کہ تمہارے ساتھ بھی اس کا رابطہ ہے۔ پھر اس نے اچانک ای میل بھیجنا بند کر دیے۔ میں نے سوچا کہیں مصروف ہوگئی ہوگی۔ لیکن اب تمہارا ای میل آیا تو مجھے بھی تشویش ہوئی کہ اسے کیا ہوا۔ میں اس کے شوہر سے بھی ملی تھی۔ وہ بھی معقول انسان نظر آتا تھا۔ بینگ اتنی پیاری عورت ہے میں جب بھی جکارتا جاتی تھی تو وہ بوگور سے آتی تھی مجھ سے ملنے۔ میں نے اسے ای میل کیا۔ جواب نہیں آیا۔ پھر ای میل کیا۔ جب اس کا بھی جواب نہیں آیا تو جکارتا میں کارتینی کو لکھا۔ اس کے ساتھ بینگ کی بہت دوستی تھی۔ کارتینی کو تو تم جانتے ہی ہوگے۔ وہی کتابوں کے اسٹور والی عورت جو کانفرنس کے انتظام میں بہت آگے آگے تھی؟ کارتینی نے یہ لکھا۔

''کئی مہینے پہلے بینگ میرے پاس آئی تھی۔ آتے ہی بولی ''میں غزالی کو چھوڑ آئی ہوں۔'' کیوں چھوڑ آئی ہو؟ میں اسے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ کیسی

تکلیف؟ اس کا جواب اس نے نہیں دیا۔ اس وقت اس کے پیٹ میں بچہ تھا اور یہ بچہ ہی اس کی پریشانی کی وجہ تھا۔ کہتی تھی۔ ''یہ بچہ اس ملک میں پیدا نہیں ہوگا۔ یہ کسی ایسے ملک میں پیدا ہوگا جہاں کسی شرمندگی اور کسی جھجک کے بغیر اسے قبول کرلیا جائے۔ اس لیے میں یہاں سے دور جانا چاہتی ہوں۔'' کبھی کہتی، تھائی لینڈ جا رہی ہوں، کبھی کہتی امریکا جا رہی ہوں۔ ایک ہفتے میں نے اسے اپنے پاس رکھا۔ پھر سمجھا بجھا کے تھائی لینڈ روانہ کر دیا کہ وہاں اس کے بوڑھے باپ ہیں۔ امریکا میں کون تھا اس کا۔

''پورے ایک ہفتے بینگ میرے پاس رہی۔ میں جب بھی اس سے غزالی کو چھوڑنے کی وجہ پوچھتی تو ٹال جاتی۔ بڑی مشکل سے اس ایک ہفتے کے اندر میں جو کچھ معلوم کرسکی وہ یہ ہے۔

''بینگ اور غزالی ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انڈونیشیا کے قانون کی رو سے ان کی شادی غیر قانونی ہے مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اوّل تو کسی کو اس کا علم ہی نہیں تھا اور اگر علم ہو بھی جاتا تو کسے غرض تھی ان کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی۔ لیکن قیامت اس وقت ٹوٹی جب غزالی کا بھائی پاکستان سے واپس آ گیا۔ غزالی کا ایک ہی بھائی ہے۔ وہ پاکستان میں پڑھتا تھا۔ وہ وہاں پڑھائی سے فارغ ہوکر واپس آیا تھا۔ اس لڑکے نے آتے ہی سارے خاندان میں ہلچل مچا دی۔ وہ اپنے ماں باپ سے لڑا کہ غزالی گناہ کی زندگی بسر کر رہا ہے اور آپ خاموش بیٹھے ہیں۔ وہ ہمارے خاندان کو بدنام کر رہا ہے۔ آپ نے اب تک اس سے قطع تعلق کیوں نہیں کیا۔ اس سے پہلے غزالی کے ماں باپ بینگ سے بہت پیار سے ملتے تھے۔ وہ غزالی سے کہتے ضرور تھے کہ بینگ کو مسلمان کرلو، تمہاری شادی جائز ہوجائے گی۔ وہ بینگ کو بھی بہت ترغیب دیتے تھے کہ وہ اسلام قبول کرلے۔ لیکن کبھی انہوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ بوگور سے دور ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ بینگ کا ان سے کبھی کبھی ہی ملنا ہوتا تھا۔ اس لیے بینگ کو کوئی پریشانی ہی نہیں تھی۔ غزالی بھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا بلکہ اس کے باپ جب اس سے ایسی باتیں کرتے تو وہ ان سے لڑتا تھا۔ وہ کہتا تھا، ''آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔ وہ میری بیوی ہے۔ وہ جیسی ہے آپ اسے ویسے قبول کریں۔'' مگر اس کے بھائی کے آنے کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ اوّل تو اس لڑکے نے ہر ہفتے دو ہفتے بعد بوگور آنا شروع کردیا۔ پھر جب وہ غزالی کے گناہوں کا ذکر شروع کرتا تو اتنا چیخ چیخ کر بولتا کہ سارا محلہ سنتا۔ بینگ کو اس ہنگامے کی وجہ سے زیادہ پریشانی تھی۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے ان کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اب محلے کے لوگ انہیں گھور گھور کر دیکھتے تھے۔

ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ غزالی کا بھائی گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد واپس آیا تھا۔ اس وقت تک امریکا نے دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کردی تھی۔ افغانستان پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا اور عراق پر بھی اس نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ لڑکا یہ سب کچھ دیکھ کر آیا تھا۔ اسے اس بات پر بھی غصہ تھا کہ مشرقی تیمور انڈونیشیا سے الگ ہوگیا ہے اور وہاں ایک عیسائی حکومت بن گئی ہے۔ وہ پاکستان میں کسی جہادی تنظیم کے ساتھ کام کرتا تھا اور انڈونیشیا آکر بھی کسی ایسی ہی جماعت میں شامل ہوگیا تھا۔ اسے اپنے ملک کے لوگوں سے سخت شکایت تھی کہ وہ اپنے مذہب کی پابندی نہیں کرتے اور ہندو رسم و رواج کی پیروی کرتے ہیں۔''

''اب یہ اتفاق ہے یا بدقسمتی کہ انہی دنوں بینگ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ چار ساڑھے چار سال تک تو بچہ ہوا نہیں تھا، اب یہ بھی ہونا رہ گیا تھا۔ بینگ کا خیال تھا کہ غزالی یہ خوش خبری سنے گا تو خوش ہوگا۔ اتنے زمانے بعد وہ بچے کا باپ بننے والا ہے۔ مگر اس نے سنا تو ایک دم پیلا پڑ گیا۔ جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ ''یہ کیا غضب ہوگیا؟ ہماری شادی کو ہی کوئی تسلیم نہیں کرتا، اس بچے کو کون قبول کرے گا؟'' بینگ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ غزالی کی یہ شکل پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی اور جب غزالی نے کہا، یہ بچہ گرا دو تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ 'کیوں گرا دوں؟ یہ میرا بچہ ہے۔ تم مجھ سے جیو ہتھیا کرانا چاہتے ہو؟' اس کا مذہب تو کیڑے مکوڑے مارنا بھی پاپ سمجھتا ہے، یہ تو پھر انسان تھا، انسان کا بچہ، اس کا اپنا بچہ۔ وہ کیسے گرا دیتی؟ مگر عجیب بات تھی۔ غزالی غصہ نہیں کرتا تھا، لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔ اسے پیار سے سمجھاتا تھا۔ اس کی خوشامد کرتا تھا۔ وہ کہتا، ''اگر یہ بچہ پیدا ہوگیا تو ہماری شادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کس قانون کے تحت یہ شادی کی گئی ہے۔''

جس وقت بینگ نے غزالی کو بتایا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے اس وقت تک دو مہینے سے اوپر چڑھ چکے تھے۔ اس بحثا بحثی میں کچھ وقت اور گزر گیا۔ اب غزالی نے بحث کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ خاموش ہوگیا تھا۔ وہ ہر وقت گم سم سا رہتا۔ بینگ کو دیکھتا تو آنکھیں پھیر لیتا۔ رات کو وہ اس کے ساتھ ایک بستر پر ایسے سوتا جیسے وہ کوئی سزا کاٹ رہا ہو۔ بینگ یہ سب دیکھتی تھی اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ کچھ کہتی اس لیے نہیں تھی کہ اسے اب بھی یقین تھا کہ بچہ پیدا ہو جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ادھر اب بینگ کے لیے پیٹ چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔ سب جان گئے تھے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سارے خاندان نے باتیں بھی بنانا شروع کر دی تھیں۔ 'یہ بچہ جائز نہیں، یہ حرام کا ہوگا، اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔' یہ باتیں ان کے پیٹھ پیچھے ہی نہیں کی جاتیں ان کے سامنے بھی یہ جھک جھک ہوتی۔ اس وقت بینگ تو اِدھر اُدھر ہو جاتی مگر غزالی وہیں بیٹھا رہتا۔ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے۔ یہ بینگ کے لیے نئی صورت حال تھی۔ اب بینگ نے غزالی کی ایک اور شکل دیکھی۔ شرمندہ شرمندہ، جھینپا جھینپا سا غزالی۔ ڈرا ہوا ایک بچہ۔ جو بہت بڑے ہجوم میں اکیلا رہ گیا۔

بس، بینگ کے لیے اتنا دیکھنا ہی کافی تھا۔ وہ غزالی کو اور اذیت دینا نہیں چاہتی تھی۔ اب موقع ملتے ہی وہ گھر سے نکلی اور میرے پاس آ گئی۔ ''میں نے سب کو چھوڑ دیا۔ اب ہم اکیلے رہیں گے۔ میں اور میرا بچہ۔''

''میں نے بینگ سے یہ بھی پوچھا کہ کیا تم غزالی سے طلاق لوگی؟ اس کا جواب تھا۔ ان کے لیے جب شادی ہی غیر قانونی ہے تو طلاق کیسی۔

ڈونا نے کارتینی کا ای میل نقل کرنے کے بعد مجھ سے بھی سوال کر ڈالا، ''اچھا، اب تم بتاؤ...... کیا تمہارے نزدیک وہ شادی جائز تھی؟ اور کیا وہ بچہ جائز ہے؟''

میں اس کا کیا جواب دیتا؟ یہ کہ میرے عقیدے کی رو سے وہ شادی نا جائز تھی؟ اور یہ کہ بچہ حرام کا ہے؟

میں نے ڈونا کے ای میل کا جواب نہیں دیا۔

فاروق خالد

''م۔ا۔ت'' آپ کے علم کی حفاظت کرتا ہے

آپ کو خوب اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ ''م۔ا۔ت'' نہ صرف آپ کے علم (دینی و دنیاوی اور دیگران) کی حفاظت کرتا ہے بلکہ یہ آپ کے دائمی سکھ چین اور گھریلو، ازدواجی مسرتوں میں بھی بھرپور طریقے سے معاون ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ سفر میں ہوں یا حضر میں، نیند میں یا بیداری میں، مجلس میں یا خلوت میں، یعنی حالتِ مرگ کے علاوہ خواہ آپ کیسے ہی، کیوں کر اور کہیں بھی ہوں یہ ہمہ وقت اور ہمہ جہت آپ کا ایک مخلص ساتھی اور اٹل خیر خواہ ہے اور پھر یہ بات بھی آپ کے لیے ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ اگر آپ کو کوئی عارضہ لاحق ہے یا پھر آپ خود کو جنسی یا روحانی طور پر غیر اطمینان بخش پاتے ہیں تو یہ آپ کو آپ کی تمام کمیوں بیشیوں کا کماحقہ احساس دلاتے ہوئے ان کا ٹھیک اور بروقت تدارک کرتا ہے۔ ممکن ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ آخر یہ ''م۔ا۔ت'' ہے کیا؟ کیا یہ ''مرکزی ادارۂ تحقیقات'' کا مخفف ہے یا پھر اس سے ''مصائب اور توہمات'' مراد ہے؟ کیا یہ ''ملائکِ اُنس و تکلیف'' کی طرف اشارہ کرتا ہے یا پھر یہ ''میں اور تم'' کی نشاندہی کرتا ہے۔ یقیناً یہ ان سب اور بہت سے دیگر ممکنات کا احاطہ کرتا ہے اور ممکن ہے اس کا مطلب ''مرون ارک تروج'' ہو جو کہ اپنی اوائل عمری میں ترکی اور اس ملک کے ایران کے پاس کے سرحدی علاقوں میں پایا گیا تھا، مگر اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بعض خلیجی ریاستوں میں بسر ہوا تھا اور اپنی اخیر عمر میں وہ بھارت میں قیام پذیر ہونے کے بعد وہیں پر تمام ہوا تھا۔ بعض لوگ اسے کوئی مافوق الفطرت ہستی یا پھر انسانی سطح سے اوپر کی کوئی ذی روح یا ماورائے کون و مکان گردانتے ہیں اور خود کو اور دیگر اَن گنت لوگوں کو اس کے جانثار معتقدین میں شمار کرتے ہیں اور تن من سے اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ بے شمار لوگ اس تفصیل کو قطعی فرضی قرار دیتے ہیں اور مرون ارک تروج کی سرے سے نفی کرتے ہیں۔ واضح رہے، اور اس کا ''م۔ا۔ت'' سے گہرا تعلق ہے، کہ مرون ارک تروج ایک حقیقی شخص تھا جو آدھی عورت اور آدھا آدمی اور آدھا زمینی اور آدھا آسمانی تھا اور کوئی بھی اس کی جنم بھومی اور جائے وفات یا اس کے مقامِ نزول و خروج

سے واقف نہیں تھا اور نہ ہے۔ ہاں، یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کی پیدائش کے بعد، جو اس کی گمنام موت کا واضح پیش خیمہ تھی، لوگ اس کے قریبی رشتے دار یا لواحقین یا پھر اس کے وارث یا جانشین ہونے کے دعوے دار تھے اور دنیا کے کئی خطوں میں انہوں نے اس کے مزار بنائے ہوئے تھے جن کے گرد و پیش میں شبانہ روز اوقات کے مدرسے قائم تھے جن میں ہر نوع و جنس کے لوگ کسبِ علم حاصل کرنے آتے تھے۔ خواتین و حضرات، ان مدرسوں میں تعلیم کتب یا تقریروں کے ذریعے نہیں دی جاتی تھی۔ وہاں آڈیو، ویڈیو یا کسی قسم کے الیکٹرونک میڈیا کو بروئے کار لانے کا ذکر ہی کیا، انہیں یا ان میں سے کسی ایک کا حوالہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اس غیر فانی تعلیم کا منبع و ذریعہ جڑی بوٹیوں، معدنیات اور سمندری گھونگوں سے تیار کردہ ایسے مختلف قسم کے سفوف اور معجون تھے جو مرد و زن اور بچے بوڑھے خوب رغبت سے چاٹتے تھے اور حصولِ علم سے ہر سطح پر فیض یاب ہوتے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے اس کا تذکرہ آئندہ کے آسمانی صحیفوں میں ایک نایاب پرندے کی وسیع و بلیغ بولی اور ایک نہ دِکھائی دینے والے زندہ لباس کے طور پر کیا ہے جو اپنے لیے اجسام خود ڈھونڈتا ہے اور جس کے پہننے سے لوگوں میں مرون ارک تروج کی روح سرایت کرجاتی ہے اور جو انہیں متذکرہ بالا سفوفوں اور معجونوں کا مکمل ادراک بخشتی ہے۔ اَب یہ کہنا کہ آیا یہ سب درست ہے یا نہیں اور کیا عقلِ سلیم اسے جاننے اور ماننے پر آمادہ ہوتی بھی ہے یا نہیں، تو اس سے قطع نظر بلکہ اس سے بے پرواہ ہوتے ہوئے ہمارے لیے صرف یہ جاننا اہم ہے کہ اس کی ہمارے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے ٹھیک ٹھیک افادیت کیا ہے اور کیا یہ واقعی ہمارے علم کی، جس کی تشریح و وضاحت پہلے ہی کر دی گئی ہے، حفاظت کرتا ہے اور کیا وہ ایسا کر بھی سکتا ہے یا نہیں اور سب سے اہم یہ کہ کیسے؟

"م۔ا۔ت" یعنی میرا اظہارِ تمام یا پھر موجود اور تخیل کے، جو منقسم اور تحلیل کے مختلف مدارج ہی ہیں، آس پاس کی ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ آپ خود کو پُرسکون اور دنیاوی جھمیلوں سے دور رکھیں اور اسے اپنے لیے ایک ہمہ وقت وظیفۂ حیات، جس کی آمد و رفت آپ کی سانسوں میں اور خیالات و تصورات کے مد و جزر میں ہو بہو ہو، آپ اسے بھی ملحوظِ خاطر رکھیں کہ آپ اس طریقۂ کار کو بروئے کار لاتے ہوئے صرف خود میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ اسے اپنی ذات سے علیحدہ کرتے ہوئے اسے دوسرے لوگوں کے لیے حرزِ جان بھی تصور کریں جو دراصل آپ کی اپنی بقا و سلامتی کی بھرپور دلیل ہوگی۔

آپ ''جوتم کہتے ہو ہمیں اس پر یقین نہیں ہے'' کو فی الحال نظر انداز کریں اور اسے کسی طور پر بھی اپنے لیے آمادۂ علم ہونے میں رکاوٹ نہ بننے دیں اور صرف اسے ہی اپنے لیے مقدم جانیں کہ ہمارا آپس میں رشتہ، یعنی ''میں اور تم'' جو دنیا کو از سرِ نو ایک نئی سطح اور ایک نئے پیمانے پر دریافت کرنا چاہتے تھے، درحقیقت م۔ا۔ت سے وابستہ سفوفوں اور معجونوں کے کرشمہ ساز نتائج کے ناقابلِ تردید مظہر تھے۔ وہ آپس میں دوست تھے یا دشمن یا پھر حقیقی بھائی، اس سے ہمیں غرض نہیں رکھنی چاہیے اور فقط اسے ہی اپنے لیے معارف المعروف جان لینا چاہیے کہ ہم بھی آپس میں ویسا ہی رشتہ استوار کرسکتے ہیں جو دنیا جہاں کے تمام رشتوں اور ان کی نزاکتوں اور مضبوطیوں پر حاوی ہے اور ''م'' اور ''ا'' کے خاموش ہونے پر ''ت'' اس کی مزید وضاحت یوں کرسکتا ہے کہ ہم سب درحقیقت مرون ارک تروج کی ہی اولاد ہیں جو آدھا مرد او آدھی عورت اور آدھا زمینی اور آدھا آسمانی تھا اور یہی ہمارے والدین اور ہمیں پالنے پوسنے والے تھے۔ اس کرۂ ارض پر اپنی زندگی گزارنے کے بعد آسمانوں پر اُٹھالیے گئے۔ اَب کے ''م'' نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنا ضروری سمجھا اور الفاظ و بیان کے ذریعے سے نہیں بلکہ اپنے چہرے کے بلیغ تاثرات اور نگاہوں کی ایک دوررس عکاسی سے مدد لیتے ہوئے ''ت'' کو یوں مخاطب کیا کہ گویا اس کے تاثراتی الفاظ و مفاہیم اس کے مساموں سے پھوٹتے ہوئے عیاں ہوں کہ ہم یعنی ''م، ا'' اور ''ت'' تو اسے جانتے ہیں، مگر کیا اور لوگ بھی اس کا وقوف رکھتے ہیں؟ آپ سوچتے ہوں گے کہ بات اُلجھ گئی ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ''م۔ا۔ت'' آپ کے علم کی حفاظت کرتا ہے اور وہ آپ کی اس بارے میں سچی آمادگی کو پاتے ہوئے ایسا کرنے کا مکمل طور پر ذمہ دار ہے۔ آپ اور میں حقیقتاً یہاں نہیں ہیں تو ''م۔ا۔ت'' اپنے روابط کی ایک رو پہلی و متحرک سطح پر ظہور پذیر ہوتے ہوئے ہمیں باور کرانا چاہتا ہے کہ جوتم ہو، وہ میں کا ایک گم شدہ حصّہ ہیں اور جو میں ہوں، وہ تمہارا ایک نامعلوم انگ ہے اور علیٰ ہٰذالقیاس یہ سلاسل پھیلتے اور سمٹتے ہوئے کل کائنات اور خدائے برتر پر دال ہیں۔ اَب اسے ہی لیں کہ مجھے کھانے کی حاجت ہے اور نہ پینے کی، سونے کی اور نہ جاگنے کی اور نہ ہی زندہ رہنے کی اُور مرنے کی! یوں کہنا چاہیے کہ میں موجود و غائب سے بھی پرے کی کوئی حقیقت اور غیر حقیقت کے بین بین ہوں اور جو میرے اردگرد ہوتا ہے اسے میں ایک وقت آنے پر اپنے اندر سمیٹ لیتا ہوں اور پھر اسے نئے سرے سے اپنے سامنے اُجاگر کرنے پر بھی قادر ہوں اور یہ سب کچھ ''م۔ا۔ت'' کی بدولت ہے اور یہ آپ کے علم کی بھی اتنی ہی حفاظت کرسکتا ہے جتنی

میری۔ یہ سفوف اور معجونیں، جن میں سے بہت کچھ بطور تریاق، اصل و نقل استعمال کیا جا سکتا ہے، آپ کو میری طرف سے نذرانۂ عقیدت ہے۔ یہ ان مدرسوں کے کھوج کے لیے بھی آپ کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا زمانۂ حال میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میری تمام گزارشات کا لب لباب یہ ہے کہ آپ ''م۔ا۔ت'' پر پورا پورا بھروسہ کریں، آپ کا اس پر اعتقاد بلکہ ایمان ہونا چاہیے اور تب ہی آپ اس کے ثمرات سے مستفیض ہو سکیں گے اور صرف اسی ایک طریقے سے آپ کی اس تک حقیقی معنوں میں رسائی ہو سکے گی۔ ممکن ہے آپ مجھ پر شک کر رہے ہوں اور یہ خیال کیے ہوئے ہوں کہ یہ ہمیں کوئی زہر آلود شے یا پھر ہمارے لیے سراسر نقصان دہ شے نذرانۂ عقیدت کہہ کر دے رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اس کے فوائد کے ضمن میں بہت کچھ کہا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے تریاقِ اصل و نقل کا نام بھی دیا تھا۔ چنانچہ کسی قسم کے شک و شبہ، تردد، ششں و پنج یا لعل ولیت کی قطعی ضرورت نہیں ہے اور آپ کو صرف اور صرف اسے ہی اپنا مطمح نظر رکھنا ہے کہ یہ آپ کے علم، جس کی وضاحت میں متعدد دفعہ پہلے کر چکا ہوں، کی حفاظت کرتا ہے۔ آپ کے چہروں پر غیر آمادگی کی جھلکیاں مجھے دِکھائی دیتی ہیں جو درحقیقت آپ کے اپنے نقصان کی غماز ہیں۔ اَب میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ کے سامنے اسے تجرباً استعمال کروں جس میں بھی آپ کا گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ تو یہ لیجیے میں اسے پھانک رہا ہوں...... اور غائب ہوتا ہوں......
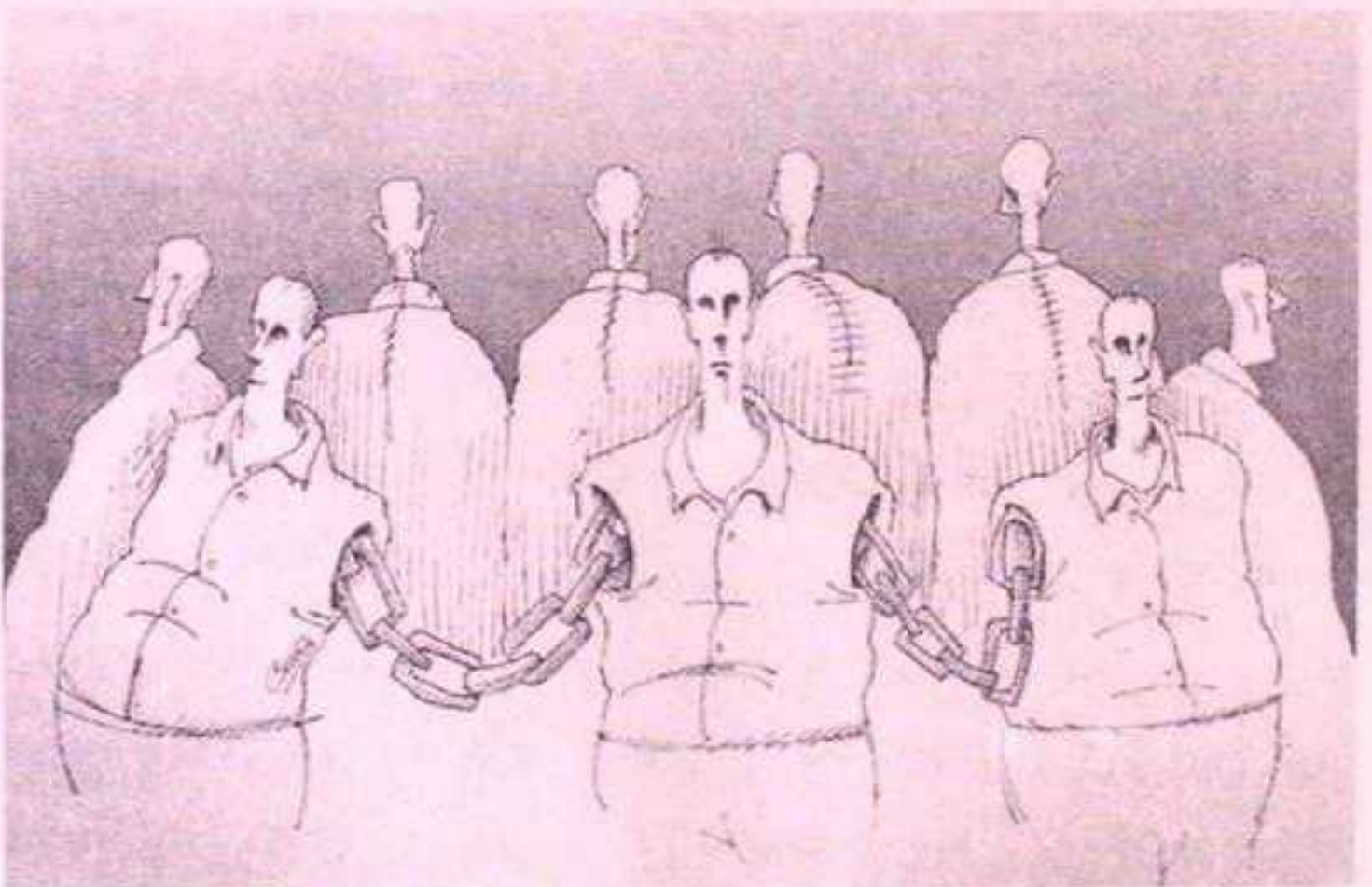
خالد سہیل

خودکشی یا قتل

سعید انجم سارے دن کے کام سے لوٹا' تھکا ہارا' اپنے ٹورانٹو کے اپارٹمنٹ میں صوفے پر لیٹا' رات گیارہ بجے کی خبروں کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سے امریکا اور عراق کی جنگ شروع ہوئی تھی اس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ وہ رات کو جلد گھر لوٹ آتا تھا تا کہ خبریں سن سکے، یہ علیحدہ بات کہ ان خبروں کے بعد اسے دیر تک نیند نہ آتی تھی اور وہ عالمی صورتِ حال سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جنگ جلد از جلد ختم ہو جائے تا کہ دنیا میں امن و امان قائم ہو لیکن۔۔۔

وہ ابھی اپنے خیالوں کی بھول بھلیّوں میں ہی کھویا تھا کہ ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہو گئیں۔ اس نے غور سے سننا شروع کیا۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا کہ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے خیالات کا بے باکانہ اظہار کیا تھا۔ اور پھر اسکرین پر کوفی عنان اور برطانوی جرنلسٹ کی تصویریں ابھریں۔ برطانوی جرنلسٹ نے کوفی عنان سے پوچھا کہ کیا امریکا کا عراق پر حملہ قانونی تھا؟ کوفی عنان نے جواب دیا کہ نہیں' وہ غیر قانونی تھا۔ امریکا نے اقوامِ متحدہ اور سیکورٹی کونسل کی رائے کا احترام نہیں کیا تھا۔ جرنلسٹ نے مزید پوچھا کہ کیا آپ عراق میں غیر جانبدارانہ انتخاب کے بارے میں پر امید ہیں؟ کوفی عنان نے نہایت مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ نہیں، میں بالکل پر امید نہیں ہوں۔ غیر جانبدارانہ انتخابات کے لیے ملک میں امن و امان کی فضا کی ضرورت ہے جو عراق میں موجود نہیں ہے۔'

سعید انجم نے اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کوفی عنان کو ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دیکھا تھا لیکن زندگی میں پہلی دفعہ اسے وہ سیاہ فام نظر آیا تھا اور برطانوی جرنلسٹ سفید فام۔ اور پھر اسے نیلسن منڈیلا کا انٹرویو یاد آیا جس میں اس نے ساری دنیا کو متنبہ کیا تھا کہ وہ امریکی صدر جورج بش کو عراق پر حملہ کرنے سے روکیں کیونکہ وہ تیسری عالمی جنگ شروع کرنے والا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ امریکا کا سفید فام صدر اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا احترام اس لیے بھی نہیں کر رہا کہ وہ سیاہ فام ہے۔ اس نے پہلے کبھی ان خطوط پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

سعید انجم کو یوں محسوس ہوا کہ ساری دنیا سیاہ و سفید میں تقسیم ہو گئی ہو اور اپنا توازن کھو چکی ہو۔ موجودہ جنگ نے اسے زندگی کو ایک نئے انداز سے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس رات کی دوسری خبر یہ تھی کہ کینیڈا کے ایک قومی اخبار کے مدیر کو اس لیے برطرف کر دیا گیا تھا کہ اس نے یورپ سے آنے والی بین الاقوامی خبروں میں عراقی مجاہدین کو freedom fighters کی بجائے terrorists لکھا تھا۔ اس کا جگہ جگہ ان الفاظ کو بدلنا اس کے تعصب کی غمازی کرتا تھا۔

تیسری خبر یہ تھی کہ امریکا کے نئے صدارتی امیدوار جون کیری نے صدر جورج بش پر شدید اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ سی آئی اے کی تازہ ترین رپورٹ کو نظر انداز کر رہا ہے جس میں صدر کو متنبہ کیا گیا تھا کہ عراق کے سیاسی حالات بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہو رہے تھے۔ کیری نے پہلی دفعہ امریکیوں کے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ امریکی عراقیوں کے ہمدرد نہیں غاصب تھے۔ liberator نہیں occupier تھے۔

چوتھی خبر یہ تھی کہ عراق میں امام علی کی مسجد میں سینکڑوں عراقی مقتدر الصدر کی زیرِ قیادت امریکی فوج کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جب کہ امریکی فوجوں نے مسجد کو گھیر رکھا تھا۔ وہ مقتدر الصدر سے کہہ رہے تھے کہ ہتھیار ڈال دے ورنہ ان سب پر اور امام علی کی مسجد پر بم گرائے جائیں گے۔ امریکا کے اس فیصلے کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی تھی اور امن پسند سیاسی رہنماؤں نے شیعہ امام ستانی سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی بیماری کے باوجود انگلستان سے عراق جائیں، اس مسئلے کا پُر امن حل نکالیں اور امریکی فوج اور مقتدر الصدر کے درمیان ایک پل بنیں۔

سعید انجم چونکہ کئی راتوں سے نہ سویا تھا اس لیے خبریں سنتے سنتے اس پر غنودگی نے غلبہ پایا اور وہ چند لمحوں کے لیے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ نیند میں اس کا لاشعور بیدار ہو گیا اور ٹیلیویژن کی خبروں کا سلسلہ جاری رہا۔ فرق یہ تھا کہ امام علی کی مسجد آہستہ آہستہ خانۂ کعبہ میں تبدیل ہو گئی۔

اس نے دائیں طرف غور سے دیکھا تو اسے سب کچھ کالا نظر آیا۔ خانۂ کعبہ۔۔ اس کا غلاف ۔۔۔ حجرِ اسود۔۔ اور ہزاروں لوگ جو کالے کپڑے پہنے کالی بندوقیں اٹھائے نعرۂ تکبیر کی صدا بلند کیے طواف کر رہے تھے۔ ان کا جوش ان کا ولولہ اور ان کا جذبہ اپنی انتہا پر تھا۔

اس نے بائیں طرف دیکھا تو اسے سب کچھ سفید دکھائی دیا۔ white house کی سنگِ مرمر کی عمارت۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سفید فام لوگ ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہوئے۔ اس نے غور

سے دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ امریکی صدر جورج بش کابینہ کے ممبروں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سب کے چہرے زرد تھے اور وہ سب حواس باختہ دکھائی دے رہے تھے۔

جب اس نے وہائٹ ہاؤس کے باہر دیکھا تو اسے سینکڑوں عرب دکھائی دیے، جو سیاہ ماتمی لباس پہنے اپنے جسموں کے ساتھ بم باندھے ہوئے تھے۔ ان کا ایک سردار تھا جس کے ہاتھ میں فون تھا اور وہ امریکی صدر سے ہمکلام تھا۔

اس نے دوسری طرف دیکھا تو اسے خانۂ کعبہ کے اوپر سفید امریکی بمبار طیارے منڈلاتے دکھائی دیے۔ خانۂ کعبہ کو امریکی فوجیوں نے گھیر رکھا تھا۔

وہائٹ ہاؤس میں صدر فون پر کہہ رہا تھا 'اگر مسلمانوں نے ہتھیار نہ ڈالے تو خانۂ کعبہ پر بم گرائے جائیں گے اور دہشت گردوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا'۔

مسلمانوں کے سردار نے فون پر جواب دیتے ہوئے کہا، 'وہ دہشت پسند نہیں حریت پسند ہیں۔ وہ سعودی عرب کو امریکی تسلط سے آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے مطالبات نہ مانے گئے تو ہم کابینہ کو آگ لگا دیں گے اور سارا وہائٹ ہاؤس دھویں کے مرغولوں میں تبدیل ہو جائے گا'۔

جب صدر نے پوچھا کہ 'آپ کے مطالبات کیا ہیں؟' تو سردار نے جواب دیا 'ہم چاہتے ہیں کہ ساری امریکی فوجیں واپس بلا لی جائیں اور عراق' افغانستان اور سعودی عرب میں ایک بھی امریکی فوجی نہ رہے'۔

صدر: 'ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں گے'۔

سردار: 'ہم آپ کے فیصلے کا بے چینی سے انتظار کریں گے'۔

صدر: 'میری درخواست ہے کہ فیصلہ ہونے تک وہائٹ ہاؤس کو آگ نہ لگائی جائے'۔

سردار: 'اور خانۂ کعبہ پر بم نہ پھینکے جائیں'۔

اس پریشان کن مکالمے کو سننے کے بعد سعید انجم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ٹیلی ویژن پر خبریں جاری تھیں۔ اسکرین پر امام علی کی مسجد نظر آ رہی تھی۔ امام ستانی نے ہزاروں شیعہ مسلمانوں کو امام علی کی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے کی دعوت دی تھی تاکہ نماز کے بعد وہ سب مقتدر الصدر کے ساتھیوں کے ساتھ مسجد سے نکل جائیں۔

سعید انجم' اگرچہ خود ایک دہریہ تھا لیکن انسان دوست ہونے کے ناطے کسی انسان کو بھی' چاہے وہ مسلمان ہو یا عیسائی' ہندو ہو یا یہودی' سکھ ہو یا بہائی' قتل ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ امام

ستانی سے بہت متاثر ہوا تھا جنہوں نے اپنی دانشمندی سے ہزاروں انسانوں کی جانیں بچائی تھیں۔خون کے دریا پر امن کا پل تعمیر کیا تھا جس پر سے گزر کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور امریکی فوجی ان کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

لیکن وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔

کیا یہ امن مستقل ہے یا عارضی؟

اسے یوں محسوس ہوا جیسے،

یہ خیر اور شر کی

نیکی اور بدی کی

مشرق اور مغرب کی

غریب اور امیر ممالک کی

ظالموں اور مظلوموں کی

ایسی جنگ ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کر رہا ہے اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون میں نہا رہا ہے۔ہابیل اور قابیل کی جنگ جاری ہے اور اب اپنے آخری مراحل میں پہنچ چکی ہے۔ایٹمی ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد انسان اپنی تاریخ میں پہلی دفعہ اس قابل ہوا ہے کہ ساری انسانیت کو تباہ و برباد کر دے۔

سعید انجم کافی دیر تک اپنے انفرادی اور اجتمائی لاشعور پر غور کرتا رہا لیکن اس گتھی کو نہ سلجھا سکا کہ انسانیت اکیسویں صدی میں اجتماعی خودکشی کر رہی تھی یا قتل۔

فاروق سرور

گنجی چڑیا

نفیسہ کا ٹیلی فون ہر رات مجھے خوفزدہ کرتا ہے۔ میں جب بھی رات کو اپنے کام سے تھکا ہوا واپس آتا ہوں۔ تو اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی پر میری جان نکل جاتی ہے۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ اُسے آئندہ ٹیلی فون کرنے سے منع کروں گا لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ بیشتر اوقات یہ بات بھی میرے دل میں آتی ہے کہ میں ریسیور ہی نہیں اٹھاؤں گا لیکن پھر میں یہ سوچ کر ایسا نہیں کرتا کہ کہیں یہ فون اس اسٹور کے مالک کا نہ ہو جہاں میں کام کرتا ہوں۔ اور پھر اگر میں کبھی ریسیور اٹھاؤں بھی نہیں تو نفیسہ اس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتی جب تک میں اسے جواب نہ دوں۔

اس وقت میں اٹلی میں قیام پذیر ہوں اور یہاں میں اپنی خواہش پر آیا ہوں لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں مجھے اپنی حساسیت لے آئی تو بھی مجھے انکار نہیں۔ کیونکہ وطن عزیز میں جنگ چھڑی ہوئی تھی، وہ غیروں کے قبضے میں تھا، کلاشنکوف، سنسناتی ہوئی گولیاں، لاشیں، آنسو، لوٹ مار، عزت دار لوگوں کی عزتوں سے کھیلنا، یہ تمام برے رنگ وہاں پھیلے ہوئے تھے۔ اسی لیے ان تمام نے مل کر مجھے خوفزدہ کیا، دوسرے ہم وطن تو پناہ کی خاطر ہمسایہ ملکوں کا رخ کر رہے تھے لیکن میں یہاں اٹلی چلا آیا۔ اب یہاں میں سکون سے بھی ہوں اور میں اپنے ہمسایہ ممالک میں بنے ہوئے مہاجر کیمپوں کی بدحالی اور شدید ترین سردی کا شکار بھی نہیں۔ یہاں میں کسی کے آگے دامن بھی نہیں پھیلاتا کہ مجھے آٹا، چینی یا کمبل دو اور نہ ہی یہاں اس اذیت کا شکار ہوں کہ میرے کسی ہم وطن کا بچہ سردی یا بیماری سے مرر رہا ہو اور مجھے اس کی بے بسی کا دکھ ہو۔ بلکہ یہاں تو میری شاہانہ زندگی ہے۔ اور پھر میں یہاں ہر لحاظ سے مطمئن ہوں۔ اچھی ملازمت اور رہنے کے لیے اچھا فلیٹ۔ سب کچھ میرے پاس ہے۔ میرے اسٹور کا مالک پشتو بولنے والا ایک سفید ریش شخص ہے جسے ہم سب حاجی آغا کہتے ہیں۔ حاجی آغا اور اس کی بیوی بہت عرصے سے یہاں رہتے ہیں اور بدقسمتی سے دونوں کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ دونوں بہت مہربان ہیں، مل کر اپنا اسٹور چلاتے ہیں، انہیں مجھ پر بہت زیادہ بھروسہ ہے اور ہر وقت اپنے کام کے متعلق مجھ سے مشورے بھی لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں

تو میں خوابوں کی دنیا میں رہ رہا ہوں۔

اب نفیسہ کے کابل کے ٹیلی فونوں کے ساتھ ساتھ ایک اور عذاب مجھے آلیتا ہے، حالات کسی لٹو کی طرح مجھے گھماتے ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہاں مجھ پر زندگی تنگ ہوجائے گی، کیونکہ یہاں کی پولیس اب ہر وقت مجھے طلب کرتی ہے، مجھ سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کئی کئی روز تک مجھے پولیس اسٹیشن میں قید رکھتی ہے۔ بلکہ شروع کے دنوں میں تو وہ مجھ پر تشدد بھی کرتی ہے، مجھے برف پر لٹاتی ہے، مجھے سونے نہیں دیتی اور موچنے سے میرے جسم سے بال اور گوشت نوچتی ہے۔ اس وقت جو بدترین عذاب مجھ پر گزرتا ہے، اس کا اندازہ صرف میرے خدا ہی کو ہوگا۔

پولیس کا کہنا ہے کہ تم دہشت گرد ہو لیکن ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ بہرحال اب یہ ایک معمول ہے کہ وہ لوگ مجھے طلب کرتے ہیں اور میں فوراً وہاں پہنچ جاتا ہوں اور تب وہاں مجھ سے بہت ساری باتیں پوچھی جاتی ہیں اور میں مجبوراً ہر سوال کا جواب دیتا ہوں۔ میں جب بھی پولیس اسٹیشن جاتا ہوں تو اس پریشانی کا بھی شکار ہوتا ہوں کہ یہ لوگ آج پھر کیا بات پوچھیں گے اور میرے کیا جوابات ہوں گے اور خدانخواستہ اگر میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا تو کیا میں واقعی ان کا مجرم بن جاؤں گا۔

میرا قصور یہ ہے کہ میرے فلیٹ کا ساتھی بم دھماکے کے الزام میں پکڑا گیا۔ اگرچہ وہ عرب تھا اور میں غیر عرب، ہمارے درمیان ماسوائے سلام دعا کے اور کوئی شناسائی بھی نہیں تھی، پھر میں اپنے کام پر دن کو جاتا تھا اور وہ رات کو ہمیں ملنے کا موقعہ بھی نہیں ملتا اور ہم دونوں کو یکجا بھی فلیٹ کی بوڑھی مالکن نے کیا تھا، جو ہم سے ہمارے کمروں کا علیحدہ علیحدہ کرایہ لیتی تھی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ عرب بے گناہ تھا۔ البتہ اسے فلسطینیوں کی حالت زار کا دکھ تھا اور اس کا کمرہ ان بے شمار فلسطینی بچوں کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا جو اسرائیلی مظالم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے اور میرا خیال ہے کہ مظلوموں سے ہمدردی رکھنا کوئی جرم نہیں۔ لیکن پولیس نے اسے تفتیش کے وقت جان سے ماردیا اور وہ اس کے کمرے سے ان تمام بچوں کی تصویریں بھی لے گئی۔ مجھے خبر نہیں کہ وہ کیا راز تھے جو پولیس اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ انہیں نہیں بتارہا تھا۔ لیکن پولیس اس کے قتل کو مانتی ہے نہ اس کے جسم پر تشدد کے بہت سارے نشانات کو۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اس نے تو حوالات میں خودکشی کی اور چونکہ وہ دہشت گرد تھا، اس لیے اس کا جسم لڑائی جھگڑے کے زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ بہرحال اب پولیس کو یہ شک ہے کہ میں اس کا ساتھی تھا، اس کے بہت سارے رازوں کو جانتا ہوں اور ہمارا تعلق تیسری دنیا

کی ایک خاص دہشت گرد تنظیم سے ہے۔ نفیسہ کا فون اب بھی ہر وقت آتا ہے اور میری پریشانی میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں، نفیسہ تو پیار کرنے والی بہن ہے، میں کیسے اس کا دل توڑوں۔ اگرچہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹی ہے لیکن اس کے خلوص کا کوئی جواب نہیں۔ اٹلی آنے سے پہلے جب میں گاؤں میں تھا تو وہ پاگل پن کی حد تک میرا خیال رکھتی اور پھر جب اس کی شادی ہوگئی تب بھی میری فکر اسے لاحق رہتی اور جب میں اٹلی آرہا تھا تو اس نے اپنا سارا زیور فروخت کر کے اور میرے بہنوئی کو مقروض بنا کر میرے ٹکٹ اور باقی اخراجات کا بندوبست کیا اور میں اپنے بہنوئی کی بھی ہر وقت تعریف کروں گا جس نے یہاں آنے میں میری بھرپور مدد کی۔

افغانستان کی طویل لڑائی کے باوجود ہمارا گاؤں پہلے جنگ سے بچا ہوا تھا لیکن اب نفیسہ کہتی ہے کہ طیارے آئے، انہوں نے آسمان سے آگ برسائی اور ہمارے ایک عزیز کے بچے اس میں مر گئے۔ یہ کیا، طیارے اب ہر رات ہمارے گاؤں پر بمباری کرتے ہیں اور اس میں لاتعداد لوگ مرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ماں اور میرے چھوٹے بھائی اب تک محفوظ ہیں۔ یہ تمام امریکی طیارے ہوتے ہیں۔ نفیسہ کہتی ہے کہ ماں ہر وقت روتی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ نہ ہو کہ میں مر جاؤں اور تمہیں دیکھ نہ پاؤں، کاش ایک بار دیدار ہو جائے۔ نفیسہ امریکا کو بھی بددعائیں دیتی ہے کہ اسی کی وجہ سے ہمارے پرامن دیس میں جنگ آئی، اسی کی سازش کی وجہ سے یہ خوبصورت دیس کھنڈرات میں بدلا اور اب ان برے حالات میں بھی وہ ہمیں سکون سے جینے نہیں دیتا۔ آخر ان مصیبت زدہ لوگوں کی امریکا سے کیا دشمنی ہے کہ وہ انہیں اتنے بڑے اور خوفناک وزنی بموں سے قتل کر رہا ہے۔ میں نفیسہ کو سمجھاتا ہوں کہ یہ جنگ آخرکار ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ بڑی طاقتیں اس وقت اس بات پر متفق ہیں کہ اس خونی کھیل کو اب ختم ہونا چاہیئے، جس نے لاکھوں انسانوں کی جان لی۔ اس لیے اب یہ قوتیں اس مشکل کو ختم کر کے ہی چھوڑیں گی اور ان کے علاوہ کوئی اور یہ کام کر بھی نہیں سکتا۔

ایک دن میٹھی سی آواز پر میری آنکھ کھلتی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے فلیٹ کی کھڑکی میں ایک ننھی سی چڑیا بیٹھی ہوئی ہے جو بہت ہی دلکش انداز میں چہچہا رہی ہے۔ یہ چڑیا مجھے جانی پہچانی لگتی ہے۔ اس کے خاکی پر مجھے کچھ یاد دلاتے ہیں......... میں فوراً اپنے بستر پر بیٹھتا ہوں کہ میں اس چڑیا کو کیسے جانتا ہوں۔

''کہیں یہ گنجی چڑیا تو نہیں؟'' میں خود سے پوچھتا ہوں۔

مجھے فوراً اپنا گاؤں یاد آتا ہے۔ میں جب چھوٹا تھا تو میری چڑیوں سے سخت دشمنی ہوتی اور میں ان کے گھونسلوں پر حملے کرتا۔ چڑیوں کے یہ گھونسلے ہمارے گھر، محلے درختوں، ہمارے کمروں کی چھتوں کے دروازوں اور گاؤں کے اندھے کنوؤں میں ہوتے۔ میں پتھروں اور چھڑیوں کی مدد سے انہیں مارتا، ہلاک کرتا اور اس خونی اور وحشی کھیل میں مجھے بہت مزہ آتا۔ انہی چڑیوں میں ایک گنجی چڑیا بھی ہوا کرتی۔ جو کبھی بھی میرے ہاتھ نہیں آتی اور میں اس کے درپے رہتا کہ یہ کب میرے ہاتھ آئے گی۔ گنجی چڑیا پہلے گنجی نہیں تھی، وہ تو بہت ہی نازک، خوبصورت اور مست چڑیا ہوا کرتی لیکن ایک دن میرا پھینکا ہوا پتھر اس کے سر کے قریب سے ایسا گزرا کہ وہ تو بچ گئی لیکن اس کے سر کے تمام بال اڑ گئے اور وہ گنجی ہوگئی۔ یوں سارا دن ہمارا خوفناک کھیل جاری رہتا، میرے ہاتھ میں غلیل ہوتا، کبھی میں اس کے پیچھے چھت پر چڑھتا، کبھی درختوں پر اور کبھی دیوار پر لیکن اس کے پروں میں ایسی طاقت تھی کہ وہ ہر وقت میرے وار سے بچ جاتی۔ حالانکہ میں گاؤں کے لڑکوں میں سب سے اچھا نشانہ باز ہوا کرتا۔ اس طرح میرے بڑے ظالمانہ خیالات ہوتے، میں خود کو طاقت ور اور فرعون سمجھتا اور تمام چڑیوں کو کمزور۔ یوں گنجی چڑیا پر مجھے غصہ بھی سخت آتا کہ طاقت ور تو میں ہوں، تم بچ مجھ سے کیسے جاتی ہو اور میرے ہاتھ کیوں نہیں آتی۔

''کیا یہ سچ مچ ہمارے گاؤں کی چڑیا تو نہیں اور اگر واقعی ایسا ہے تو یہ اب تک زندہ کیسے ہے اور پھر یہاں کیسے آئی؟'' میں سخت حیرت کا شکار ہو جاتا ہوں۔

میں جونہی چڑیا کے قریب پہنچتا ہوں اور اسے غور سے دیکھتا ہوں تو وہ واقعی گاؤں کی گنجی چڑیا جیسی ہے، وہی گنجا سر، وہی خاکی پر اور وہی اس کے پروں پر کالے داغ، لیکن وہ مجھ سے ڈر کر سہم جاتی ہے اور فوراً اڑ جاتی ہے۔ میں بہت دیر تک اسے دیکھتا ہوں۔ یوں وہ بڑی اور اونچی عمارتوں کے درمیان اُڑ رہی ہے، اس کا وجود آہستہ آہستہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے اور آخر کار وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اب چڑیا کی وجہ سے بہت عرصے کے بعد مجھے اپنا گاؤں یاد آتا ہے، نہ جانے میں کیوں بے چین ہو جاتا ہوں اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔

اچانک فلیٹ کے دروازے پر خوفناک دستک ہوتی ہے۔ یہ پولیس ہے جو کسی طوفان کی طرح اندر آتی ہے، ایک بار پھر وہ میرے گھر کی تلاشی لیتی ہے اور اسے خوب کھنگالتی ہے۔ کوئی شے تو ان کے ہاتھ نہیں آتی۔ البتہ ان افغان بچوں کی تصویریں جو امریکی ہوائی حملوں سے ہلاک ہو چکے ہیں اور جن کو میں اپنے کمرے میں دیواروں پر آویزاں کیا ہے، ان کے ہاتھ

آجاتی ہیں۔ وہ سب میری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے میں نے کوئی بم، گولہ بارود یا کسی دہشت گرد کو چھپایا ہو۔ اسی لیے وہ مجھے تصویروں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔

آج پولیس کا رویہ میرے ساتھ بہت سخت ہے اور معمولی بھی نہیں بلکہ بہت جارحیت ہوتی ہے ان کی پوچھ گچھ میں۔ وہ مسلسل مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ ان بچوں کی تصویریں تمہارے پاس کیوں آئی اور تمہارے امریکا کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ میں جتنا بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ میرے کوئی سیاسی خیالات نہیں، وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ رات کو جب میں دوبارہ اپنے فلیٹ آتا ہوں تو میری آنکھوں سے نیند بالکل غائب ہوجاتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اس پولیس آفیسر کا غصے بھرا سرخ اور بدنما چہرہ گھوم رہا ہے جو اس سے پہلے مجھ پر تشدد بھی کر چکا ہوتا ہے۔ اب میرے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے کہ یہ نہ ہو میرے فلیٹ کے ساتھی کی طرح یہ لوگ مجھے بھی قتل کردیں۔ کیونکہ اسے بھی ان لوگوں نے ناکامی کی صورت میں مارا تھا۔ یوں اب میں سوچتا ہوں کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں پھولوں کے اس دیس سے کیسے جاؤں، جس کے ہر پتے سے میرے خوابوں اور آرزؤں کی تتلیاں ہر وقت چمٹی رہتی ہیں۔ بہت عرصے پہلے جب ہمارے گاؤں کا ایک شخص اٹلی میں رہتا تھا، وہ جب بھی گاؤں آتا تو میں اس سے روم کے تاریخی شہر کے بارے میں سوالات پوچھتا۔ یوں میں یہاں کی تاریخی عمارتوں کے خواب دیکھتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں ہزاروں سال پہلے کے قدیم روم کا باسی ہوں اور یہاں سنگ مرمر اور خوبصورت پتھروں کے محلات میں گھوم رہا ہوں جو سرسبز درختوں، رنگین اور خوشبودار پھولوں اور فواروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی میرا وطن ہے اور میں یہاں کی تاریخ اور ثقافت کا حصہ ہوں۔ اسی لیے یہ جگہ میرے خوابوں کا مرکز تھی اور اب میں حیران ہوں کہ اس جنت سے کیسے علیحدہ ہوں گا۔ مجھے اپنے چاروں طرف اندھیرا نظر آتا ہے۔

آج رات نفیسہ مجھے یہ خبر سناتی ہے کہ طیاروں کے حملے نے ہمارے گاؤں کے ایک اور شخص کا گھر تباہ کردیا اور اس میں اس کے دو جوان بیٹے بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور یہ کہ افغان ایک بار پھر ایک دوسرے کو بے دردی سے قتل کرنے لگے ہیں اور جنگجو سردار پھر سے امریکی ڈالر اور اسلحہ سے مالدار ہوگئے ہیں۔ آج اماں بھی مجھ سے فون پر بات کرتی ہے جو نفیسہ کے گھر کابل آئی ہوئی ہے۔ وہ رو رہی ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں فوراً گھر پہنچوں۔ وہ کہتی ہے کہ خدا غارت کرے

یورپ کو، لعنت ہو ان سفید فاموں پر، ہم سب کو انہوں نے تباہ کیا، ہمیں انہوں نے ہی اسلحہ لا کر دیا، انہوں نے ہی ہمیں ورغلا کر آگ میں جھونکا اور تم ہو کہ ابھی تک ان کے قدموں میں بیٹھے ہو اور گھر نہیں آ رہے۔ پھر کہتی ہے کہ نہ نہ گھر مت آنا، اس وطن جلتی ہوئی دوزخ کی طرح ہے اور کوئی بھی ماں یہ نہیں چاہتی کہ اس کی اولاد اس آگ میں جل جائے۔ ماں کی یہ ذہنی کیفیت اور پاگل پن مجھے حیران کر دیتا ہے لیکن میں اسے سمجھاتا ہوں اور تسلی دیتا ہوں کہ یہ جنگ آخر کار ختم ہو ہی جائے گی، آپ خود دیکھیں گی کہ بڑی بڑی طاقتیں اس جنگ کو کیسے ختم کرتی ہیں لیکن وہ پوچھتی ہے کہ کب ہمیں ،ہمیں تو مدتوں سے یہ سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں لیکن ایسا ہوتا کبھی بھی نہیں؟

اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو میں بہت خوفزدہ ہوتا ہوں اور پھر جب مجھے نیند آتی ہے تو کئی بار میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ بس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے روم کے اس تاریخی شہر میں وہاں کے پرانے بادشاہوں کی ناراض روحیں میرے سرہانے کھڑی ہوں، ان سب نے سفید کفن پہنے ہوں اور وہ جہاں مجھے اپنے مکروہ چہروں، بھیڑیوں جیسے لمبے تیز دانتوں اور آدم خوروں کی طرح خونی آنکھوں سے ڈرا رہے ہوں۔ وہاں ہزاروں انسانوں کے ساتھ اپنے ظلم اور زیادتی پر ماتم بھی کر رہے ہوں ۔ اور پھر اس وقت تو میں زیادہ ڈرتا ہوں، جب میں خواب دیکھتا ہوں کہ اچانک روم شہر کو آگ لگ جاتی ہے، سرخ شعلے وہاں سے بلند ہونے لگتے ہیں اور وہ خوفناک روحیں زیادہ تیزی سے چیخنے اور چلانے لگتی ہیں۔

اگلے دن پھر میں چڑیا کی آواز پر جاگ جاتا ہوں، کیا دیکھتا ہوں کہ یہ وہی کل والی چڑیا ہے جو کھڑکی میں بیٹھی گا رہی ہے۔ میں اس کمزور اور نازک چڑیا کو بہت دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ اب پھر مجھے پریشانی لاحق ہو جاتی ہے کہ اس میں اور ہمارے گاؤں کی چڑیا میں اتنی زیادہ مماثلت کیوں ہے۔

حاجی آغا کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے لیکن آج میں اسے بتاتا ہوں کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، کیوں نہ میں کسی وکیل سے قانونی مشورہ لوں تو وہ کہتے ہیں کہ تم خاموشی سے اٹلی سے نکل جاؤ، تم خوش قسمت ہو کہ اب تک بچے ہوئے ہو اور تمہیں کسی بھی کیس میں گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ کاش تمہیں علم ہوتا کہ امریکا اس وقت ساری دنیا میں اپنے مفادات کا کھیل، کھیل رہا ہے، وہ غریب اور کمزور ملکوں کے تیل، وسائل اور زمینوں پر قبضہ کرنا چاہ رہا ہے اور انہیں لوٹنا چاہ رہا ہے۔ جبکہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے وہ اسے دہشت گردی سے جنگ کا نام

دے رہا ہے اور یوں اس لوٹ مار میں اٹلی بھی اس کا ساتھی بنا ہوا ہے۔ اسی لیے تو یہاں کی پولیس تم سے اتنا زیادہ پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس تمہیں امریکا کے حوالے نہ کردے۔ پھر تم ساری زندگی امریکیوں سے اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تم پر اپنا زیادہ تشدد کریں کہ تم جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں کیوبا کے نزدیک اپنے مخصوص جزیرے میں قید کردے۔ یوں اگر تم وہاں مر بھی جاؤ تو کسی کو تمہاری موت کا پتہ نہیں چل سکے گا۔

اب میں سچ مچ پریشان ہو جاتا ہوں۔ میں اٹلی سے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن سخت مجبوری کے عالم میں کچھ عرصے کے لیے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیتا ہوں۔ جس وقت میں اپنے فلیٹ کو چھوڑ رہا ہوتا ہوں تو میرا دل بہت دکھ رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا شہر کے بازاروں میں بڑے بڑے جلوس نکل رہے ہوتے ہیں، یہ تو لاکھوں لوگ ہیں، ان سب کے ہاتھوں میں پلے کارڈز ہیں، یہ سب امریکا کے خلاف نفرت کا اظہار کر رہے ہیں، تیسری دنیا سے متعلق اس کی لوٹ مار کی پالیسی پر احتجاج کر رہے ہیں اور امریکا کو افغانستان پر قبضے کے بعد اب عراق پر حملہ اور قبضہ کرنے سے منع کر رہے ہیں۔ انھوں نے امریکی صدر کے خوفناک ماسک بھی اٹھائے ہوتے ہیں، لوگوں کا خون پینے والا امریکی صدر، جن سے واقعی ڈر لگنے لگتا ہے۔ یوں میں قریبی ملک اپنے ایک گہرے دوست کے گھر جانے کے لیے زمین دوز ریل گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔

یہاں سفر میں بھی میں حیران رہ جاتا ہوں، یہ کیا، چڑیا ریل گاڑی میں بھی موجود ہوتی ہے اور یہاں کھڑکی میں بیٹھی مجھے تک رہی ہوتی ہے۔ یہ یہاں کیسے آئی۔ یہاں یہ بات بھی تعجب خیز ہوتی ہے کہ کسی بھی مسافر کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی کو نظر ہی نہیں آ رہی ہو۔ کیا صرف میں ہی گنجی چڑیا کو دیکھ سکتا ہوں اور یہ صرف مجھے ہی نظر آتی ہے۔ اب میں اس سے ڈر جاتا ہوں۔ لیکن لمحہ بھر میں وہ یوں غائب ہو جاتی ہے جیسے اس نے اپنے سر پر سلیمان ٹوپی رکھ لی ہو۔

اس رات روم کا شہر پھر مجھے خواب میں نظر آتا ہے جو سرخ شعلوں کی لپیٹ میں ہوتا ہے، یہ کیا، اب وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر اس آگ کو بجھانے کی خاطر اس پر پانی پھینک رہا ہوتا ہے۔ لیکن آگ بجھتی نہیں بلکہ اس کے شعلے مزید ہوا میں بلند ہوتے ہیں اور یوں اس آگ میں بے شمار ننھے منے اور پیارے بچے جل رہے ہوتے ہیں۔ جو درد، جلن، زخموں اور دہشت سے چیخ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کیا دور ایک شخص ان تمام باتوں سے بے نیاز بیٹھا بانسری بجا رہا ہوتا ہے۔ روم جل رہا

ہے لیکن اس شخص کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ یوں مجھے اس شخص کی بے حسی پر بہت غصہ آتا ہے۔
اگلے دن صبح ہی صبح میں اپنے دوست کے فلیٹ میں بھی اس چڑیا کو دیکھتا ہوں۔ میں خود سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا اسرار ہے، کیسا جادو ہے، یہ چڑیا کیوں میرا پیچھا کر رہی ہے لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ چڑیا آج مجھے عجیب سے انداز سے دیکھ رہی ہوتی ہے۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھ پر ہنس رہی ہو اور طنز کر رہی ہو۔ یہ کیوں اس طرح کر رہی ہے۔ میں چیخ پڑتا ہوں۔

آج مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چڑیا بول رہی ہو، مجھے میرا بچپن یاد دلا رہی ہو اور مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ اس وقت تو تمہیں اپنی بہادری اور طاقت پر ناز تھا۔ اب بتاؤ کہ بہادر تم ہو یا میں؟
پھر ایک دن ماں کی منتیں مجھے مجبور کر دیتی ہے کہ میں گھر روانہ ہو جاؤں، وہ کہتی ہیں کہ اگر تم نہیں آئے تو میں تمہیں اپنا حق نہیں بخشوں گی۔ دراصل روم میں بسنے والے ہمارے گاؤں کے چند لوگوں نے کابل میں اپنے رشتہ داروں کو ٹیلی فون پر یہ بتایا ہوتا ہے کہ پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے اور وہ مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ مجھ پر مقدمہ چلائے اور یوں ان لوگوں سے یہ بات کسی نہ کسی طرح ماں تک پہنچی ہوتی ہے۔ اب میں ڈر جاتا ہوں اور پھر اخبار کی یہ خبر تو مجھے مزید پریشان کر دیتی ہے کہ اٹلی کی پولیس ان ایشیائی دہشت گردوں کو یورپ بھر میں ڈھونڈے گی جو اب اٹلی سے بھاگ گئے ہیں۔ مجبوراً میں اس محبت کو اپنے دل سے دور پھینک دیتا ہوں جو مجھے اٹلی سے ہے اور وطن واپس روانہ ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا یہاں جہاز میں بھی مجھے چڑیا کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے اور وہ میرے سیٹ کے سامنے آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اب میں اور وہ ایک دوسرے کو مسلسل دیکھتے ہیں۔ لیکن آج مجھے چڑیا پر بہت پیار آ رہا ہوتا ہے۔
''پیاری سی چڑیا۔'' میں اسے کہتا ہوں۔ ''بابا خوب کہتے تھے کہ اگر سائبیریا کی سرد ترین ہوائیں چل رہی ہوں یا سبی کی جون جولائی کی مار دینے والی گرمی ہو، تمام پرندے وطن چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں لیکن وفادار چڑیا اپنا وطن نہیں چھوڑتی تو بہادر اور طاقتور میں نہیں تم ہو۔ کیونکہ وطن میں نے چھوڑا تھا، تم نے نہیں۔''

اب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہوائی جہاز کے طویل سفر میں بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آ جائے اور میں سو جاتا ہوں۔ اب میں اپنے اس گزشتہ خواب کو دوبارہ دیکھتا ہوں، چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور بہت سارے لوگ ہیں جو اس آگ پر پانی پھینک رہے ہیں لیکن وہ آگ بجھ نہیں رہی

بلکہ اس میں مزید شدت آ رہی ہے۔ وہ شخص بانسری بجا رہا ہوتا ہے اور جسے آگ کی پرواہ نہیں ہوتی، وہ بھی وہاں موجود ہے۔ پھر مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ وہ بے حس شخص تو اور کوئی نہیں بلکہ میں خود ہوں اور آگ کی جگہ روم کا شہر نہیں بلکہ میرا اپنا گھر ہے، وہی ہمارا گاؤں والا گھر جسے میں نے جنگ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، دیکھیئے وہی اس کا سفید رنگ کا دروازہ ہے اور وہی اس کے زیتون کی شاخوں سے سجے اونچے برج ہیں، میں بڑبڑاتا ہوں۔ اب جب میں لوگوں کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کیونکہ وہ سب اجنبی اور غیر ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں پانی سے بھرے برتن ہوتے ہیں اور وہ چیخ رہے ہوتے ہیں کہ جلدی کرو، آگ بجھاؤ ورنہ مزید تباہی پھیل جائے گی۔ اب اپنے گھر کی محبت مجھے ایسا اندھا بنا دیتی ہے کہ میں آگ کے ان سرخ شعلوں میں بھی گھر کے اندر گھس جاتا ہوں۔ یہ کیا وہاں سب کچھ تباہ ہو چکا ہوتا ہے، سب وہاں سے جا چکے ہوتے ہیں البتہ وہاں جو اکلوتی ذی نفس موجود ہوتی ہے، وہ گنجی چڑیا ہوتی ہے جو ایک سوکھے درخت کی شاخ پر پریشان بیٹھی ہوتی ہے اور جس نے گھر کو نہیں چھوڑا ہوتا۔ چڑیا جب مجھے دیکھتی ہے تو وہ خوش ہو جاتی ہے، اپنے پروں کو ہوا میں مارتی ہے، اڑ کر میری طرف آتی ہے اور پیار سے مجھ سے چمٹ جاتی ہے۔ یوں میں بھی اسے چومتا ہوں اور اپنی بانسری کو دور پھینک دیتا ہوں۔ اب ہم دونوں روتے ہیں اور اس شدت سے روتے ہیں کہ ہمارے آنسوؤں سے ہماری تمام حویلی بھر جاتی ہے اور پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ ہماری آنکھوں کے اس سیلاب سے وہ آگ بجھنا شروع ہو جاتی ہے، جسے باہر کھڑے بہت سارے اجنبی بجھانا چاہ رہے تھے لیکن وہ بجھ نہیں رہی تھی۔

خالد محمود خان

ہرنی کی آنکھیں

علاقے میں شاید ہی کوئی ایسی جگہ، جانور یا پرندہ ہو سکتا تھا اس نے جسے نہیں دیکھا تھا۔ صحرا، چٹیل میدان اور دریا کے کنارے، سب اس کی کائنات میں شامل تھے۔ درختوں، جھاڑیوں، پودوں اور بے شمار جڑی بوٹیوں کی ترتیب اور بے ترتیبی، ایک ہی انداز میں اس کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی۔ ان میں چھپے ہوئے راستوں میں سے اُڑتے ہوئے پرندے اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کا اچھا لگنا ہی اس کے لیے کافی تھا۔ اس کے دل نے ان کو پکڑنے کی خواہش کبھی نہیں کی۔ ایک طرف تو وہ انہیں دیکھ کر ہی مطمئن رہتا دوسری طرف انہیں مزید دیکھنے کی آرزو کرتا۔ یہ آرزو چڑیا گھر کے تصور نے اور بھی حسین کر دی۔

چند کوس پیدل چلنے کے بعد یوسف اپنے ماموں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ گرمی کی چھٹیاں اکثر وہ انہی کے ہاں قصبے میں ٹھنڈی کیا کرتا تھا۔ گاؤں، گرمی اور گنوار، سب پیچھے ہی رہ جاتے۔ اب کی بار اس خوشی میں چڑیا گھر دیکھنے کی خوشی بھی شامل تھی۔ وہ ریل گاڑی میں کھڑکیوں سے چمٹا ہوا تیزی سے گزرتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔ چھکا چھک چھک چھک کی آوازوں میں دور درختوں کی خاموشیاں اور بھی خاموش ہوتی گئیں۔ ساری دنیا ریل کے اردگرد یا شاید اس کے اردگرد تیزی سے گھوم رہی تھی۔ صرف وہی ساکن تھا۔ گھومتے ہوئے درختوں میں چھپے پرندے دِکھائی دینے لگے۔ ایک درخت جھاڑی یا بُوٹی سے پُھر کر کے اٹھنا اور چھپاک سے دوسری جھاڑیوں میں بیٹھ جانے کا تصور اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ چڑیا گھر کے تصور نے اس کے خیالات میں رنگوں کی نئی پھوہاریں برسادیں۔ ریل کی بجائے اس کے اپنے ہی گرد گھومتے جنگل، بادل، پرندوں اور جانوروں کے ساتھ چڑیا گھر کی چڑیاں بھی شامل ہوگئیں۔ اس کے ذہن میں پرندوں کے رنگوں اور آوازوں کا میلہ سا سج گیا۔

چھک، چھک، چھکا چھک کی آواز میں تسلسل اور تیزی پیدا ہوتی گئی۔ گاڑی اگر کسی

پل، پھاٹک، نہر یا دریا سے گزرتی تو چھکا چھک کی ترتیب میں پھٹا پھٹ، ٹھک ٹھک کی بے ترتیبی شامل ہو جاتی۔ ریل کی آوازوں میں کبھی کبھی ایک انسانی آواز بھی شامل ہو جاتی۔ ایسے لگتا جیسے کوئی رونے کی کوشش کرتا اور رونے سے پہلے خاموش ہو جاتا تھا۔ ایسے میں اس کا اپنے گرد گھومتی دنیا کا رابطہ ٹوٹ جاتا اور وہ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس کے ماموں نے اسے بتایا کہ ساتھ کی نشستوں پر ایک مریض سفر کر رہا تھا۔ اس کی حالت زیادہ خراب تھی اور سب مسافر اس کے لیے پریشان تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ننھے ننھے قدم اٹھاتا ہوا دوسری طرف کی کھڑکی کے ساتھ چمٹ گیا۔ ریل کے گرد گھومتی ہوئی دنیا اسی کی طرف آ گئی۔ مگر ریل کی آواز میں چھکا چھک اور ٹھک ٹھک کی بجائے مریض کے کراہنے کی آواز نمایاں ہو گئی۔ اس نے کن اکھیوں سے پچھلی نشستوں پر لیٹے ہوئے ایک آدمی اور بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔

وہ دونوں اپنے لباس، چہرے بشرے اور زبان سے خانہ بدوش لگتے تھے۔ اس قسم کے خانہ بدوش اس کے اپنے علاقے میں بھی بھیڑ، بکریاں، گدھے اور گائیں چراتے پھرتے رہتے تھے۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ مرد لمبا تڑنگا پوری نشست پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک بھری بھری، سانونی سنہری عورت اس کے سر کو گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی اُٹھتی ہوئی ناک کے ایک نتھنے پر سونے کی ایک بڑی نتھ سجی تھی۔ اس کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے کٹاؤ تھے۔ جیسے رات کے وقت دمکتے ہوئے ستاروں کے اردگرد۔ سنہری روشنی عورت کے چہرے پر کبھی ایک کٹاؤ سے بہہ نکلتی اور کبھی دوسرے سے۔ مریض نے اچانک اپنا سر اس کی گود سے اٹھانے کی کوشش کی اور پکارا "ہمیں بہت دور جانا ہے۔ گاڑی وہاں تک جائے گی؟'' اس کے لفظ رونے کی کوشش میں حلق میں پھنسی ہوئی چیخ کی طرح تھے۔ اس کا سر عورت کی گود میں گر گیا۔ اس نے مرد کے سر کو اپنی گود میں سنبھالا دیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر جیسے وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ مسافر، ریل کی نشستیں اور اردگرد گھومتے ہوئے درخت، زمین، بادل، آسمان، کوئی چیز بھی اس کی آنکھوں میں نہیں اتری تھی۔ مریض کی آنکھوں کی سیاہی اور گہرائی عورت کی آنکھوں سے بھی زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔ وہ بار بار اپنے حلقوم سے ایک ہی قسم کی آواز برآمد کرنے کی کوشش کرتا "ہمیں

بہت دور جانا ہے۔ گاڑی وہاں تک جائے گی؟'' مگر اس کی بات کا جواب کوئی نہیں دیتا تھا۔

لوگ ہمدردی سے ان دونوں کی طرف دیکھتے اور اپنے ہونٹوں پر ایک افسردہ خاموشی پہن لیتے۔ وہ اس انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے جیسے کچھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ یوسف کے اردگرد گھومتی ہوئی دنیا ریل کے باہر رہ گئی اور اندر صرف اس مرد اور عورت کی ملتی جلتی آنکھیں رہ گئیں۔ گہری کالی بڑی بڑی، پھیلی ہوئی کچھ پوچھتی ہوئی، ہر جواب سے محروم۔ وہ ان آنکھوں میں درخت، پرندے، بادل اور گھومتا جھومتا ہوا آسمان ڈھونڈتا رہا۔ ریل کی چھکا چھک، ٹھکا ٹھک میں کمی ہوتی گئی اور عورت کی چیخ و پکار میں تیزی۔ اس کی چیخ و پکار میں آوازیں ہی آوازیں تھی اور کوئی لفظ نہ تھے۔ لوگ انہیں ہمدردی سے دیکھتے ہوئے ان کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ یوسف اس عورت اور مرد کی ملتی جلتی آنکھوں کو یاد کرلینا چاہتا تھا۔ گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی تھی۔ ماموں نے ایک ہاتھ میں اس کا ہاتھ اور دوسرے میں اس کا بیگ لیکر اترتے ہوئے کہا ''ہمارا اسٹیشن آگیا ہے"۔ یوسف کے کانوں میں ایک ہی آواز سنائی دیتی رہی۔ "ہمیں بہت دور جانا ہے۔ گاڑی وہاں تک جائے گی؟'' یوسف مٹھیاں بھینچ کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ وہ ان کی دھندلاہٹ کم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس عورت اور مرد کی بڑی بڑی، سیاہ، کھلی ہوئی بے منظر آنکھوں کے علاوہ بہت کچھ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ان کی آنکھیں گہرائیوں کی طرح تھیں جن میں اندھیرے سیلاب کے پانیوں کی طرح اترتے ہی جارہے تھے۔

قصبے کے ایک میدان میں چڑیا گھر لگایا گیا تھا۔ یہ متحرک چڑیا گھر تھا۔ شہر شہر اور قصبے قصبے کئی کئی دن رہتا اور پھر کسی اور شہر یا قصبے کی طرف چلا جاتا تھا۔ کپڑے کی میلی پھٹی چادروں کے اندر کچھ پنجرے رکھے ہوئے تھے جن میں چڑیاں اور پرندے کم کم اور جانور زیادہ دکھائی دیئے۔ شیر، گیدڑ، بھیڑیا، اژدھا، ہرن کے علاوہ چند اور مریل روحیں۔ سلاخوں کے پیچھے پرانے جانور بے بس اور نئے جانور بے چینی کا شکار نظر آتے تھے۔

وہ انہیں بہت گرم جوشی سے دیکھنے گیا مگر ان کی بے بسی اور بے چینی میں الجھ کر رہ گیا۔ خاص طور سے ہرنی کو دیکھ کر۔ وہ بار بار پانی کے گندے برتن چاٹنے لگتی اور پھر اپنا منہ ٹانگوں پر صاف کرتی رہتی۔ دوسرے جانور بھی ایسا ہی کرتے مگر ہرنی کی آنکھیں اسے بے

حد اداس کر گئیں۔ کالی، کالی، بڑی، بڑی، پھیلی پھیلی کچھ کہتیں اور کچھ پوچھتی اور کچھ چھپاتی ہوئی۔ اس کے پاس ان کے لیے کوئی سوال تھا نہ جواب۔ کوئی راز نہ کوئی رمز۔ اس کی آنکھوں میں نفرت یا غصّے کی سرخی تھی نہ محبت کی چمک۔ شاید اس کی آنکھوں میں اس کی آزادیوں کی کائنات تھی ہی نہیں۔ ایسے ایسا لگتا تھا جیسے قید نے اس کی آنکھوں کو بے رونق کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں گہرائیوں میں اترتے ہوئے نہ ختم ہونے والے راستوں کی طرح تھیں۔ بے نشان منزلوں کی طرف مسلسل بڑھتے ہوئے راستے۔ ساتھ کے پنجرے میں شیر بار بار دھاڑتا تھا۔ اسے بار بار ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس کے دھاڑنے سے لوگوں کی تعداد میں اور چڑیا گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ وہ جب بھی دھاڑتا، ہرنی کی پتلی پتلی ٹانگوں کے سُم پنجرے کے فرش پر اِدھر اُدھر پھسلنے لگتے۔

گھر کا صحن ٹھنڈا ہو رہا تھا اور بجلی کی روشنی میں روشن۔ ماموں اور ان کی بیگم ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ماموں کی بنیان میں سے ان کے سینے کے بال باہر جھانک رہے تھے۔ ان کی بات سنتے سنتے بیگم کا منہ بار بار کھل جاتا تھا۔ بچے خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے۔ کوئی چارپائی پر لیٹ گیا اور کوئی باتھ روم کی طرف لپکا۔ یوسف کو ماموں نے بغل میں لے کر پیار کیا اور اپنی بات کو جاری رکھا۔

''وہ دونوں نوجوان مرد اور عورت میاں بیوی ہی لگتے تھے۔ مرد کے لمبے تڑنگے کمزور اور عورت کے صحت مند سانولے سنہرے جسم کے درمیان کوئی روحانی رشتہ تھا۔ مرد کا جسم بالکل زرد تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ترتیب سے مونچھیں سجی ہوئی تھیں۔ ہمارے پاس بیٹھا ہوا ایک مسافر اس مریض کو پہچانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ علاقے کے ایک زمیندار نے حکومت سے غیر آباد زمین نیلامی میں حاصل کی۔ اس کو ہموار اور قابل کاشت بنانے کے لیے خانہ بدوشوں کے قبیلے کو ٹھیکہ دیا گیا۔ خانہ بدوش مرد دن بھر کی گرمی دھوپ اور حبس میں زمین کی کھدائی کر کے ہموار کرتے۔ بچے اور عورتیں بھیڑیں، بکریاں گدھے اور بیل گائے چراتے چراتے وہاں سے گزرتے اور ان کے لیے پوٹلیوں میں بندھا لپٹا کھانا چھوڑ جاتے۔ یزمان اسی قبیلے کا نوجوان تھا۔ قبیلے کے سرداروں نے اسے کام کرنے والوں کا سربراہ بنا دیا تھا۔ وہ طاقت، ہمت اور جذبے میں بے مثال سمجھا جاتا تھا۔ وہ نہ صرف سب سے زیادہ کام کرتا بلکہ

سب سے دیر تک بھی۔ وہ کام چوروں سے شکایت کرنے کی بجائے ان کا کام بھی بھگتا دیتا۔ جب شام کے وقت سارے ساتھی اپنے خیموں میں پلٹ جاتے تو اس کی بیوی اس کے پاس پہنچ جاتی۔ اسے بکری کے دودھ کی نمکین لسی پلاتی اور واپس اپنے خیمے میں لے جاتی۔

ان کی محبت کے چرچے ان کے خیموں سے باہر دیہاتوں تک جا پہنچے۔ ان کی کہانی میں لوگوں نے اپنی اپنی محبتوں کے رنگ بھرے اور نئی نئی کہانیوں نے جنم لیا۔ جن کے مرکزی کردار یزمان خانہ بدوش اور اس کی بیوی ہی رہتے۔ یزمان نے ایک سال کے اندر اندر زمین دار کی زمینوں پر کام مکمل کر دیا۔ خانہ بدوشوں میں خوشحالی آگئی اور زمیندار کی زمینوں میں سرکاری زمین کا اضافہ ہو گیا۔ مگر یزمان کے چہرے کے سانولے سنہرے پن میں زردیاں اترتی گئیں اور وہ خود ہموار شدہ زمینوں کی کسی گہرائی میں۔ اس کی بیوی کسی دور کے قبیلے سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ قبیلے کے لوگ لمبے لمبے عرصوں کے بعد ایک دوسرے سے ملنے آتے۔ ان کے آنے پر بھیڑ بکری ذبح کر کے ان کی ضیافت کی جاتی اور عورتیں خوشی کے گیت گاتیں۔ ان گیتوں میں یزمان اور اس کی بیوی کا نام بھی شامل کر دیا جاتا۔ یہ گیت خانہ بدوشوں کے خیموں سے لیکر اردگرد کی بستیوں تک پھیلتے گئے۔ گیتوں میں یزمان اور اس کی سانولی سنہری بیوی کی محبت کا ذکر بہت ضروری خیال کیا جاتا تھا"۔ ماموں نے اپنی بنیان سے باہر جھانکتے ہوئے بالوں کو سہلاتے ہوئے بات کو جاری رکھا۔ "ممکن ہے وہ گرمی، دھوپ حبس اور کام کی زیادتی کے باعث کسی جان لیوا مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اس کی بیوی اسے اپنے میکے کے قبیلے میں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ ریل میں سفر کے دوران اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بار بار پوچھتا رہا "ہمیں بہت دور جانا ہے۔ گاڑی وہاں تک جائے گی؟" مگر اس کی زندگی اپنے کسی پلیٹ فارم پر اتر گئی اور گاڑی چلتی رہی۔ اس آدمی کے وجود کے ساتھ عورت کی آہ و بکا کے سوا کوئی ہم سفر نہ تھا۔ عورت کی آوازوں میں کوئی معنی نہ تھے۔ ان آوازوں میں معانی، نشان، سمت یا کسی منزل کا اتا پتہ، کچھ بھی نہ تھا"۔ گھر کے روشن صحن میں بجلی کا پنکھا گھوم گھوم کر سب کو ٹھنڈی ہوا پہنچا رہا تھا۔ ماموں کی بیگم نے سب کو کھانا دیا۔ وہ ہر کام کرنے کے بعد ماموں سے چمٹ چمٹ کر بیٹھ جاتیں۔ یوسف پنکھے کو گھومتے ہوئے دیر تک دیکھتا رہا۔ اسے پنکھے میں ریل کے اردگرد گھومتی دنیا دکھائی دینے لگی اور وہ اس میں

چکراتا ہوا سو گیا۔

پھر ایک دن چڑیا گھر نے اپنی منزل بدل دی۔ پھٹی ہوئی چادروں کی دیواریں لپیٹ دی گئیں۔ جانوروں اور پرندوں کو ایک رات بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ اگلی صبح ان کے پنجروں کو بیل گاڑیوں پر لاد دیا گیا۔ ان میں مریل سے بیل جتے ہوئے تھے۔ جنہیں بار بار چھانٹے مار مار کر گاڑی کھینچنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ بیل اس حکم کی تعمیل میں اپنی طاقت سے زیادہ زور لگا رہے تھے۔ بچے، مرد، عورتیں، گویا پورا قصبہ چڑیا گھر کو خدا حافظ کہنے اُمڈ آیا تھا۔ ہر کوئی آگے بڑھ کر اپنی پسند کے جانور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ کون گرا، کون اٹھا۔ کس کا پاؤں گندی نالی میں دھنس گیا اور کس کا جوتا گندگی میں رہ گیا۔ چڑیا گھر پھٹی ہوئی چادروں کی دیواروں سے باہر نکل آیا تھا جسے دیکھنے پر نہ کوئی ٹکٹ نہ پابندی تھی۔ بہت سے لوگ فری میں چڑیا گھر دیکھنے آئے تھے۔ یہ نادر موقع کوئی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ پہلی بیل گاڑی کے پنجرے کے اوپر اچانک ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ وہ بڑھاپے میں بھی لڑکوں کی طرح چست، چالاک لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں اپنے سینے کے سامنے بلند کیے۔ ''دھن بھاگ بڑھے پھلے۔ مال جان کی خیر۔ آپ سب نے ہمیں بہت پیار دیا۔ بہت خیال رکھا۔ کام بھی خوب چمکا۔ ہماری جیبیں اور جھولیاں قصبے کے کرم سے بھر گئیں۔ ہمارا ڈیرہ کوچ کرنے والا ہے۔ جیتے رہے تو اگلے سال پھر آؤں گا۔ میرے ساتھی، جانور، پرندے سب آپ کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ یہ قصبہ دل والوں کا ہے۔ دل والے ہی امیر ہوتے ہیں۔ ہم بھی یہاں غریب نہیں رہے۔'' اس نے یہ لفظ کہتے ہوئے آنکھ بند کر لیں اور دیر تک اسی طرح ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔

مریل بیل گاڑی کھینچنے کی کوشش میں اپنی طاقت سے زیادہ زور لگا رہے تھے۔ ان کی کمر پر پڑنے والا ہر چھانٹا، کسی پرانی یاددہانی کی طرح تھا۔ اس سے ان کے وجود کی تکلیف میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ چڑیا گھر کے پیچھے پیچھے گویا پورا قصبہ گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ یوسف اپنی پسند کے پنجرے والی گاڑی کے پیچھے ہو لیا۔ وہ کئی بار چڑیا گھر دیکھ چکا تھا اور مزید دیکھنا چاہتا تھا۔ کوئی چیز بار بار اسے بلاتی تھی اور وہ اس کی ہر آواز پر وہاں چلا جاتا۔ وہ اس آواز کو تلاش کرتے ہوئے، سارے جانوروں کو پھر سے نئی نظر سے دیکھتا۔ اسے یوں لگا

جیسے ہرنی اسے پہچانتی تھی وہ اپنا منہ ٹانگوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ حالانکہ اس کا پانی کا برتن ایک دن پہلے ہی اس کے پنجرے سے باہر نکال لیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح تھیں۔ بڑی بڑی، کالی کالی، گہری گہری اور کھلی کھلی۔ ان میں شاید اس کی آزادیوں کی کائنات ڈوب چکی تھی۔ ڈوبنے کے منظر میں ریل کے مریض اور نوجوان عورت کی آنکھیں بھی شامل ہوگئیں۔ یوسف نہ تو جاتے ہوئے چڑیا گھر کو دیکھ رہا تھا نہ اس کے پیچھے گرتے پڑتے لوگوں کو۔ اسے نہ تو گاڑیاں ہانکنے والوں کی ہاہا کار سنائی دے رہی تھی، نہ گاڑیوں کی کھٹ پھٹ۔ اسے ہرنی کی آنکھوں میں لکھا ایک ہی جملہ سجھائی دے رہا تھا۔ ''ہمیں بہت دور جانا ہے۔ گاڑی وہاں تک جائے گی؟'' گاڑی کا پہیہ اگر کسی نالی میں دھنس جاتا یا کسی ناہموار جگہ پر ہوتا تو گاڑی سمیت ہرنی کا پنجرہ جھولنے لگتا ایسے میں پوری دنیا یوسف کے گرد گھومنے لگتی۔ اس کے گلے میں سے ایسی آواز نکلتی جیسے وہ رونے کی کوشش کر رہی ہو مگر رو نہ سکتی تھی۔

پرائمری مکمل کرنے کے بعد یوسف ماموں کے ہاں قصبے میں آٹھہرا۔ درمیانہ درجے کا طالب علم ہونے کے باوجود وہ محنت اور تسلسل سے کام کرتا رہا۔ اس کی کامیابیوں میں ایک قسم کی ہمواری اور تسلسل تھا۔ اس کا وجود بہت سے بچوں کے لیے بابرکت ثابت ہوا اور وہ باوقار زندگی تلاش کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ یوسف ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہوگیا۔ کمپنی کے کاروبار کا دائرہ شہر سے دیہاتوں اور بیرونی ملکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اچھی تنخواہ کے علاوہ، گاڑی، گھر، فون اور اختیارات سے اس کے سماجی مقام اور مرتبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ علاقے کے زمیندار اور سیاست دان بھی اس کی قدر کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے علاقے کے بڑے بڑے اہل کار بھی یوسف کی عزت کرتے تھے۔ سیاست دان اس کے اثر ورسوخ سے انتخابی کامیابیاں حاصل کرتے۔ یوسف کے کہنے پر بہت سے عوام انہیں نہ چاہنے کے باوجود بھی ووٹ دے دیتے۔ وہ دیہاتوں سے اسمبلیوں اور وزارتوں تک جا پہنچتے۔ اس کی وجہ سے بڑے بڑے سرکاری اہل کار اپنی نوکری کو محفوظ سمجھتے تھے۔ انہیں زمینداروں، رئیسوں اور سیاسی نمائندوں تک رسائی حاصل ہو جاتی تھی۔ یوسف نے اپنے اثر ورسوخ کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے بہت سی سرکاری زمینوں کے

چھوٹے چھوٹے قطعات بے زمین ہاریوں کو الاٹ کروائے۔ بینکوں سے آسان شرائط پر قرضے دلائے۔ جہاں نہری پانی نہیں تھا وہاں آسان اقساط پر ٹیوب ویل لگوانے کا اکثر اہتمام کرتا رہتا۔ اس کی کوششوں کا مجموعی طور پر صحرائے تھر اور اردگرد کے علاقوں کے باسیوں کی معاشی زندگی پر خاطرخواہ اثر نہ پڑا۔ مگر انفرادی طور پر کچھ لوگوں نے اس سے ضرور فائدہ اٹھایا۔ اس کے خیالات لوگوں کو بے حد عزیز تھے۔ وہ اس کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ کس کو اس سے کیا فائدہ ہوا۔

دس سالہ قحط سالی نے صحرا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس عرصے میں تھوڑی بہت بوندا باندی یا ہلکی بارش نے اس کی پیاس کو مزید آگ لگادی۔ کہیں سے بھولے بھٹکے بادل، تھر کے سر پر اگر کچھ دیر رک بھی جاتے تو بحیرۂ عرب کی تیز ہوائیں بادلوں کو مشرق اور شمال کی طرف دھکیل دیتیں۔ وہ سرسبز میدانوں اور دریاؤں کے سینے پر برستے ہوئے کہیں اور چلے جاتے۔ تھر کے سینے پر اُگنے والی جھاڑیاں، پودے، بوٹیاں یا شاید درخت ان بادلوں کو لوٹ جاتے ہوئے، حسرتوں سے تکتے رہتے اور ان کے وجود سے پتوں اور شاخوں کے گرنے کی رفتار بڑھتی رہتی۔ صحرا کا سینہ مرتے ہوئے ذی روح کی آنکھوں کی طرح ویرانی کا اظہار کرتا۔ بھیڑ، بکریاں، گائے، بیل کے گلّے مسلسل چھوٹے ہوتے رہتے۔ جو بچ جاتے وہ سرسبز علاقوں کی طرف ہجرت کر جاتے۔

ان کے ہجر میں ہجرت کا فیضان نہیں تھا۔ بس صحرا کا ہجر تھا۔ بے بسی کی ایک دوسری کیفیت۔ ان کے لیے نہ صحرا میں زندگی کے امکان تھے اور نہ سبزہ زاروں میں۔ ہجرت کی آرزو بے بسی کی دو انتہاؤں کے درمیان تڑپنے کی تسلی کی طرح تھا۔ سندھ کے سبزہ زاروں کی طرف ہجرت کرنے والے خاندان راستے ہی میں مقروض ہونے لگتے۔ آٹا، گندم، نمک، مرچ اور جانوروں کے چارے کے حصول کے لیے وہ محنت مزدوری پر لگ جاتے۔ یہ مزدوری انہیں کھیت مزدوری کی شکل میں ملتی تھی۔ مالکان کو بالعموم رئیس ہی کہا جاتا تھا۔ رئیس کا دیا ہوا قرض آٹے، گندم، چاول وغیرہ کی شکل میں ہوتا تھا۔ ہجرت کرنے والے خاندانوں کی تعداد اور ضروریات سے قرض کا کوئی تناسب نہیں ہوتا تھا۔ وہ بار بار قرض لیتے اور آئندہ سالوں تک کام کرنے کا پیشگی معاہدہ کر لیتے۔ ان کے لہو پسینے سے زمینیں کھلنے لگتیں اور سبزہ

لپکنے لگتا۔ مگر ان کی برکتیں ان کی اپنی جھونپڑیوں تک کبھی نہ پہنچتیں۔ جو کچھ رئیس کی ضرورت سے اضافی ہوتا شہروں کے بازاروں میں جا بکتا۔ اور رئیس اور بھی بڑے رئیس بن جاتے۔ روپیہ پیسہ ان کے یہاں مسلسل بڑھتا رہتا۔ مگر اس میں تھری مہاجروں کے لہو پسینے کا رنگ کسی کو دکھائی نہ دیتا۔ وہ تھر میں بے بسی سے نجات حاصل کرنے نکلتے اور کسی اور بے بسی یا غلامی کا شکار ہو جاتے۔ مہاجر مزدور خاندانوں کے اہم ترین افراد کو رئیس اپنی ذاتی جیلوں میں بند رکھتے تھے، تاکہ نہ تو خاندان کے افراد فرار ہو سکیں اور نہ کام سے باغی۔

رئیسوں کے ساتھ مزدور خاندانوں کے اس رشتے کو Bonded Labour جبری مشقت بھی کہا جاتا تھا۔ اس قسم کی جیلوں کو دریافت اور بے نقاب کرنا بہت ہی منافع بخش کاروبار تھا۔ جس کسی نے ہمت کر کے ایسی ایک بھی جیل دریافت کر لی، اس پر خزانوں کا منہ کھل جاتا۔ اس کا حصہ گھر بیٹھے اس تک باقاعدگی سے پہنچ جاتا۔ فصلیں تیار ہونے سے پہلے ہی حصہ داروں کے حقوق کا تعین کر دیا جاتا۔ مگر مہاجر مزدوروں کے ہاں بھوک، ننگ، بیماری، بے کسی، رنگ بدل بدل کر نازل ہوتے۔ عورتوں کی گم شدگی، اغواء زنا بالجبر سے لے کر قتل تک کی وارداتیں ہوتی رہتیں۔ اِکا دُکا واقعہ کی خبر چھپ جاتی یا مقدمے کا تذکرہ ہو جاتا تو اس اخبار کی فروخت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ البتہ ان کے حق میں کچھ نہ ہو سکتا۔ بین الاقوامی اداروں نے بھی اس موضوع پر رپورٹیں شائع کیں۔ بہت سی این۔ جی۔ اوز نے بھی کام شروع کر دیا۔ تھر کے عوام کی فلاح کے لیے ملک کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے بڑے ہال بک کرائے جاتے اور تھری عوام کے مسائل پر منصوبے ترتیب دیئے جاتے۔ غیر ملکی حکومتیں ازراہ ہمدردی ان کی مالی امداد کے لیے خصوصی فنڈز واگزار کرتیں۔ منصوبہ بندی کے اخراجات منصوبہ شروع ہونے سے پہلے ادا کر دیئے جاتے اور نئے منصوبہ کی منصوبہ بندی شروع کر دی جاتی۔

یوسف کی کمپنی کا تعلق عرب تاجروں سے تھا۔ عرب تاجر اکثر شکار کے لیے آتے رہتے۔ علاقے کے رئیس ان کی آؤ بھگت کرتے اور اس پر بے حد خوشی کا اظہار کرتے۔ اس سے ان کے عزیز و اقارب اور پسندیدہ لوگوں کو عرب ممالک میں روزگار یا رہائشی ویزہ آسانی سے مل جاتا۔ بہت سے رئیس عرب شکاریوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرتے، بس ان کے

تعلق پر فخر کرتے رہتے۔ عرب شکاری شکار کے لیے خاص گاڑیاں بھی اپنے ساتھ لاتے۔ کھانے، پینے اور نہانے دھونے تک کی سہولیات ان کے ہمراہ ہوتیں۔ بندوقوں اور اسلحہ کے علاوہ شکار کی تلاش کرنے کے لیے لوگوں کی ٹولیاں ان کے ساتھ شامل ہو جاتیں۔ لوگ مہینوں عرب شکاریوں کی گاڑیوں کے آگے آگے شکار کو ہانکا لگاتے یا زخمی جانوروں کو پکڑ پکڑ کر لاتے۔ انہیں کوئی معاوضہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ دو وقت کی روٹی اور ایک مختلف مصروفیت کے جادو میں گرفتار، شکاریوں کے ساتھ پھرتے رہتے۔ وہ صرف ہنکارے تھے اور شکار کو ہانکا لگا کر گھیر لاتے۔ اچھا شکار ان ہی کی وجہ سے ہوسکتا تھا۔ وہ جانوروں، پرندوں کی عادات کے علاوہ صحرائی راستوں کو بھی جانتے پہنچانتے تھے۔ ان کی وجہ سے ہرنی، جنگلی بکریاں، خرگوش، تیتر، بٹیر اور سب سے بڑھ کر تلور جیسا قیمتی شکار بھی ان کے ہاتھ چڑھ جاتا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کونسا پرندہ یا جانور کہاں اور کس قسم کے ماحول اور موسم میں مل سکتا تھا۔ شکار پر قانونی پابندیاں جیسے جیسے سخت ہوتیں، شکاریوں کی جیبیں کھلتی جاتیں۔ قانونی پابندیاں بھی قائم رہتیں اور شکار بھی جاری رہتا۔ صحرا ایک ایسے مرکز کی طرح تھا جہاں اس کے باسیوں کے لیے زندہ رہنے کے اسباب اور بہانے ختم ہوتے جاتے۔ صحرا ان پر زندگی کے دروازے بند کرتا چلا جاتا۔ اسی صحرا میں عرب شکاریوں کو سب کچھ مل جاتا تھا۔ ان کے شکار کا دائرہ جانوروں اور پرندوں کے علاوہ مجبور و مقہور دوشیزاؤں سے لے کر پیشہ ور حسیناؤں اور معروف اداکاراؤں تک پھیلتا چلا جاتا۔ تھر کے عقاب بھی اپنی وحشت و آزادی کی حفاظت نہ کر سکتے اور شکاریوں کے پنجروں میں بند ہو کر عرب ممالک میں پہنچ کر بے حد قیمتی قیدی بن جاتے اور بعد میں قیدی شکاری۔ تھر کے عوام کی طرح۔

کمپنی کے خصوصی احکامات کے تحت یوسف کو عرب تاجر شکاریوں کے ساتھ ہونا پڑتا تھا۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ بہت سے لوگوں کو مزدوری یا کم از کم روٹی پانی اور مصروفیت مل جاتی تھی۔ کم و بیش دس سالہ قحط سالی کے بعد اس برس مون سون کے بادل بحیرۂ عرب کی ہواؤں سے تھر کے جنگ 'جو یاروں کی طرح ٹکرا گئے اور کئی دن تک مہربان دوستوں کی طرح صحرا کے سینے پر حیات کی بوندیں برساتے رہے۔ برساتیں برستی رہیں اور رحمتوں کا نزول پانیوں کے عذاب میں ڈوب گیا۔ گھاس پھوس کی جھگیوں کے گاؤں کے

گاؤں پانیوں میں بہتے رہے۔ قحط سالی کا عذاب پانیوں میں منتقل ہوتا گیا۔ کتنے عوام ڈوب مرے، سرکاری کارندے اس کا درست حساب نہ لگا سکے۔ کون کون کس کس بیماری میں مبتلا ہوا ، اسپتالوں میں ان کی تشخیص نہ ہوسکی۔ سیاسی نمائندوں نے کھل کر ہمدردیوں کا اظہار کیا۔ حکومت نے ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں سے علاقے کا تفصیلی معائنہ کیا۔

سب کچھ ہو گزرنے کے بعد آخر کار جھاڑ جھنکار پر سبزے کی پھوہار برسی۔ بچے کھچے جانور اور پرندوں کے ساتھ ساتھ عرب شکاری نہال ہو ہو کر نمایاں ہوتے گئے۔ وہ خوشی سے جھوم جھوم جاتے۔ تھر کے مہاجر اپنے جانوروں سمیت اپنی صحرائی جنت کی طرف لوٹنے لگے۔ جو مقروض تھے وہ جانے والوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے اور دعاؤں کی ٹھنڈک ان کے ہمراہ کردیتے۔

صحرا کے سبزی مائل سنہری سینے پر دھوپ چمک رہی تھی۔ شکار کے لیے علاقے کا انتخاب کرلیا گیا اور قافلہ رواں دواں تھا۔ گاڑیوں کی گھن گرج میں گونجتی ہوئی موسیقی کا اضافہ ہوگیا۔ یوسف کی گاڑی سب سے آگے تھی۔ عرب شکاری اپنی اپنی گاڑیوں میں پیچھے پیچھے چلتے آرہے تھے۔ شکارگاہ میں خیمے نصب کرنے والوں اور باورچیوں کو پہلے ہی بھیجا جا چکا تھا۔ شکار کے اہتمام میں کچھ گھوڑوں اور اونٹوں کا بندوبست بھی شامل تھا۔ مگر یوسف کی نظریں سامنے سے آنے والے اونٹ پر جم کر رہ گئیں۔

اس پر موٹر گاڑیوں کی ٹیوبوں سے بنے ہوئے پانی سے بھرے ، بڑے بڑے مشکیزے لدے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی دکھائی دیتیں۔ اس کی چوٹی سے لے کر گردن، کندھے اور کولہے تک پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے بڑے بڑے گھٹنے ، لمبی لمبی ٹانگوں کے درمیان طاقت کے محور کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ کہیں دور کے کنوئیں سے پانی لے کر چلا تھا اور اپنے وجود کے پانی کا قطرہ قطرہ قربان کرتے ہوئے منزل کی طرف گامزن تھا۔ اس کو اپنے حصے کے پانی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے لٹکے ہوئے ہونٹوں سے گرتی ہوئی جھاگ ریت میں فوراً جذب ہوجاتی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اس نے شکاریوں کی حیرانی میں اور بھی اضافہ کردیا۔ وہ بڑی بے فکری اور لاپروائی سے قافلے کے قریب سے گزر گیا۔ بالکل تھر کے لوگوں کی طرح صابر وشاکر۔ اس کے قدموں

کے نشانوں کے علاوہ ریت پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ نمایاں نظر آرہا تھا۔ سر سے لے کر دم تک ہرنی کا مکمل پنجر۔ اس کے سر میں کالی کالی، پھیلی پھیلی، حیران اور گہرائیوں میں اترتی آنکھوں کے بجائے خالی چشم خانے تھے۔ دو سوراخ، دو سرنگیں یا غاریں کسی ان دیکھی دنیا کی طرف مسلسل بڑھتی ہوئی۔ کبھی ختم نہ ہونے والے راستے کے آغاز کی طرح۔ کبھی شروع نہ ہونے والے اختتام کی طرح۔ یوسف کو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ ہرنی کی آنکھوں کے راستے سے گزر رہا تھا۔ اور اس کی گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ صحرا میں اونٹ، گائے، گدھے، بھیڑ بکریاں اور ہرنوں کے ڈھانچے جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ بارشوں کی وجہ سے ہڈیوں کی سفیدی کہیں کہیں سے سیاہی مائل ہوگئی تھی۔

گاڑیوں کی گھن گرج اور موسیقی میں اچانک کسی آدمی کے چیخنے چلانے کا اضافہ ہو گیا۔ کچے پکے راستے میں ایک آدمی ریت پر بڑا لوٹ رہا تھا۔ یوسف نے گاڑی روک لی تو پورا قافلہ رک گیا۔ تھری لوگ بڑی بڑی گاڑیوں سے چھلانگیں مار مار کر اترے اور اس آدمی کے اردگرد شور مچانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ آدمی اس اونٹ کے ساتھ تھا اور اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ عرب شکاری گاڑیوں کی کھڑکیاں کھول کھول باہر جھانکتے اور حبیبی، حبیبی، یلاّ یلاّ کے علاوہ مقدس زبان میں مغلظات فرماتے رہے۔ یوسف نے شور مچاتے لوگوں کو ادھر ادھر کیا اور اس آدمی کے تڑپتے ہوئے، گوشت پوست سے محروم وجود کو بانہوں میں سمیٹا اور اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ اس آدمی نے اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں کے نیچے اپنے ہونٹوں کو بڑی مشکل سے حرکت دی اور کراہتے، بڑبڑاتے ہوئے کہنے کی کوشش کی "ہمیں بہت دور جانا ہے۔ گاڑی وہاں تک جائے گی؟"

یوسف نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں ضرور جائے گی"۔

اس نے گاڑی کسی دور کی آبادی کے ہسپتال کی طرف گھمادی۔ گاڑی کے برابر پانی سے لدا، پسینے میں شرابور اونٹ بڑی بے نیازی سے اپنی کسی منزل کی طرف گامزن تھا۔ یوسف اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ پس منظر سے اٹھتی ہوئی حبیبی، حبیبی اور یلاّ یلاّ کی کوئی آواز اسے سنائی نہ دی۔

پیلی چھتری والی لڑکی	ناول	اُدے پرکاش
سترہ کہانیاں	افسانے	امرتا پریتم
دہشت گردی کی ثقافت	مضامین	نوم چومسکی
چچا سام کیا چاہتا ہے	مضامین	نوم چومسکی
افسانے کی حمایت میں	ادبی تنقید	شمس الرحمٰن فاروقی
خیال کی مسافت	ادبی تنقید	شمیم حنفی
ہمہ اوست	ناول	آغا سلیم
اندھیری دھرتی، روشن ہاتھ	ناول	آغا سلیم
جلاوطن	افسانے	نور الہدیٰ شاہ
دوآبہ	ناول	افضل احسن رندھاوا
رات کا رپورٹر	ناول	نرمل ورما
وہ دن	ناول	نرمل ورما
طوفان کی آہٹ	ناول	مصطفیٰ کریم
منتخب افسانے	افسانے	مصطفیٰ کریم
عورت: زندگی کا زنداں	مضامین	زاہدہ حنا
حالی کا ذہنی ارتقا	ادبی تنقید	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں
شاہ لطیف کی شاعری	ادبی تنقید	الیاس عشقی
عالم ایجاد	ادبی تنقید	آصف فرخی
منٹو: نہ نوری نہ ناری	ادبی تنقید	ممتاز شیریں

شمس الرحمٰن فاروقی

کئی چاند تھے سر آسماں

بہر زمیں کہ خبر گیری از سواد عدم
فتادہ نامۂ ما سر بہ مہر نقش قدم

میرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی

کئی چاند تھے سر آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے

احمد مشتاق

وزیر خانم

وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم (پیدائش غالباً ۱۸۱۱) محمد یوسف سادہ کار کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ لیکن محمد یوسف سادہ کار دہلوی الاصل نہ تھے، کشمیری تھے۔ یہ لوگ دہلی کب اور کیونکر پہنچے، یہ داستان لمبی ہے۔ اس کی تفصیلات پہلے بھی کچھ بہت واضح نہ تھیں، اور اب تو تمادی ایام کے باعث، اور کچھ دوسری مصلحتوں کے باعث شاید بالکل بھلا دی گئی ہیں۔ وزیر خانم ۱۲۴۵/۱۲۴۶ مطابق ۱۸۲۹/۱۸۳۰ میں نواب شمس الدین احمد خان، والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو سے منسلک تھیں۔ لیکن اس سے پہلے کسی زمانے میں وہ مسٹر ایڈورڈ مارسٹن بلیک صاحب انگریز .Edward Marston Blake, Gent کے ساتھ بھی رہ چکی تھیں۔ اس زمانے میں وہ مارسٹن بلیک کے دو بچوں، یعنی ایک بیٹے مارٹن بلیک (Martin Blake) عرف امیر مرزا، اور ایک لڑکی سوفیہ (Sophia)، عرف مسیح جان، عرف بادشاہ بیگم کی ماں بنیں۔

گمان غالب یہ ہے کہ مارسٹن بلیک (Marston Blake) ان کی زندگی میں پہلا مرد تھا اور اس سے وزیر خانم کی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ تقریب ملاقات کا کچھ حال نہیں ملتا۔ پردہ نشین مسلمان لڑکی جو بظاہر کسبن یا پیشہ ور نچنی نہ تھی، کس طرح اور کیوں ایک انگریز کے تصرف تک پہنچی،

اس کے بارے میں کوئی تحریری روایت یا کسی چشم دید گواہ کے بیان کی بنیاد پر مرتب کی ہوئی روداد موجود نہیں ہے۔ خاندان میں جو روایت ایک زمانے میں متداول تھی وہ حسب ذیل ہے۔

بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا کہ ایک بار عرس مبارک کے ایام میں وزیر خانم اپنے والد کے ساتھ مہرولی شریف قطب صاحب کی درگاہ فلک بارگاہ سے واپس آرہی تھیں۔ شام پھوٹ چلی تھی، سب مسافروں کو مراجعت کی جلدی تھی، کہ حوض شمسی کے کھنڈر ان دنوں بعض پنڈاروں نے چپکے چپکے اپنی آماجگاہ بنا لیے تھے، اور موقع مناسب دیکھ کر وہ رات کے مسافروں کا شکار کھیل لیا کرتے تھے۔ لہٰذا سب ہی اس تگ و دو میں تھے کہ سورج افق مغرب سے نیچے نہ اترنے پائے اور وہ حوض شمسی اور حوض خاص کے مضافات کو پار کر لیں۔ وزیر خانم کی بہلی کا ایک دھرا گھستے گھستے ذرا مخدوش ہو گیا تھا اور خوف تھا کہ بیلوں کو اگر تیز دوڑایا گیا تو دھرا ٹوٹ سکتا ہے۔ ان کی بہلی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، یہاں تک کہ ساتھ کے تمام مسافر، خواہ وہ بہلیوں پر تھے یا تام جھام یا پالکیوں پر، آگے نکل گئے۔ فیل نشین، شہسوار، سانڈنی سوار، اور چرٹ سوار تو پہلے ہی یہ جادہ جا نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

وسط بیساکھ کے دن تھے۔ ریواڑی اور لوہارو کی طرف سے آنے والی گرم ہوا میں جتنی گرمی تھی اس سے زیادہ گرد و غبار تھا۔ لیکن یہی گرد و غبار ہفتے میں چار یا پانچ دن سورج ڈھلنے کے کچھ پہلے الور اور تھمبھور کے جنگلوں کی تھوڑی بہت رطوبت پی کر اور راستے کی گھنی جھاڑی جھنڈیوں سے ملاطفت کرتا جب گوڑ گاؤں پہنچتا تو طوفان ابر و باد کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی دلی پر بہت ساری مٹی اور اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، بلکہ جھکڑ، سارے میں غبار کی ہلکی سی چادر اور خنکی کا محبت اور مروت بھرا ماحول بچھا کر، دہلی اور مضافات کی ارض و غبرا کو خوش کرتے، دو ڈھائی گھڑی کے کھیل کود کے بعد متھرا کی راہوں میں خود کو گم کرنے نکل جاتے اور دلی کے امیر و غریب، وضیع و شریف، جوان و پیر، سب کے کلیجے اور آنگن ٹھنڈے ہو جاتے۔

لیکن ایسے میں ان مسافروں کی جان پر بن آتی جو منزل سے دور ہوتے یا جن کی سواریاں ان سے بے وفائی پر آمادہ ہوتیں۔ اچانک وزیر خانم کی بہلی ریت اور لال مٹی کے بڑے بڑے ذروں سے بھر گئی۔ بیلوں کی بڑی بڑی آنکھیں دہشت اور چبھن کے باعث بند ہو گئیں۔ بہلی کے تین پردے جھراٹا مار کر یوں اڑے گویا لومڑی کے خوف سے بوکھلائے ہوئے تیتر ہوں۔ گاڑھی ہوتی ہوئی روشنی میں ماشی اور قرمزی رنگ کے پردے کچھ دور تک تو ہوا میں معلق دکھائی دیے، پھر خدا جانے کہیں دور اڑ گئے یا گھنے درختوں کی شاخوں نے ان کو اچک لیا۔ پردوں کے یوں اڑ

جانے، بیلوں کے بھڑکنے اور سواریوں کے جگہ سے بے جگہ ہونے کے باعث گاڑی کا توازن جو بگڑا تو بہلی چار کے بجائے دو پہیوں پر معلق ہوگئی اور پھر ہوا کے دوسرے تھپیڑے نے اسے سیدھا کیا تو چاروں پہیے ایک دھماکے کے ساتھ زمین سے ٹکرائے اور اسی کے ساتھ ساتھ دھرے کے ٹوٹ جانے کی کریہہ آواز سنائی دی۔ فوری طور پر تو سمجھ میں نہ آیا کہ بہلی میں کوئی چیز ٹوٹی ہے یا آس پاس کے درختوں کی کوئی موٹی شاخ ہوا کے دباؤ سے مجبور ہو کر زمیں بوس ہوگئی ہے۔ لیکن بہلی کا ایک پہیہ بھی چشم زدن میں الگ ہوگیا اور بہلی دوبارہ الٹتے الٹتے بچی تو بچارے مسافروں کو معلوم ہوا کہ ان پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔

وزیر خانم کے باپ نے تو تقدیر ٹھونک لی تھی کہ آج کی رات اس کے اور اس کی بیوی بیٹی کے لیے آخری رات ہوگی۔ اب کوئی اکا دکا بچھڑا ہوا مسافر تو کیا، کوئی قافلہ بھی گذرنے والا نہ تھا، نہ کہیں سے کوئی دستگیر پیدا ہوسکتا تھا کہ سب اپنی اپنی پناہ گاہوں میں بند تھے۔ شکستہ بہلی کے سواروں کی رات اسی بیابان میں گذرنی تھی اور صبح کا منھ دیکھنا انھیں شاید ہی نصیب ہونا تھا۔ بیوی اور لڑکی کو تو لونڈی یا قحبہ بننا تھا اور باپ کی قبر وہیں بنی تھی۔ گاڑی بان شاید بچ نکلتا تو بچ نکلتا۔

لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ دہلی کی طرف سے ایک نیم روشن ابر نما بڑا دھبہ سڑک پر متحرک نظر آیا۔ پھر سانڈنی کے پاؤں کی جھنا جھن سنائی دی، پھر ایک گھڑ سوار، جس کے پس اور جلو میں دو برچھیت ہواؤں اور غبار کے آگے منھ کو ڈھانکے ہوئے، لیکن پا مرد اور ثابت قدم، ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پاؤں رکھتے ہوئے، گھوڑ سوار کے دونوں طرف دو احدی، ایک کے ہاتھ میں مشعلہ، ایک کے ہاتھ میں بادبان۔ [مشعل کی لکڑی سے ذرا چھوٹی لکڑی کے ایک سرے پر پیتل کا گہرا پیالہ نصب کر دیتے تھے، پھر مشعل میں جلانے کا سامان، مثلاً سرسوں کے تیل کی گاڑھی تلچھٹ یا روغن نفت میں تر کیا ہوا موٹا چیتھڑا، اس میں یوں رکھتے تھے کہ پیالے کی کور اس کے لیے اوٹ کا کام کرتی تھی۔ لہٰذا اس کا شعلہ ہوا سے بجھتا نہ تھا۔ ایسی مشعل کو مشعلہ کہتے تھے۔ دستی اس سے بھی چھوٹی مشعل ہوتی تھی۔ ایسا فانوس، جو چاروں طرف سے بند ہو لیکن جس میں ہوا کے لیے ننھے ننھے سوراخ ہوں، اور جسے ہاتھ میں لیا جا سکے، بادبان کہلاتا تھا۔ انگریزی لفظ Lantern سے بنایا ہوا لفظ لالٹین، اور روشنی کے آلے کے طور پر خود لالٹین بھی رائج ہو رہے تھے، لیکن احدی اور مشعل بردار اسے کم استعمال کرتے تھے، مرتب۔] گھوڑا بھی خوب سدھا ہوا تھا کہ ہوا کے تھپیڑے اور درختوں کی سائیں سائیں اس کی دلجمعی میں قطعاً ہارج نہ تھی۔

سانڈنی سوار نے دھندلاتی فضا میں اپنی فراست کو کام لاتے ہوئے تھوڑی دور پر ہی سے سمجھ لیا تھا کہ مصیبت زدہ مسافر ہیں۔ ٹھگ بھی ہو سکتے تھے، لیکن یہ موسم ٹھگی کا نہ تھا، اور نہ وہ علاقہ ٹھگوں کا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ٹھگوں کے جرگے میں عورتیں نہ ہو سکتی تھیں۔ سانڈنی سوار اور برچھیت نفر تو آگے بڑھتے آئے لیکن گھڑ سوار اپنے روشنی بردار احدیوں کے ساتھ ذرا فاصلے پر رک گیا۔ ابھی کچھ واضح نہ تھا کہ شہسوار کی ذات برادری کیا ہے؟ بادشاہ ظل الٰہی کے اہل کاران بھی ان اطراف میں شاموں کو گشت لگاتے دکھائی دے جایا کرتے تھے اور کمپنی بہادر کے بھی سپاہی کسی کسی دن نکل پڑتے تھے۔ ادھر گاڑی بان نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ ڈاکو لٹیرے نہیں ہیں، ان سے امداد کی درخواست ممکن ہے۔

گاڑی بان آگے بڑھا تو سانڈنی سوار نے اپنی سواری کو ڈپٹا کر اس کا راستہ روک دیا اور پوچھا:

''کون ہو تم لوگ؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ جانتے نہیں ہو غروب آفتاب کے بعد کسی قافلے یا سپاہیوں کی نفری کے بغیر یوں پھرنا ممنوع ہے؟''

''جانتے ہیں مائی باپ۔ ہم لوگ قطب صاحب بختیار بابا کے دربار سے آ رہے ہیں۔ اچانک آندھی نے آلیا۔ پھر پہیہ ٹوٹ گیا۔ اب یہاں کھڑے اپنی جان کو رو رہے تھے۔ پردے کی بیبیاں ساتھ ہیں، اللہ ہی جانتا ہے کیا ہو جاتا اگر آپ اور اوغلان صاحب...''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تمھارے مالک کہاں ہیں؟ کمپنی صاحب کے سامنے حاضر ہوں۔''

''حاضر ہیں سرکار، بس زنانہ ایک تل اوٹ ہو جائے، بے پردگی ہوتی ہے۔'' اس فروتنی کے عالم میں بھی گاڑی بان کا اشارہ تھا کہ فرنگی مرد ذرا دور ہی رہے تو بہتر ہے۔

وزیر خانم کا باپ خود کو ٹوٹی ہوئی بہلی سے الگ کر کے آگے آ رہا تھا کہ گھڑ سوار نے اپنی سواری کو حرکت دی، اور ایک لمحے میں وہ اور بہلی کی سواریاں آمنے سامنے تھیں۔ اتنی دیر میں ایک برچھیت نے انگریزی وضع کی ایک لالٹین بھی روشن کر لی تھی۔ لیکن اسی اثنا میں ہوا بھی تیز تر ہو گئی تھی۔ لالٹین کا شعلہ دھوانسا ہوا جا رہا تھا۔ اچانک ایک زور کا جھونکا آیا اور وزیر خانم کے بدن کی چادر اڑتی چلی گئی، اور دفعۃً اس کا چہرہ کھل گیا۔ بڑی بڑی جامنی آنکھوں کے نیچے اس کا منھ خوف، گھبراہٹ اور شرم کے باعث کالے ہرن کی پیشانی جیسا تمتما اٹھا تھا اور لالٹین کی کپکپاتی ہوئی لو نے اس کے آپے کو ذرا اور روشن کر دیا تھا۔ انگریز اسے تکتا رہ گیا اور ادھر ایک دلکش غیر مرد کو اپنے میں اس قدر مستغرق دیکھ کر جوانی کی بڑھتی ہوئی موجوں نے کچھ شوخ ہونے کی ٹھانی۔ دونوں کی آنکھیں ایک نگاہ بھر تک ملیں،

پھر گاڑی بان نے جلدی سے ایک چادر کھینچ کر اس کے بدن پر ڈال دی۔

یہ انگریز مارسٹن بلیک تھا جو اپنی معشوقہ کے ساتھ رات گذارنے عرب سرائے جا رہا تھا۔ تھوڑی سی گفتگو اور کچھ تامل کے بعد یہ طے ہوا کہ مارسٹن بلیک صاحب بنفس نفیس ان مسافروں کو حوض شمسی کے آگے منیر کے باغ تک پہنچا دیں گے۔ وہاں سے کسی معتبر سواری کا انتظام ممکن تھا۔ منیر کے باغ تک کا سفر مستورات تو کسی نہ طرح ٹھنس ٹھنسا کر سانڈنی پر کرلیں گی۔ باقی لوگوں کو گھوڑے کی دلکی چال کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔ مسافروں کا سامان بہت نہ تھا، کچھ کو تو سانڈنی ہی پر ڈال لیا گیا۔ جو تھوڑا بہت بچا اسے بھی کسی صورت برچھیتوں اور گاڑی بان نے اٹھالیا۔

اس واقعے کے بعد مارسٹن بلیک کسی نہ کسی تقریب سے ہر دو تین دن پر وزیر خانم کے گھر پہنچ کر سیر و تفریح کی باتیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ اسے چاندنی چوک اور نہر کی سیر کے لیے لوا لے جاتا۔ باپ ان کے ساتھ ہوتا، لیکن طوعاً و کرہاً، اور بیٹی کو پوری چادر لپیٹ کر باہر جانے پر ہمیشہ اصرار کرتا۔ پھر بھی، اس اثنا میں وزیر خانم سے اس کے چپکے چپکے کیا مراسم بنے یا کیا عہد و پیمان ہوئے، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ خیر، چند مہینے بعد مارسٹن بلیک نے آکر خبر دی کہ میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی اسامی پر متعین ہو کر ریاست جے پور جا رہا ہوں۔ اس وقت تو کچھ خاص بات چیت نہ ہوئی، صرف رسمی افسوس اور راہ و رسم قائم رکھنے کے وعدوں کے بعد مارسٹن بلیک ان سے رخصت ہوا۔ لیکن وہ پھر ایک سوا مہینے بعد دہلی واپس آیا تو محمد یوسف کے یہاں بھی گیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے مناسب مکان لے لیا ہے اور گرہستی کے سب ساز و سامان مہیا کر لیے ہیں۔ تنخواہ بھی معقول ہے، نوکر چاکر قدم قدم پر موجود ہیں، ہل کر پانی بھی نہیں پینا پڑتا۔ جے پور میں میری بڑی آؤ بھگت ہے۔ بس صاحب پولیٹیکل ایجنٹ صاحب میرے حاکم بالا ہیں، ورنہ اور مجھ سے نکلتا ہوا وہاں کوئی نہیں۔

مارسٹن بلیک کی باتیں سن کر سب لوگ کچھ دیر کے لیے خاموش سے ہو گئے۔ پھر مارسٹن بلیک ہی نے پہل کی، لیکن کچھ کہنے کے بجائے اس نے چھوٹی بیگم کو ذرا معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ کچھ ادھر کا بھی اشارہ دیکھ کر بلیک اور محمد یوسف خاموشی سے ایک طرف کو ہو لیے، سرگوشیوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔

اس کے کوئی ہفتہ بھر بعد مارسٹن بلیک کے قافلے میں، جو عازم جے پور تھا، آرائش اور گوٹے ٹھپے سے جگمگاتا ہوا اور تازہ پھولوں کے گجروں سے کمکتا ہوا اور تازہ ہری ترہات سے ہریالا بنا

ہوا ایک رتھ بھی تھا۔ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم زرق برق حلۂ عروسی میں محمل اس میں سوار تھیں۔

مارسٹن بلیک اور وزیر خانم کا ساتھ کوئی تین سال رہا۔ پھر مارسٹن بلیک کے اچانک مرنے پر در بدر ہو کر چھوٹی بیگم دہلی واپس پہنچیں۔ دہلی میں ان کی رسم و راہ ''والی میوات'' [کہا جاتا ہے کہ ایک بار احمد بخش خان اپنے مرشد فخر جہاں حضرت مولانا فخر الدین دہلوی کو وضو کرا رہے تھے۔ اس وقت احمد بخش خاں کی کچھ حیثیت نہ تھی، وہ مہاراجہ الور کی فوج میں بصیغۂ اسوار ملازم تھے۔ وضو کے دوران اچانک ان کے پیر نے انھیں ''والی میوات'' کہہ کر پکارا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بالآخر احمد بخش خان کو سارے علاقۂ میوات کی فرماں روائی ملی،] نواب احمد بخش خان کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خان سے ہوئی۔ نواب مرزا (جو بعد میں نواب مرزا خاں، پھر فصیح الملک، جہاں استاد، اور بہت سے خطابات سے ملقب ہوئے) ۱۸۳۱ میں چھوٹی بیگم کے یہاں نواب احمد بخش خان کے صلب سے پیدا ہوئے۔ شمس الدین احمد خان کی غیر متوقع موت (۱۸۳۵) کے بعد وزیر خانم نے کئی سال گمنامی میں گذارے۔ ۱۸۴۰ کے آس پاس انھوں نے آغا مرزا تراب علی نامی ایک ایرانی رئیس سے تعلق پیدا کیا۔ آغا مرزا شاغل نامی بیٹا [ولادت ۱۸۴۱] اسی تعلق کی یادگار پیدا ہوا۔ پھر آغا مرزا تراب علی بھی اچانک اور اتفاقیہ پیوند خاک ہو گئے۔

تنہائی کے کئی اور نشیب و فراز جھیلنے کے بعد وزیر خانم کو غلام فخر الدین میرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو ولی عہد سلطنت کے دلربا سایۂ عاطفت میں ٹھنڈی چھاؤں مل گئی۔ وہ محل میں داخل ہوئیں اور دربار شاہی میں خطاب سے مخلع ہوئیں۔ یہ واقعہ ۱۲۶۰ [۱۸۴۴] کا ہے۔ وزیر خانم اب تینتیس سال کی ہو چکی تھیں لیکن حسن کی بہار اور دلستانی کی ساری ان کی ادائیں اب بھی پہلے ہی جیسی تھیں۔ خود میرزا فتح الملک بہادر ولی عہد سلطنت بھی تینتیس سال کے تھے اور نشیب و فراز کو چہائے دلبستگی و دل باختگی سے خوب واقف تھے۔ زمانے کا بلند و پست بھی انھوں نے خوب دیکھا تھا، خاص کر جب میرزا شبو مرحوم کے اللہ کو پیارے ہونے پر میرزا فتح الملک بہادر کی ولی عہدی کے معاملے میں کیسے کیسے کیڑے نہ پڑے تھے۔ طبائع اور کوائف حیات میں بہت کچھ ہم آہنگی کہیئے، یا قبول خاطر و لطف سخن کی طرح معاملۂ دل کو بھی خدا سازی پر محمول کیجئے، مرزا فخرو اور وزیر بیگم میں روز اول سے وہ خلا ملا ہوا جو لال قلعے نے شاہ جہاں کے زمانے کے بعد سے نہ دیکھا گیا تھا۔

وزیر خانم کے بیٹے نواب مرزا اب خطاب خانی سے ملقب ہوئے، نواب مرزا خان کہلائے اور سلاطین زادوں، بلکہ شاہ زادوں طرح رہنے لگے۔ [خاندان شاہی کے وہ افراد جو بادشاہ وقت،

یا اس کی صلبی اولادوں کی اولاد ہوتے، شاہزادے کہلاتے تھے۔ دوسروں کو سلاطین زادہ کہا جاتا تھا، مرتب۔]ان کی رسمی اور علمی و ادبی تربیت ساری کی ساری قلعۂ معلی میں ہوئی۔ وہاں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو خوب چار چاند لگے۔ طبیعت نہایت دراک و بیباک پائی تھی۔ حکیم احسن اللہ، حکیم محمود خاں، نواب حسام الدین حیدر خان بہادر کے بڑے بیٹے مظفر الدولہ ناصر الملک سیف الدین حیدر خان بہادر، میرزا غالب، استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق، نازک مزاجوں کے نازک مزاج اشعر الشعرا حکیم مومن خان مومن، استاد الشعرا شاہ نصیر، فاضل اجل اور شاعر غرا مولوی امام بخش صہبائی، رئیس باتمیز نواب حسین مرزا ناظر بادشاہ دہلی [ہاتھی پر بادشاہ کے سامنے خواصی میں بیٹھنے والے کو ناظر کہتے تھے۔مرتب]، ان لوگوں کی آنکھیں انھوں نے شروع سے دیکھیں۔ اس پر سونے پر سہاگا خود اپنی جودت طبع اور ماں کی خوش مذاق اور ذی علم تربیت۔ اور اس پر بھی بس نہ کر کے نقاش صورت نے انھیں باوجود سیاہی رنگ کے ایسے اچھے ہاتھ پاؤں اور ایسا دلکش نقشہ مہرہ دیا تھا کہ جو دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا۔ طبیعت میں انکسار، دل میں سیر چشمی، اور بزرگوں کے حفظ مراتب کا پورا لحاظ الگ تھا۔

نیاز فتح پوری کا یہ بیان غلط ہے کہ قلعۂ معلی میں داغ کی صحبتوں میں لچے لفنگے کم علم اور کم ذوق لوگ تھے'' قلعہ جن سے اس وقت بھرا ہوا تھا''۔ لہٰذا نیاز کے قول کے مطابق نواب مرزا'' وقت سے پہلے جوان ہو گئے۔''حقیقت یہ ہے کہ بارہ ہی چودہ برس کے داغ کا شمار دہلی کے نوجوان استادوں میں ہونے لگا تھا۔ پرانے لوگ، اس کے بجائے کہ ان کی ترقی وشہرت اور آؤ بھگت پر رشک کرتے، ان کی ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے۔اس ادبی تہذیب میں نئے ستاروں کے طلوع پر پرانے ستاروں کو اپنی روشنی دھندلی ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تھا۔ اور نہ ہی نو آمدہ شاعر کو یہ خوف ہوتا تھا کہ اسے برادری باہر رکھا جائے گا، یا پھر کسی استاد کا خوشہ چیں ثابت کر دیا جائے گا۔ اس کے علی الرغم، اس تہذیب میں نئے شاعر کے پیدا ہونے کا یوں خیر مقدم کرتے تھے جیسے مائیں اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کی پیدائش پر خوشیاں مناتی ہیں۔

داغ نے شرفا اور امرا کے بچوں کے اعلیٰ معیار کی تمام تعلیم قلعے ہی میں حاصل کی۔ اس میں فنون حرب وضرب اور فنون لطیفہ دونوں شامل تھے۔ حضرت ظل سبحانی نے داغ کو قدر اندازی کی تعلیم خود دی تھی اور مشہور تھا کہ اس وقت ساری دلی میں حضرت ابوظفر سراج الدین احمد شاہ دہلی خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہٗ اور میرزا شاہرخ بخت سے بڑھ کر نہ کوئی شہسوار تھا نہ تیر انداز۔ نواب میرزا نے

ان دونوں کی صحبتیں اٹھائیں۔ شہسواری بھی انھوں نے عالم پناہی ظلِ الٰہی سے سیکھی۔ فتح الملک بہادر مرزا فخرو کے یہاں بھی وزیر بیگم سے ایک بیٹا میرزا خورشید عالم ۱۸۴۵ میں متولد ہوا تھا۔

۱۸۵۶ میں مرزا فخرو نے ہیضے میں جان دی اور حلۂ شہادت سے محلل و مشرف ہوئے۔ چھوٹی بیگم اور نواب مرزا ایک بار پھر بے خانماں ہو گئے۔

سوفیہ

مارسٹن بلیک کی موت ریاست جے پور میں بزمانۂ ملازمت ایک مقامی بلوے میں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اوائل ۱۸۳۰ کا ہے۔ انگریزوں نے غالباً از راہ نا منصفی یا از روے قانون انگریزی، چھوٹی بیگم اور مارسٹن بلیک کے رشتۂ زنا شوئی کو تسلیم نہ کیا تھا۔ لہٰذا بلیک کے املاک غیر منقولہ اور نقد وجنس سے چھوٹی بیگم کو کچھ بھی نہ ملا۔ نہ انھیں کچھ گذارے کی رقم یا پنشن ملی۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، چھوٹی بیگم کے بطن سے مارسٹن بلیک کے دو اولادیں ہوئیں تھیں، ایک بیٹا مارٹن بلیک عرف امیر مرزا، اور بیٹی سوفیہ عرف مسیح جان عرف بادشاہ بیگم۔ سوفیہ اپنے وقت کے حسینوں میں تھیں۔ ان کی پہلی شادی مشہور اینگلو انڈین فوجی افسر جارج اسکنر (George Skinner) سے ہوئی تھی جس کے باپ کے فوجی رسالے Skinner's Horse کی بڑی شہرت تھی۔ بیگم اسکنر، یعنی سوفیہ عرف بادشاہ بیگم عرف مسیح جان کو اردو کے ادبی حلقوں میں مس بلیک خفی کے نام سے جانا گیا۔ وہ اپنے زمانے کے خوش فکر شعرا میں شمار ہوتی تھیں۔ یہ دونوں بھی اپنے باپ کے ترکے سے محروم رہے۔ لیکن اس کی ایک رشتے کے چچا چچی اور خود چھوٹی بیگم نے ان کی کفالت کی۔

سوفیہ مارسٹن بلیک اور جارج اسکنر (George Skinner) کے ایک بیٹا بہادر میرزا نام کا، اور ایک بیٹی احمدی بیگم نامی ہوئیں۔ احمدی بیگم کا عیسائی نام شارلٹ (Charlotte) تھا لیکن وہ کہلائیں احمدی بیگم۔ ۱۹۴۶ میں ان کی اولادیں جے پور میں خوش حال زندگی بسر کر رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس شادی سے ایک اور بیٹا محمد امیر یا امیر مرزا، یا امیر اللہ، بھی پیدا ہوا تھا۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، امیر مرزا تو مارسٹن بلیک (Marston Blake) کے بیٹے مارٹن بلیک (Martin Blake) کی عرفیت تھی۔

یہ ضرور ہے کہ سوفیہ عرف بادشاہ بیگم کے دوسرے شوہر کا نام محمد امیر، یا امیر اللہ تھا۔ ان کے ایک بیٹا تھا، لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، بجز اس کے کہ اس بیٹے کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام حسیب اللہ قریشی تھا۔ حسیب اللہ کی پیدائش شاید ۱۸۹۰ کے آس پاس ہوئی۔ (ممکن ہے کہ امیر اللہ پہلے شوہر رہے ہوں، اور ان کے انتقال کے بعد سوفیہ بیگم نے جارج اسکنر سے نکاح کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امیر اللہ دوسرے شوہر رہے ہوں، یا انھوں نے سوفیہ بلیک سے نکاح نہ کیا ہو، انھیں صرف داخل حرم کر لیا ہو۔) حسیب اللہ قریشی نے اپنے باپ کا اصل نام ونسب کیوں چھپایا اور خود کو قریشی کیوں قرار دیا، یہ بات کبھی نہ کھلی۔ ممکن ہے کہ امیر اللہ نسباً قریشی رہے ہوں، لیکن حسیب اللہ کے عمل اخفا سے یہ گمان پیدا ہونا فطری ہے کہ امیر اللہ اور سوفیہ عرف بادشاہ بیگم رشتۂ نکاح میں منعقد نہ ہوئے تھے۔ بہر حال، یہی حسیب اللہ قریشی بعد میں سلیم جعفر کے نام سے اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور عروضی مشہور ہوئے۔ ان کا انتقال مشرقی پاکستان میں ہوا۔ غیر منقسم ہندوستان میں وہ اچھی سرکاری ملازمت پر متمکن تھے۔ پاکستان نے ان کا کیا مشغلہ ٹھہراتھا، اس کی خبر نہیں۔

سلیم جعفر نے نظیر اکبر آبادی کا ایک مبسوط انتخاب ''گلزار نظیر'' کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد کے لیے کیا تھا [مطبوعہ 1951]۔ یہ اب بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا پر بھی لکھا ہے۔ فارسی کے علاوہ ہندی بھی وہ خوب جانتے تھے اور انگریزی تو گویا اردو کے ساتھ ساتھ ان کی پہلی زبان تھی۔

سلیم جعفر کی واحد اولاد ان کے بیٹے شمیم جعفر تھے، باپ کی طرح وہ بھی اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، لیکن انھوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ باپ کے برعکس انھیں نواب مرزا داغ سے اپنی قرابت داری، وہ دور کی سہی، بڑی قابل ذکر بات معلوم ہوتی تھی۔ شمیم جعفر نے داغ کی والدہ یعنی اپنی پردادی وزیر خانم کے بہت سے حالات کتابوں، بزرگوں کی یادداشتوں اور بڑے بوڑھوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کئے تھے۔ وہ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں کسی چائے کے باغ میں منیجر تھے۔ ان کی موت ۱۹۵۹ میں دریائے کرنافلی میں اسٹیمر کی غرقابی کے باعث ہوئی۔ اس وقت شمیم جعفر کے بیٹے وسیم جعفر کی عمر کوئی دس بارہ سال کی تھی۔ وسیم کی ایک بہن بھی تھی جو بھائی سے کوئی دو سال بڑی تھی، لیکن وہ ذہنی طور پر کمزور اور جسمانی طور پر بڑی حد تک معذور تھی۔ شمیم جعفر کی موت کے بعد ان کی بیوہ جو اینگلو انڈین تھیں کسی صورت سے اپنے ایک ننہالی عزیز کے توسط سے انگلستان آگئیں۔

ماں کی توقع اور امید کے خلاف وسیم جعفر نے خود کو اپنے دادا کی تہذیبی اور ادبی روایات اور ان کے علوم و آداب کو شعوری طور پر، اور بیش از بیش اختیار کیا۔ وسیم جعفر نے لندن یونیورسٹی کے مشہور ادارے School of Oriental and African Studies میں کئی سال تک تعلیم حاصل کر کے اردو اور فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچائی۔ بولنے کی حد تک تو وہ بہت صفائی اور روانی سے نہایت با محاورہ اردو بولتے ہی تھے۔ باپ سے ان کی ساری گفتگو اردو میں ہوتی تھی۔ ماں کے ساتھ بھی اور انگریزی اردو ملا کر ہی بولتے تھے۔ اب کالج میں جم کر تعلیم لینے کے باعث وہ بہت اچھی ادبی اردو لکھنے اور سمجھنے بھی لگے تھے۔ وزیر خانم اور ان کے خاندانی حالات کے بارے میں انھوں نے اپنے دادا سے کچھ کہانیوں کے روپ میں تو کچھ باپ دادا کی گفتگوؤں کے ذریعہ بہت کچھ سنا تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ انھیں مصوری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے لندن کے مشہور زمانہ Slade School of Art میں کئی برس شام کے درجات میں تعلیم حاصل کی۔ پھر انھیں محسوس ہوا کہ ان کا اصل میدان مغل طرز کی مصوری ہے۔ یہاں بھی انھوں نے بہت تگ و دو کے بعد اچھی دستگاہ حاصل کر لی اور بالآخر وکٹوریا اینڈ البرٹ (Victoria and Albert) میوزیم میں وہ انیسویں صدی کی ہندوستانی (اور کمپنی) مصوری کے شعبوں میں نائب نگراں (Assitant Keeper) مقرر ہو گئے۔ فرصت کے زیادہ تر اوقات وہ انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے کاغذات کو الٹنے پلٹنے میں گذارتے۔ (اب وہ برٹش لائبریری کا حصہ بنا دی گئی ہے لیکن پرانے لوگ اسے اب بھی ''انڈیا آفس لائبریری'' کے نام سے پکارتے ہیں۔)

وسیم جعفر کئی سال سے شمالی ہندوستان میں اٹھارویں انیسویں صدی کے بعض ایسے خاندانوں اور گھرانوں کے حالات ڈھونڈنے میں مصروف تھے جو اپنے زمانے میں تو بہت نمایاں تھے لیکن اب وقت نے انھیں اوراق کے مزبلے میں داب دیا تھا اور ان کے نام اب اگر کسی کو معلوم تھے تو وہ محض چند اختصاصی مورخین ہی تھے۔ ان میں سے بعض تو انگریزوں کی سرپرستی میں خوب پھلے پھولے اور آئندہ یا تو اپنے ہی نااہل اخلاف کی بنا پر تباہ یا گمنام ہوئے، اور بعض ایسے تھے جو ۱۸۵۷ کے پہلے یا بعد حاکمان فرنگ کی تیغ جور اور عدل ستم نما کی ترازو پر تلے اور کم وزن پائے گئے۔ انھیں امید تھی کہ ان کی داستان وہ کبھی قلم بند بھی کر سکیں گے۔

آج ایسے گھرانوں کے نام صرف اختصاصی مورخین ہی کو معلوم سہی، لیکن اپنے وقت میں یہ خانوادے علم اور فن، خاص کر شاعری، مصوری، اور موسیقی کا گہوارہ تھے۔ ان کے کاغذات اور کتابیں

اگر دیکھی جاتیں تو ہند اسلامی تہذیب کے نہ جانے کتنے گوہر بے بہا ان میں خفتہ اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے نظر آتے۔ وسیم جعفر کے سامنے چند نام تھے جن پر وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے یا ڈھونڈتے رہتے تھے: بریلی کے راجا رتن سنگھ زخمی، کڑا مانک پور کے رائے بالمکند شہود، بنارس کے صاحب رام خاموش، باندہ کے علی بہادر خان، فرخ آباد کے تجمل حسین خان، فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے شمس الدین احمد خان اور وزیر خانم، خاص گنج (کاس گنج) کے کرنیل گارڈنر، ان کی بیگم، جو نواب کھمبائت کی بیٹی تھیں، اور ان کی بہو، جو شاہ عالم ثانی کی بیٹی تھیں اور شاہ اودھ کی مہربانیوں اور اپنے پہلے شوہر کی زیادتیوں سے متنفر ہو کر کرنیل کے بیٹے کے ساتھ چلی آئی تھیں، دہلی کے حسام الدین حیدر اور ان کی اولاد، دیوان فضل اللہ خان۔ وسیم جعفر خود سے پوچھتے تھے کہ کیا سیاسی وجوہ سے قطع نظر بھی نئے ہندوستان کے عروج میں ان لوگوں کا زوال لازمی تھا اور اب ہم لوگ ان سے جتنی دوری پر ہیں وہاں سے یہ لوگ کیسے نظر آتے ہیں؟ آج ان کی شبیہوں پر ماضی کی سیاہ دھند ہے، یا گلابی دھند ہے؟ یہ لوگ اپنے بارے میں کیا سوچتے تھے؟ وہ خود کو کیا سمجھتے تھے اور اپنے عہد کو کس روشنی میں دیکھتے تھے؟ کیا انھیں کچھ اندیشہ یا تصور تھا کہ ان کی تہذیب کی ردا اس طرح پارہ پارہ ہونے والی ہے کہ ان کا نظام اقدار جلتے ہوئے ملک کا گاڑھا دھواں بن کر سمندر میں تحلیل ہو جائے گا اور اس سے جو انقطاع پیدا ہوگا اس کی خلیج میں حافظے اور یادیں گم ہو جائیں گی؟

وسیم جعفر کو یقین نہ تھا کہ انھیں اپنے سوالوں کے جواب مل سکیں گے لیکن وہ اس بات کے بھی قائل نہ تھے کہ ماضی ایک اجنبی ملک ہے اور باہر سے آنے والے اس کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کہتے تھے کہ پرانے لفظوں کو نئے لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے، بس ہم آغوشی چاہیئے۔

وسیم جعفر

جیسا کہ بیان ہوا، وسیم جعفر کا گھر لندن میں تھا۔ میری ان سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی، بلکہ پہلے سے کوئی ملاقات بھی نہ تھی۔ اور نہ میں لندن میں رہتا ہوں۔ میں نے گذشتہ سال مولانا حامد حسن قادری کے مکتوبات (مرتبہ خالد حسن قادری) میں وسیم جعفر کے دادا سلیم جعفر کے خاندانی حالات کے بارے میں بڑی دلچسپی سے پڑھا ضرور تھا اور قادری صاحب کے یہاں سلیم جعفر کا ذکر پڑھنے سے پہلے میں نے ان کی کئی تحریریں بھی دیکھی تھیں۔ میں انھیں دہلی یا لکھنو یا حیدرآباد کا کوئی

باذوق مصنف خیال کرتا تھا، لیکن سلیم جعفر، یا ان کے اخلاف اب کہاں ہیں اور کہیں ہیں بھی یا نہیں، اس معاملے میں مجھے کوئی معلومات نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ سلیم جعفر بزرگ آدمی تھے، کہیں مرکھپ گئے ہوں گے۔ عام حالات میں تو یہ ہوتا کہ نواب مرزا خان داغ، اور ان کے حوالے سے ان کی والدہ وزیر بیگم، اور سلیم جعفر کے باہمی تعلق اور وزیر بیگم کی غیر معمولی زندگی کی بنا پر مجھے ان کے بارے میں کرید ہوتی اور میں سلیم جعفر کے اعقاب کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا۔ لیکن ان دنوں مجھے کچھ اور ہی دھن تھی۔

گذشتہ سال ایک شادی کے سلسلے میں مجھے لندن جانے کا موقع ملا۔ اپنے بارے میں کچھ زیادہ کہنے میں مجھے تکلف ہے، اور جو داستان اگلے صفحات پر مرتسم ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ لہٰذا اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میں پیشے کے لحاظ سے ماہر امراض چشم ہوں۔ شعر و شاعری کا کچھ شوق میں بھی رکھتا ہوں، لیکن اگر میں زمانۂ قدیم میں ہوتا تو مجھے نساب کہا جاتا، اس معنی میں کہ مجھے خاندانوں کے حالات معلوم کرنے، ان کے شجرے بنانے اور دور دور کے گھرانوں کی کڑیوں سے کڑیاں ملانے کا بے حد شوق ہے اور اب اگر چہ میری عمر بہت زیادہ نہیں ہے، میں نے طب کا مشغلہ ترک کردیا ہے، میرا زیادہ تر وقت شجرے بنانے اور بنائے ہوئے شجروں کو مزید وسیع اور پیچیدہ بنانے میں گذرتا ہے۔

میں نے اوپر اپنی ایک دھن کا ذکر کیا ہے۔ اسے دو دھنیں کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ جن دنوں مولانا حامد حسن قادری صاحب کے مکتوبات میری نظر سے گذرے تھے اسی زمانے میں مجھے گورکھ پور میں مقیم ایک پارسی خاندان بومن جی خدائی جی کا شجرہ دریافت اور تحریر کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے جد امجد جمشید آرین پور کو جہانگیر کے زمانے میں انگریز سیاح جان کوری ایٹ (John Coryat) اپنی رہبری کے لیے علاقۂ سورت سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ کوری ایٹ نے یورپ اور ایشیا میں ہزاروں کوس پیدل سفر کیا تھا اور بالآخر جہانگیر کے دربار کے ساتھ آگرہ سے اجمیر ہوتا ہوا براہ سندھ ترکستان و چین کی طرف نکل گیا تھا۔ کوری ایٹ کو تو دربار جہانگیری سے کچھ نہ ملا، لیکن جمشید آرین پور کی کسی بات پر خوش ہو کر اسے وسادۂ خاقانی سے اودھ کے علاقۂ گورکھپور میں شراب اور جنگلاتی پیداوار، خصوصاً شہد اور بنسلوچن کی تجارت کرنے کا اجازت نامہ عطا کردیا گیا تھا۔ مشہور تھا کہ زمانۂ حال کے تمباکو و شراب فروش بومن جی خدائی جی کا خاندان اسی جمشید آرین پور کے اخلاف میں تھا۔

ایک دوسری چیز جس کی مجھے اس وقت کرید تھی، اس کا تعلق خود میرے لوگوں سے تھا۔

یہ بات اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے صوفیا اور اہل اللہ میں سیدوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، لیکن کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ آل عبد المطلب کے بعد صوفیائے ہند کی سب سے زیادہ تعداد آل خطاب سے ہے۔ اور یہ بات بھی صرف مورخوں کو معلوم ہے کہ سید، ترک، اور پٹھان حکمراں تو یہاں کثرت سے ہوئے ہیں، لیکن فاروقیوں کے صرف ایک خاندان نے ہندوستان کے کسی خطے میں فرماں روائی کی ہے۔ برہان پور کی فاروقی مملکت کی بنیاد ملک راجا فاروقی نے ۱۳۹۷ میں رکھی تھی اور اس کی اولاد نے دو صدیوں سے کچھ اوپر برہان پور اور خاندیس پر حکومت کی۔ بالآخر جلال الدین محمد اکبر کی ہوائے شمس اقبال اور جیش و اجلال نے ۱۶۰۱ میں اس گھرانے کا چراغ گل کر دیا۔

انتزاع سلطنت کے بعد برہان پور کے فاروقیوں کا ذکر تاریخ سے کچھ یوں فراموش ہو گیا گویا میدان جنگ کی گرد کے چھٹنے کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی آسمانی گہرائیوں میں تحلیل ہو گیا ہو۔ برہان پور کے فاروقیوں کی بات مجھے بالکل اتفاقی طور پر معلوم ہوئی اور تب سے مجھے یہ دھن (خیال خام کہیے) لگ گئی کہ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ زوال حکومت کے بعد برہانپور کے فاروقیوں پر کیا گذری۔ ہر چند کہ ہم اعظم گڈھ کے فاروقیوں کا خاندان تو عام عقیدے کے مطابق ملک راجا کے بھی پہلے سے، یعنی فیروز تغلق کے آخری زمانے (۱۳۸۸) سے ان اطراف میں آباد تھا، لیکن کیا پتہ ہمارے اسلاف کا کچھ رشتہ برہان پوری فاروقیوں سے بھی رہا ہو، یا اکبر کے زمانے کے بعد بن گیا ہو۔

مجھے دونوں ہی منصوبوں میں کچھ کامیابی نہ ہوئی تھی، اور نہ ہی مجھے اس کا امکان ہی نظر آتا تھا، لیکن شادی میں شرکت کے لیے لندن جانے کو میں نے در اصل اپنی تلاش کو وسعت دینے کا بہانہ بنا لیا اور شادی کی تقریبات کے دوسرے ہی دن سے میں نے انڈیا آفس لائبریری میں ضروری کارروائی کے بعد اس کے دار المطالعہ میں بیٹھنے، فہرستوں اور کتابیات، اور ان کے علاوہ اہم انگریز افسروں کے خاندانی کاغذات اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے کی سہولت کا انتظام کر لیا۔ نچلی منزل کے بڑے ہال میں ایک کونا، ایک کمپیوٹر، اور چھوٹا سا ڈیسک اور کتابوں کاغذوں کے لیے ایک چھوٹا سا کھلا ہوا شیلف بھی مجھے دے دیا گیا کہ وہاں اپنے دوران کار میں مجھے ضروری سہولتیں مہیا رہیں۔ انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈ اب برٹش میوزیم کا حصہ قرار دے دیے گئے ہیں اور برٹش

میوزیم سے لائبریری کو الگ کر کے اس جدید اکائی کو ''برٹش لائبریری'' کا نام دے دیا گیا ہے۔ برٹش میوزیم میں مالی تنگی بہت تھی۔ اب یہ تنگی ایک حد تک رفع ہو رہی ہے کیونکہ برنارڈ شا نے اپنی دولت خطیر کا بڑا حصہ برٹش میوزیم کو وقف کر دیا تھا۔ اس وقت برٹش میوزیم اور لائبریری ایک ہی شے تھے، لہٰذا برنارڈ شا کے وقف کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ لائبریری کے مصارف میں کام آتا تھا۔ لیکن جب انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈ کو برٹش لائبریری میں ضم کیا گیا تو برٹش میوزیم نے ایک نکتہ اٹھایا کہ برنارڈ شا کا ترکہ انڈیا آفس کے لیے تو تھا نہیں، لہٰذا اب یہ نو تشکیل برٹش لائبریری اس بات کا حق نہیں رکھتی کہ برنارڈ شا کی وراثت سے اسے کچھ ملے۔ آپسی جھگڑوں نے قانونی شکل اختیار کر لی اور برٹش لائبریری کا کٹھن سماں طویل تر ہوتا گیا۔ اب کچھ دن ہوئے معاملہ بحسن و خوبی طے ہوا ہے تو لائبریری کے دلدر کچھ دور ہوئے ہیں۔ پنسل، کاغذ، ٹیلیفون، کام کرنے کے لیے آرام دہ کرسیاں، آسانی سے سمجھ میں آجانے والے کمپیوٹر کیٹیلاگ، سب مہیا ہیں۔ پہلے یہ سب کچھ نہ تھا۔ دام بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ہاں اب بھی ہر چیز کے لیے انتظار بہت کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات پرانی دستاویزات اور خاندانی کاغذات، جن میں سے بعض کی حالت خاصی سقیم ہوتی ہے، انھیں ڈھونڈنے اور اندر سے نکلوانے میں دیر اب بھی لگتی ہے۔

میں نے گریٹ ویسٹ رسل اسٹریٹ (Great West Russell Street) کی ایک میوز (Mews) میں ایک کمرہ لے لیا تھا جو میری ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ اطلاعاً عرض کر دوں کہ Mews کسی محلے کا نام نہیں۔ اچھے مکانات یہاں شارع عام پر بالکل لب سڑک ہوتے ہیں۔ ایسے مکانوں کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہوتی ہے جن میں ان مکانوں کے گیریج (پہلے زمانے میں Carraige House) بنے ہوتے ہیں۔ انھیں Mews کہا جاتا ہے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے گاڑی خانے کو شاگرد پیشہ بنا لیا تو جن گھروں میں شاگرد پیشہ کا انتظام گھر کے اندر ہی تھا، انھوں نے اپنے Mews کو گیریج بنا لیا اور بعض نے انھیں نسبۃً کم قیمت پر نوجوانوں کے لیے ایک کمرے کا فلیٹ بنا دیا۔ سنٹرل لندن کے علاقے میں یہ میوز بے انتہا مقبول اور قابل قدر اقامت گاہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ یہ میری بس خوش نصیبی تھی کہ مجھے ایک بہت اچھا میوز فلیٹ واجبی کرائے پر مل گیا تھا۔ برٹش لائبریری یہاں سے پیدل بمشکل بیس منٹ کا فاصلہ تھی۔ چاروں طرف کھانے اور چائے وغیرہ کی دوکانیں بھی افراط تھیں۔ ہندوستانی دکانیں تو کم تھیں لیکن گوا کا چکن بندآلو (Chicken Vindaloo)، پنجاب کا دم آلو، اور ''مغلئی گرلڈ چکن تکا'' (Mughlai Grilled Chicken

(Tikka)وہاں بعض ریستورانوں میں مل جاتے تھے۔ میں نے انھیں دنوں مشہور معاصر انگریز نقاد اور ناول نگار پیٹر ایکرائڈ (Peter Ackroyd) کا ایک بیان پڑھا تھا کہ چکن بندآلو نے تو اب مچھلی اور آلو کے قتلے(Fish and chips) کو انگریزوں کے قومی کھانے کے درجے سے ہٹا کر ان کی جگہ خود لے لی ہے۔

برٹش لائبریری جاتے ہوئے مجھے دو ہی چار دن ہوئے تھے کہ مجھے وہ صاحب دکھائی دے گئے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وی۔ اینڈ اے۔ کے شعبۂ مغل مصوری برائے انیسویں صدی، اورشعبۂ کمپنی مصوری کے بھی اسسٹنٹ کیپر ہیں۔میں نے تو انھیں کچھ گھبرایا ہوا سا، جلدی میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا، اپنے خیالوں میں گم، دبلا پتلا کشیدہ قامت، نہایت گورے لیکن کجلائے ہوئے رنگ، بڑے بڑے سفید بالوں اور ہلکی سفید مونچھوں والا شخص دیکھا جو ہر موسم میں اونی ٹوپی اوڑھتا تھا۔ان کے دونوں ہاتھوں میں بریف کیس ہوتے۔ ایک میں تو کاغذات ،قلم پنسل،ڈائری، یادداشتیں، ایک آدھ کتاب ، ان کی چیک بک، پلاسٹک (یعنی کریڈٹ کارڈ وغیرہ)، وغیرہ ہوتے، لیکن دوسرے بریف کیس کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔شاید کچھ کھانے کا سامان رکھتے ہوں۔لیکن کھانا تو وہ ہمیشہ ٹرافیلگر اسکویر(Trafalgar Square) کے پاس ایک یونانی ریستوراں میں کھاتے تھے۔میرا خیال تھا کہ اس میں دوائیں ہوں گی کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کچھ بیمار سے لگتے تھے۔

جب میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تو گمان کیا کہ یہ انگریزوں کے وقت کے کوئی پرانے مخطوطہ شناس، یا پرانی تحریروں کے پڑھنے میں ماہر کوئی منشی قسم کے ہندوستانی ہوں گے جو ملک کی آزادی کے بعد بھی برٹش میوزیم چھوڑ کر اس لیے واپس نہ گئے ہوں گے کہ گھر پر ان کا کوئی نہ تھا۔ وہ شیروانی پہنتے یا سوٹ، دونوں ہی ڈھیلے ڈھالے اور کچھ ملگجے رنگوں کے ہوتے تھے۔کپڑا ہمیشہ قیمتی لیکن ذرا لا پروائی سے پہنا ہوا لگتا تھا۔ جوتے، ہیٹ، چھڑی، چھاتا، سب نہایت قیمتی اور فیشن کے مطابق، لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ پہننے والے کو اس باب میں کچھ اہتمام نہیں ہے کہ کپڑے شکن آلود نہ ہوں، صفائی اور محنت سے برش کیے گئے ہوں، ان پر کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ وہ گریٹ رسل اسٹریٹ پر برٹش لائبریری کے ایک بس اسٹاپ پہلے بس سے اترتے، نکڑ والے اخباری لڑکے (وہاں اخبار فروش کو Newsboy کہتے ہیں، چاہے وہ بوڑھا کیوں نہ ہو) سے انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون (International Herald Tribune) بین الاقوامی اخبار خریدتے اور اسے بغل میں داب کر برٹش میوزیم کی طرف پیدل چل دیتے۔

ایک دن بالکل اتفاق سے لفٹ میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا تو میں نے انھیں ''سلام علیکم'' کہا۔ انھوں نے نہایت گرم جوشی سے جواب دیا، اگرچہ مجھے ان کی ضعیف العمری اور عام چال ڈھال کو دیکھتے ہوئے ان سے کسی گرم جوشی کی امید نہ تھی۔ آج میں نے انھیں غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان کا ڈھیلا ڈھالا سوٹ محض درزی کی، یا پہننے والے کی لاپروائی، یا بہت زیادہ عمر رسیدگی کے باعث نہ تھا۔ بلکہ اصل میں وہ خود بہت ہی دبلے تھے اور ان کے بدن کی جلد ان کی گردن، ہاتھوں، اور چہرے پر بے حد خشک اور سختی سے کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گویا اندر کا گوشت گل گیا ہو اور جلد کو ہڈیوں پر کسی نہ کسی طور مڑھ دیا گیا ہو اور اگر اسے ہاتھ سے چھوئیں گے تو کاغذ کی سی کھرکھراہٹ سنائی دے گی۔ چھڑی لیے ہوئے ان کے ہاتھ کی کلائی کسی بچے کی کلائی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے میر کا شعر یاد آیا ؂

ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہے جامے میں
وگرنہ کچھ بھی نہیں میں فقط خیال اپنا ہوں

میں ابھی انھیں خیالوں میں تھا کہ لفٹ رکی اور ہم دونوں ساتھ ہی باہر نکلے۔ سامنے سے گذرتی ہوئی سکریٹری لڑکیوں نے انتہائی خوش مزاجی سے ''گڈ مارننگ ڈاکٹر''، یا ''گڈ مارننگ وسیم'' وغیرہ کہا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ صاحب یہاں بہت جانے پہچانے ہیں اور ان کا نام وسیم ہے، پورا نام وسیم احمد، وسیم اختر وغیرہ ہو گا۔ لفٹ سے نکل کر وہ کچھ مسکرا کر ''اچھا، سلام علیکم، انشاء اللہ پھر ملیں گے'' کہتے ہوئے دائیں طرف کی راہداری میں مڑ گئے۔ میں سامنے کے ہال میں اپنی مقررہ جگہ پر پہنچا تو مجھے دیکھ کر یک گونہ استعجاب اور بڑی مسرت ہوئی کہ کل شام جن کاغذات اور کتابوں کا طلب نامہ میں جمع کر گیا تھا، وہ سب کچھ میرے آنے کی پیش آمد میں میری شیلف پر رکھ دیے گئے تھے۔ دستاویزیں زیادہ تر ۱۶۶۱ کے بعد کی تھیں جب ممبئی کے جزیرے کو پرتگالی حکومت نے انگریز کمپنی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ یہودی اور پارسی وہاں مدتوں سے آباد تھے اور ان کے بارے میں کچھ معلومات ممبئی کے بدھ بھکشوؤں اور تعلیمی اداروں کی یادداشتوں میں دستیاب تھے، لیکن ان میں تسلسل نہ تھا۔ سترہویں صدی کے اواخر میں انگریزوں نے ممبئی میں میونسپلٹی قائم کی اور اس کے بعد کی دستاویزیں اور کاغذات کم و بیش مسلسل بستوں یا بکسوں میں محفوظ تھے اور اچھی حالت میں تھے۔

میں اپنے کاغذوں کی چھان بین میں لگ گیا۔ لنچ میں کھاتا نہ تھا، اس لیے وقت کے گذرنے کا کچھ اندازہ اسی وقت ہوا جب میرے پاس کے مطالعہ کنندگان آہستہ اٹھ کر جگہ خالی

کرنے لگے۔ میں بھی اٹھا تو مجھے خیال آیا کہ ویم صاحب شاید ابھی موجود ہوں، ان سے ملنا ممکن ہوتا تو خوب تھا۔ اس لق و دق لائبریری میں ایک دو ہم صورت مل جائیں تو بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ شاید ابھی اندر ہی تھے، یا پہلے ہی اٹھ گئے تھے۔ خیر، کبھی اور سہی، میں نے اپنے دل میں خیال کیا۔ اگلے دن اتوار تھا، دریائے ٹیمز کے کنارے تھیٹروں کے سامنے پرانی کتابوں کا بازار لگے گا، وہاں اول وقت جاؤں گا تو کتابوں میں دن اچھا گذر جائے گا۔ شاید کوئی چیز میرے مطلب کی بھی مل جائے۔

اس اتوار کو پرانی کتابوں کے علاوہ پرانی مصوری کے نمونوں اور پرانے نقشوں کی بھی کچھ دکانیں وہاں نظر آئیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی نادر چیز یا کوئی اعلیٰ درجے کی تصویر بہم پہنچنا غیر ممکن تھا۔ بیش از بیش سامان پرانی تصویروں کی مطبوعہ نقلوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے انگریزی رسالوں کے پھٹے پرانے مصور اوراق ضرور مل رہے تھے، اور بہت کم داموں پر مل رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے جنوری ۱۷۷۲ کی The Gentleman's Magazine کا ایک ورق صرف دس پونڈ میں مل گیا۔ ورق پر تاریخ اور رسالے کا نام صاف نظر آتا تھا۔ ورق پر دو جانوروں کی سفید سیاہ تصویریں تھیں۔ ایک کو Giraffe بتایا گیا تھا اور دوسرے کو Chinese Antelope لکھا تھا۔ ہر چند کہ تصویریں بہت درست نہ تھیں لیکن ان کی طباعت اب بھی بہت روشن تھی اور کاغذ صرف ہلکا سا آب زدہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کہیں کسی کیلنڈر کی خالی ٹیوب مل جائے تو اس میں اس ورق کو لپیٹ لوں۔ پاس ہی میں ایک بڑے میاں پرانے نقشوں کا انبار لگائے بیٹھے تھے۔ میں ادھر مڑا تو ایک جانی پہچانی صورت دکھائی دی۔ یہ ویم صاحب تھے اور ایک چھوٹے سے نقشے کو طرح طرح سے الٹ پلٹ کر گھما گھما کر روشنی کو پیچھے رکھ کر دیکھ رہے تھے۔

''سلام علیکم۔ جناب عالی،'' میں نے ان کے پاس جا کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھی ملاقات ہوئی!''

انھوں نے عینک کے پیچھے سے مجھے گھورا۔ ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں، شاید اس لیے کہ وہ اس نقشے کو غور سے دیکھ رہے تھے، یا شاید اس لیے کہ انھیں میرا مخل ہونا برا لگا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل بات یہ تھی کہ وہ مجھے بیک نظر پہچان نہ سکے تھے۔

''اخاہ، آپ ہیں! یہاں کیسے آ نکلے؟... لیکن معاف کیجیے گا ابھی آپ سے تعارف تو ہوا ہی نہیں، کل آپ کو وہاں دیکھا ضرور تھا۔'' ان کی آواز گلوگرفتہ تھی، گویا حلق پر بہت سا بلغم جمع ہو۔ ان

کی سانس بھی بہت چھچھلی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ سانس ان کے پیٹ میں سما نہ رہی تھی۔

''جی، معافی چاہتا ہوں یہ کوتاہی میری ہے۔ آپ کا اسم گرامی وسیم ہے اور آپ وی۔ اینڈ اے۔ میں...''

''جی ہاں، مجھے وسیم جعفر کہتے ہیں۔ وی۔ اینڈ اے۔ کی بات چھوڑیئے، اپنے بارے میں فرمایئے۔''

''جناب میرا نام خلیل اصغر فاروقی ہے، ماہر امراض چشم تھا، اب پریکٹس چھوڑ کر اپنے شوق کا کام کرتا ہوں۔''

''بہت خوب،'' وہ کھانستے ہوئے بولے۔ ''انسان اپنا شوق پورا کرے تو اس سے بڑھ کر کیا چاہیئے۔ فراغت ہو، اپنا شوق ہو، اور خوشگوار گھر کا خاموش گوشہ ہو، سبحان اللہ۔''

مجھے دفعتاً خیال آیا، وسیم جعفر...؟ لیکن مرزا داغ صاحب کی والدہ کے پرپوتے کا نام تو سلیم جعفر تھا۔ میں نے سوچا، پوچھ لوں، لیکن ہمت نہ پڑی۔ سلیم جعفر صاحب نے تو شاید اس پہلو کو مخفی ہی رکھنا چاہا تھا، ورنہ اپنا نام کیوں بدلتے؟ لیکن نام کا بدلنا شاعرانہ مصلحت یعنی تخلص کے باعث بھی تو ہوسکتا ہے۔

مجھے خیال میں گم دیکھ کر وہ ہنس کر بولے: ''کیا بات ہے جو چپ ہو گئے، عمر خیام یاد آ گیا کیا؟ اچھا یہ بات تو رہی جاتی ہے کہ آپ کا شوق کیا ہے، یہ شوق رقیب سروساماں تو نہیں جو بے وطن ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں، یا کیا لندن ہی میں مستقل قیام ہے؟''

''میرا شوق... میرے شوق کو آپ نسابی کہہ سکتے ہیں اور...''

میری بات پوری ہونے کا انتظار کئے بغیر وہ بول اٹھے:

''بھئی واہ، نساب اور اس زمانے میں! کیا عمدہ بات ہے۔ آپ کو کیوں نہ مغتنم جانیں۔ آپ نے کچھ لکھا وکھا بھی ہے؟''

''لکھا تو ضرور ہے، لیکن میں مغتنم وغیرہ خاک نہیں، بس طالب علم ہوں۔ اور... [اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ صاحب سلیم جعفر کے بیٹے بھتیجے وغیرہ ہیں، ورنہ یہ بات بات میں اشعار کے اشارے، یہ نستعلیق گفتگو اور کہاں ممکن]... اور مغتنم روزگار تو آپ لوگ ہیں، سلیم جعفر صاحب کے نام سے میں خوب واقف ہوں۔''

''سبحان اللہ، آپ دادا جان کی تحریروں سے آشنا ہیں تب تو آپ اپنی گوں کے یار نکلے۔

میں تو ان کا پاسنگ بھی نہیں۔ لیکن باپ دادا کی تربیت نے کچھ حرف شناس کچھ نقش شناس کر دیا۔ خوب لوگ تھے وہ...'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔''رہے نام اللہ کا۔''

''اور وزیر خانم صاحبہ...؟'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کس شان اور کس آن بان کی خاتون تھیں ۔ بلکہ اس وقت تو میں بھی انھیں کے بارے میں کچھ چیزیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''خوب، اور اس وقت جناب کے ہاتھ میں یہ نقشہ کیسا ہے؟''

''نقشہ،'' وہ خوش ہو کر ہنسے، لیکن پھر کھانسنے لگے۔ کھانسی نے ان کا چہرہ سرخ کر دیا، سانس بالکل تلپٹ ہو گئی۔ میں بے چارگی سے انھیں دیکھتا رہا۔ انھوں نے جیب سے دوا کی ٹیوب نکال کر گہری سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے دوا کی پھوار حلق میں ڈال کر ایک لمحے کو توقف کیا۔ پھر جب حال ذرا بہتر ہوا تو بولے۔''جناب یہ ممبئی کا نقشہ ہے، ۱۶۹۴ کا۔ ظاہر ہے کہ آج کا شہر کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے...''

''لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نقشے کی تاریخی اور دستاویزی اہمیت بہت ہے۔ اور حسن اتفاق یہ کہ میری بھی دلچسپی اس وقت ایک ایسے معاملے سے ہے جس میں ممبئی کا بھی سلسلہ ہے۔''

''بھئی بہت خوب۔ تب تو یہ نقشہ خرید ے لیتے ہیں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے بے تامل وہ چھوٹا سا نقشہ ایک سو ساٹھ پونڈ میں خرید لیا۔

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے پملکو (Pimlico) کی طرف چلے جہاں انھیں کسی سے ملنا تھا۔ راستے میں ہم دونوں نے اپنا مزید تعارف کرایا۔ نسابی کے باعث پرانی دستاویزوں اور کتابوں سے مجھے دلچسپی تھی اور مخطوطہ شناس، نقش شناس اور قدیمیات کے ماہر کی حیثیت سے پرانی کتابیں، دستاویزیں، تصویریں، ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ شعر بھی انھیں خوب یاد تھے، لیکن اقبال کے بعد کے کسی شاعر کو انھوں نے نہیں پڑھا تھا۔ ناول اور افسانے سے انھیں کوئی ذوق نہ تھا، ہاں قرۃ العین حیدر کے کئی بیانیے خاص کر ''کارِ جہاں دراز ہے'' انھوں نے پڑھے تھے اور انھیں اپنے کام میں ایک حد تک مفید مطلب جانتے تھے۔

پملکو پہنچ کر انھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔''اب میں بائیں گلی سے ہو کر اپنے دوست کے یہاں پہنچ جاؤں گا، آپ مزید زحمت نہ کریں۔ کل ملاقات ہوگی۔''

مجھے خوف تھا کہ کہیں کھانسی انھیں پھر نہ پریشان کرے لیکن انھوں مجھے ہی ہنسی میں اڑا دیا

کہ آپ بھی خوب شے ہیں، ذرا سی کھانسی سے ڈرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر مڑے ہی تھے کہ رکے اور بولے، ''آپ کو معلوم ہے عربی میں ''کھانسی'' کو کیا کہتے ہیں؟''

''جی، جی نہیں۔ میری عربی بس واجبی سی ہے۔''

'قحبہ''، وہ مسکرا کر بولے۔ میں ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔ کیا یہ کسی آنے جانے والی خاتون کی طرف اشارہ تو نہیں کر رہے ہیں؟

''جی؟ قحبہ، میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔''

انھوں نے ہنسنے کی کوشش کی، لیکن انھیں پھر کھانسی آ گئی۔ وہ کچھ دیر کھانستے رہے، اس بار انھوں نے سینے کو دونوں ہاتھوں سے داب لیا تھا لیکن کھانسی تھی کہ آئے چلی جا رہی تھی۔ جب ان کی حالت میں ذرا اعتدال آیا تو بولے۔

''مجھے اس کھانسی پر ہی یاد آیا۔ قدیم عرب میں قحبائیں چونکہ اپنے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہلکے سے کھانستی تھیں، اس لیے انھیں بھی ''قحبہ'' کہا جانے لگا۔''

میں ہنسا، ''بڑی عجیب بات بتائی آپ نے۔ زبان بھی کیا شے ہے خدا کی قسم۔ امریکی انگریزی میں طوائف کو Hooker بھی کہتے ہیں۔ اس کی بھی شاید کچھ ایسی ہی تاریخی وجہ تسمیہ ہے۔ لیکن صاحب آپ اپنی کھانسی کا علاج کر ڈالیے، اس عمر میں کوتاہی ٹھیک نہیں۔''

ان کے چہرے پر کچھ عجیب سا رنگ آیا۔ ''ہاں، علاج تو کرتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ مسکرا کر بولے۔ قحبہ تو قحبہ، جائے گی کہاں۔ اچھا خدا حافظ۔'' وہ گلی میں مڑ گئے۔

اگلے دن لائبریری میں مجھے انھوں نے خاص طور پر ڈھونڈا اور دن کا کھانا کھلانے کے لیے اپنے معمولہ یونانی ریستوراں میں لے گئے۔

''جانتے ہیں آپ، ورجینیا وولف (Virginia Woolf) بھی اسی ریستوراں میں دن کا کھانا کھاتی تھی۔ جب وہ برٹش میوزیم میں دیر تک کام کرتی تو ذرا سا کھانا یہیں آ کر کھا لیتی تھی۔ اس نے اپنی کتاب A Room of One's Own میں اس کا ذکر کیا ہے۔''

وسیم جعفر کا دماغ اور بہت سی چیزوں کے علاوہ کسی بڑے عجائب گھر کے ان کمروں سے مشابہ تھا جن میں وہ اشیا رکھی جاتی ہیں جنھیں نمائش پر رکھنا کسی باعث ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کمروں میں ایک سے ایک عجیب، دور از کار، غیر متوقع اور نادر سامان بھرا ہوتا ہے۔ وسیم جعفر صاحب بھی ایسی ہی انوکھی معلومات کا خزانہ تھے۔ مجھے وہ اپنے خیال میں کچھ شرمیلا اور منہ چھپاؤ سمجھتے

تھے۔ ایک دن رائل سوسائٹی کے سامنے سے گذرتے ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ شرم اور گھر گھسنا پن اعلیٰ سائنسی یا ادبی کارناموں کا ضامن ہو سکتا ہے۔ مشہور سائنسداں ہنری کیونڈش (Henry Cavendish) اس قدر شرمیلا تھا کہ وہ کسی سے، حتیٰ کہ اپنے نوکروں سے بھی بات نہ کر سکتا تھا۔ اس کے گھر کی مغلانی ذرا ذرا سے معاملات میں احکام حاصل کرنے کے لیے اس سے دن رات رقعوں کے تبادلے کرتی تھی۔ مغلانی کے سوالوں کا جواب عموماً وہ "ہاں"، "نہیں"، "جانے دو"، وغیرہ فقروں میں دیتا تھا۔ اس کے باوجود کیونڈش نے کئی سائنسی دریافتیں ایسی کیں جو اس کے عہد سے کئی دہائی، بلکہ ایک دو صدیاں آگے تھی۔ کیونڈش نے گھر بیٹھے صرف ایک بھونڈی سی مشین، کاغذ قلم، اور ایک دو معمولی پیمانوں کی مدد سے زمیں کا وزن دریافت کیا۔ اس کا نکالا ہوا نتیجہ آج کے نہایت باریک اور لطیف اوزاروں کی مدد سے متعین کئے ہوئے وزن سے بس ایک فی صدی سے کچھ کم ہے۔

"تو میاں خلیل، جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم کچھ عقلمندی کا مقولہ نہیں۔ ضرورت تو دراصل خود سے شرم کرتے رہنے کی ہے۔ کل میں لارڈ لیک اور مہاراول بختاور سنگھ کے کاغذات اور مراسلت دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے بعض اچھے مصور بھی نوکر رکھے تھے۔ مجھے ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی تلاش ہے۔" انھیں بے طرح کھانسی آگئی، یہاں تک کہ وہ سڑک کے کنارے ایک دوکان کی سیڑھی پر ذرا سمٹ کر بیٹھ گئے کہ کھانسی فرو ہو تو بات کو آگے بڑھائیں۔

ایسی بری کھانسی اور پھنسی ہوئی آواز اور تنفس کی تنگی تو کوئی اچھی علامتیں نہ تھیں۔ بات کو بدلنے کی غرض سے میں نے کہا:

"لیکن آپ نواب احمد بخش خاں اور وزیر خانم کے بارے میں بھی کچھ تلاش کر رہے تھے؟ جناب عالی، خود سے شرم کرنا تو ایک ادائے ناز ہے۔ وہ ہم لوگوں کو نصیب کہاں۔ یہ آپ وزیر خانم سے کہتے تو ایک بابت بھی تھی۔" میں نے انھیں چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

انھیں دوبارہ ذرا سی کھانسی آئی، انھوں نے فوراً رومال سے منھ صاف کیا اور بولے: "ہاں میاں، ہم ٹیوب ٹرین اور انٹرنیٹ کے زمانے کے لوگ ادائے ناز جیسی نازک شے کیا سمجھیں۔ لیکن جناب میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اپنے کو کرم کا احساس ہو..."

"واللہ یہ لفظ کو کرم آپ نے کہاں سے نکالا، اچھا خاصا انسان کتا معلوم ہونے لگا!"

"یہی تو اس لفظ کی خوبی ہے۔ وہ کس کی نظم تھی، آڈن کی نظم تھی نہ، The Dog

Beneath the Skin...؟ تو پھر میں نے کیا جھوٹ کہا۔"

"جی ہاں عمیق حنفی صاحب مرحوم نے بھی ایک نظم میں لکھا ہے، ع میرے اندر بھونکتا کتا بندھے۔"

"یہ عمیق حنفی صاحب کون تھے، ان کو تو میں جانتا نہیں، لیکن بات پتے کی کہی ہے انھوں نے۔ تو لیجیے کتنا کارآمد لفظ ہے۔ لیکن صاحب میں سچ کہتا ہوں اگر ہمیں اپنی برائیوں کا شعور ہو جائے ..."

"تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہے۔" میں نے بادشاہ بہادر شاہ کے شعر کا ایک ٹکڑا کچھ بدل کر پڑھ دیا۔

"نہ، نہ، نہ... ہرگز نہیں، یہ بات نہیں۔ برے تو ہم سب ہیں، لیکن ہم اپنی برائیوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ولیم فریزر کو لیجیے، بڑا ہندوستانی بنا پھرتا تھا لیکن شمس الدین احمد خان سے وزیر خانم کا عشق برداشت نہ کر سکا۔ شمس الدین احمد خان کی والدہ کے ساتھ ان کی سوتوں نے اچھا سلوک نہ کیا تو شمس الدین احمد خان کے دل میں ان کے لیے اور ان کی اولادوں کے لیے نفرت اُمڈ آئی۔"

"اور وزیر خانم، آپ کی دادی جان؟"

"بڑی پیچیدہ مزاج خاتون تھیں، باہمت بھی تھیں۔ میں ان کی تصویر کی دھن میں ہوں کہ کہیں سے مل جائے تو شاید ان کا کردار کچھ اور سمجھ میں آئے۔ اس زمانے کے بعض ہندوستانی مصوروں نے شبیہ سازی میں کردار نگاری کے بھی ڈھنگ آزمانے شروع کر دیے تھے۔"

پھر میری ان کی ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ انھیں وزیر خانم، مارسٹن بلیک، نواب احمد بخش خان، میرزا فتح الملک بہادر وغیرہ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ مارسٹن بلیک کی موت کا حال انھوں نے مجھے بہت مفصل بتایا تھا۔ میں دیر تک تعجب کرتا رہا کہ انگریزوں کے خلاف اس زمانے میں بھی ایسے اقدامات اور "غدارانہ" واقعات ہو سکتے تھے۔ وسیم جعفر صاحب نے میری غلط فہمی رفع کی۔ انھوں نے بتایا کہ سنہ ۱۸۰۰ اور ۱۸۵۷ سے درمیان اہل ہند نے تین یا چار بار فرنگی حاکم کے خلاف خروج کیا تھا اور ہر بار انگریز کو خاصا جانی و مالی نقصان پہنچایا تھا۔ انھوں نے بریلی اور بنارس کے واقعات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بنارس میں تو شاہ عالم کے سب سے ہونہار بیٹے میرزا جواں بخت نے انگریز پر گولی ہی چلا دی تھی اور انگریزوں کے خلاف خروج کی سربراہی کی تھی۔ ایک اور مغل شاہزادے میرزا جہانگیر بخت نے بھی کسی بدتمیزی کی بنا پر ایک انگریز افسر کو گولی ماردی تھی اور بنارس جلا وطن کر دیے گئے تھے۔

"سرسید کی بات میں کچھ صداقت تھی۔" وسیم جعفر نے کہا، "اپنے بجنور والے رسالے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں اس بات کا بہت غصہ تھا کہ فرنگی لوگ ہمارے ساتھ

برابری کا سلوک تو دور ہا، انسانی سلوک بھی نہیں کرتے۔ اسی بات کو بڑے عجیب وغریب انداز میں سید محمود نے بنارس میں ۱۸۹۱ کی ایک تقریر میں کہا کہ انگریزوں کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ حاکم ہیں اور ہم رعایا۔ رعایا ہم دونوں ہیں۔ ملکۂ عالیہ ہماری حاکم ہیں، اور ان کی رعایا کی حیثیت سے ہم دونوں برابر ہیں، برابر کے حقوق وفرائض ومراعات رکھتے ہیں۔''

''اس زمانے کو دیکھتے ہوئے بڑی عجیب اور بڑی جرأت مندانہ بات تھی، بلکہ سید محمود کا یہ خیال ہی بالکل نیا تھا۔ مگر انگریزوں کا جواب کیا رہا؟''

''اجی انگریز ایک کائیاں قوم ہیں۔ وہ موقع یہ تھا کہ سرسید نے اپنے پرانے کلکٹر بجنور اور موجودہ کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیئر کی دعوت کی تھی، شہر کے سارے روء سا وعمائد جمع تھے۔ سید محمود کی تقریر کو اس زمانے کے مذاق کے مطابق ایک خوش طبع After dinner speech کہہ کر ٹال دیا گیا۔ ویسے بھی کمشنر صاحب کرتے کیا؟ سید محمود کی تجویز کو حکومت کے سامنے پیش کر سکتے نہ تھے۔ اور اگر پیش کرتے بھی تو نوکری سے برخواست ہو جاتے۔''

وہ ہنسے، لیکن ان کی ہنسی پھر کھانسی میں تبدیل ہو گئی۔

ایک بار وسیم جعفر صاحب نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ پورٹو بیلو روڈ (Portobello Road) خود ہی ذرا خستہ حال علاقہ ہے، اس کی ایک سالخوردہ عمارت کی تیسری منزل پر ان کا گھر تھا۔ پرانی وضع کی تنگ سیڑھیاں تھیں، لفٹ تھی نہیں، خدا معلوم کس طرح چڑھتے اترتے ہوں گے۔ جب میں اندر داخل ہوا تو فوراً محسوس ہوا کہ ایسی غیر فیشن ایبل اور کم آرام دہ بستی کے ایسے معمولی گھر میں ان کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ کرایہ نہ دے سکتے تھے، اور زیادہ کرائے کی عدم استطاعت کا باعث جز رسی نہیں، بلکہ نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا۔ دو کمروں کے گھر میں تصویریں، کتابیں، شیشہ آلات، مخطوطے، ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ میں جس چیز کو اٹھاتا اسے اپنی طرز کی انوکھی ہی پاتا۔ میری حیرت اور شغف کو دیکھ کر وہ مسکرائے۔

''میں نے آپ کو ایک خاص مطلب سے زحمت دی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا کھانا نہ کھلوائیں گے آپ؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کھانا... تو کھائیں گے، ضرور ہی کھائیں گے صاحب۔ لیکن یہ بتائیں آپ نے مولانا محمد حسین آزاد کا مدون کردہ دیوان ذوق پڑھا ہے؟''

''کہہ تو نہیں سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ذوق کا کلام تھوڑا بہت دیکھا ضرور ہے لیکن مولانا

محمد حسین آزاد کا مرتب کیا ہوا دیوان ذوق تو... میں نے شاید اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اب تو بہت نادر ہو گیا ہوگا۔ مگر آپ اسے ہی کیوں پوچھتے ہیں...؟ تنویر احمد علوی والا نسخہ تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔''

''آپ نے اس کی شکل نہیں دیکھی تو اچھا ہی کیا۔'' اچانک ان کا منہ تمتما گیا، جیسے بخار میں ہوں۔ میں نے انھیں ہمیشہ نہایت ٹھنڈے مزاج کا اور کسی بات کا زیادہ اثر نہ لینے والا پایا تھا۔ لیکن آج ان کا رنگ بظاہر بے سبب اور دفعۃً اس قدر برہم دیکھ کر میں کچھ گھبرا گیا۔ میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔

''چلیے پھر تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ڈرا تھا کہ اگر میں نے وہ کتاب دیکھی ہوتی تو اس کی سزا میں آپ مجھے کھانا ہی نہ کھلاتے۔''

انھوں نے کچھ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں یہ بات نہیں کہ اس کی وجہ سے کوئی بھوکا سوئے۔ لیکن جس نے لکھی ہے اس نے ایمان و انصاف کا کچھ خیال نہ رکھا۔''

میں ذرا پریشانی میں پڑ گیا۔ کتاب سے اگر ان کی مراد دیوان ذوق سے تھی تو اس کے مصنف کے بارے میں یہ خیال مولانا حالی یا سرسید کا تو ہو سکتا تھا کہ اس نے ایمان و انصاف کا کچھ خیال نہ رکھا، لیکن وہ تو ایک تاریخی اور تہذیبی شکست کی بات تھی۔ سنہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں لٹ پٹ کر ہمارے بزرگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کو وجودک ذنبٌ کہہ رہے تھے۔ اب وہ بات تو تھی نہیں۔ کیا مولوی نذیر احمد کی روح نے دوبارہ جنم لے لیا تھا؟ لیکن آج تک تو وسیم صاحب نے ایسی کسی رائے یا رویے کا اظہار نہ کیا تھا... پھر آج کیا بات ہو گئی تھی؟

مجھے چپ دیکھ کر وسیم صاحب کا بھی مزاج ذرا ٹھنڈا ہوا۔ ''دیکھیے نہ، اس میں ایک جگہ مولانا نے کیسی غیر منصفانہ اور دل آزار بات لکھ دی۔''

''جی، میں نے اس کتاب کو پڑھا تو نہیں ہے... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا تو شیخ ابراہیم ذوق کے بے حد پرستار تھے۔ ذوق کے خلاف انھوں نے بھلا غیر منصفانہ بات کیا لکھ دی ہوگی؟''

''تھے۔ وہ ذوق کے پرستار تھے۔'' وہ تیزی سے بولے۔ ''لیکن بہادر شاہ ظفر کے نہیں، نہ مرزا فتح الملک کے... اور نہ شوکت محل کے۔''

ان کا چہرہ پھر سرخ ہونے اور سانس پھر پھولنے لگی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کہوں کیا کروں۔ شوکت محل کے نام سے میں واقف نہ تھا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وسیم جعفر صاحب پر اس طرح کے دورے اکثر پڑتے تھے یا آج ہی یہ معاملہ تھا، اور یہ کہ ان کا ڈاکٹر یا نیشنل ہیلتھ

سروس (National Health Service) کا اسپتال کہاں تھا، اس وقت ڈاکٹر کو بلانا ٹھیک ہے بھی کہ نہیں، میں کچھ سراسیمہ سا ہونے لگا۔ میں وسیم جعفر صاحب کی صحت کے بارے میں کچھ جانتا نہ تھا، بیمار وہ ضرور لگتے تھے۔ گھبراہٹ میں مجھے اور کچھ نہ سوجھی تو میں نے ریفریجریٹر سے بوتل نکال انھیں پانی پیش کیا اور کہا، ''لیجیے پہلے پانی پی لیجیے، ذرا سانس تو برابر آئے۔ پھر بات کریں گے۔''

انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک دو گھونٹ پانی پی کر انھیں کچھ شاید کچھ سکون ہوا۔ وہ چپ بیٹھ گئے اگرچہ ان کے منھ پر اب بھی تھوڑی سی وحشت کے آثار تھے۔

پانچ سات منٹ یوں ہی گذرے۔ پھر انھوں نے گہری سانس لی، دونوں ہاتھوں سے منھ کو رگڑا، آنکھیں ملیں، گویا ابھی سو کر اٹھے ہوں۔ پھر وہ گلاس کا باقی پانی ایک سانس میں پی کر اپنی عام آواز میں بولے:

''خلیل اصغر، چوری کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں گڑبڑا کر کچھ الٹی سی کہنے ہی والا تھا کہ انھوں نے بات پوری کی، ''میرا مطلب یہ ہے کہ چوری کرنا آپ کی نظر میں کیسا ہے؟''

مجھے الجھن سی ہوئی، یہ کیا فضول گفتگو ہو رہی ہے۔ کھانے پر بلا کر عجب عجب طرح کی بے تکی اڑائی جا رہی ہے۔ پھر بھی میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا۔ ''جناب چوری کرنا تو پانچوں عیب شرعی میں شامل ہے، مگر کیا آپ کوئی اجتہاد کرنے والے ہیں؟ یا آپ کی کوئی چیز کھوئی گئی ہے؟''

ان کے چہرے پر بیزاری اور کبیدگی کے سے تاثرات ابھرے۔ شاید میری بات انھیں پسند نہ آئی تھی، یا شاید وہ بات ہی ناپسندیدہ تھی اور اسے میرے سامنے افشا کرنا انھیں بہت ناگوار تھا، لیکن افشا کیے بغیر بنتی بھی شاید نہ تھی۔

''دیکھیے،'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولے، جس طرح بچوں یا کم عقل لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ ''فرض کیجیے آپ کی کوئی چیز ہو، اور اسے اگلا چرا لایا ہو، تو آپ اس چیز کو واپس چرا لینے میں حق بجانب ہوں گے کہ نہیں؟''

''د... دیکھیے یہ معاملہ تو ف... ف... فرضی ہے،'' اچانک میری زبان میں ہکلاہٹ آگئی۔ ''جسے انگریزی میں hypothetical کہتے ہیں۔ ایسی ... ای... ای ب... بات پر میں کیا رائے دوں؟'' میں ڈر رہا تھا کہ میرے انکار پر انھیں پھر سے غصے، یا کھانسی، کا دورہ نہ پڑ جائے۔ لیکن ان کی بات ہی عجب بے ڈھب اور مبہم سی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کون سی

بات کہوں جو انھیں ناگوار نہ ہو اور یہ بھی محسوس نہ ہو کی میں ان کے ساتھ مربیانہ برتاؤ کر رہا ہوں یا انھیں بہلا رہا ہوں۔

وہ دوبارہ کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ پھر کچھ اس لہجے میں بولے گویا کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں:

''بتایئے برٹش لائبریری اور وی۔ اینڈ اے۔ میوزیم میں بہت سارا مال ہندوستانیوں کا ہے، کہ نہیں؟''

''بے شک، ہندوستانیوں یا کسی انفرادی ہندوستانی کا بھلے ہی نہ ہو، لیکن اہل ہند کی ملکیت تو وہ بے شک ہے۔''

''خوب، اور یہی کیفیت اس مال کی بھی ہے جو دوسرے عجائب گھروں اور ذاتی حویلیوں، کوٹھیوں، بکنگھم پیلیس وغیرہ میں ہے؟''

''جی بے شک۔ لیکن اس سب میں سے کچھ تو مال کے اصل مالک نے موجودہ مالک کو تحفۃً بھی دیا ہوگا۔''

''بے شک،'' انھوں نے میری بات دہرائی لیکن اس میں کوئی طنز نہ تھا۔ ''میں اس سب مال کو چھوڑنے کو تیار ہوں جو برضا و رغبت اور تحفۃً دیا گیا ہوگا۔ لیکن خوشامد اور رشوت میں دیے ہوئے مال، لوٹ کے مال، اور از روے جبر و استحصال قرق کیے ہوئے مال کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟''

یہ بحث کہاں لیے جا رہی تھی، اس کا دھندلا سا احساس مجھے تھا۔ لیکن اس طرف جانے کا مقصد میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے بہت سوچ کر کہا، ''اگر کسی ایسے مال کا حقیقی اور جائز وارث پیدا ہو جائے تو وہ اس کی واگذاشت کے لیے دعویٰ کر سکتا ہے۔''

''اور اگر دعویٰ منظور ہونے کی کوئی امید نہ ہو...؟''

''مگر عدالت ہی تو ایک راستہ ہے۔''

''کیوں؟ اور کوئی راستہ کیوں نہیں؟''

''بھلا کیا راستہ ہے، کیا وہ اسے زبردستی چھین لے؟ اور زبردستی چھیننا... یہ اس کے بس میں بھی ہے کہ نہیں؟''

''نہیں، چھیننے کی بات نہیں ہے۔''

''بھئی وسیم جعفر صاحب پہیلیاں نہ بجھایئے۔ میرا تو دم الٹا آرہا ہے۔''

مجھے ڈر تھا کہ جعفر صاحب پھر بگڑ جائیں گے۔ لیکن اس بار وہ ایک لمحہ چپ رہ کر بولے:
''آپ کو معلوم ہے وزیر خانم میری پردادی تھیں اور میں ان کے حالات تلاش کر رہا ہوں۔''
''جی ہاں۔ اور آپ کو تلاش ہے کہ ان کی کوئی تصویر آپ کو مل جائے۔''
''محمد حسین آزاد نے ایک تصویر کا ذکر کیا بھی ہے، اسی دیوان ذوق میں جس کا میں نے ابھی آپ سے تذکرہ کیا تھا۔''
''اچھا، بہت خوب۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔''
''مجھے وہ تصویر مل گئی ہے۔'' انھوں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔
''ارے واللہ! میں اپنی جگہ سے تقریباً اچھل کر بولا۔'' تو یہ تو بڑی قیمتی تصویر ہوگی، تاریخی اعتبار سے بھی اور ادبی اعتبار سے بھی۔ واہ صاحب واہ۔ آپ نے تو بڑا گہرا ہاتھ مارا!''
''وزیر خانم کے واحد مرد وارث کی حیثیت سے میں اس تصویر کا قانونی مالک ہوں۔'' انھوں نے اپنی بھاری، کھانسی زدہ آواز میں کہا۔
''لیکن وہ تصویر ہے کہاں؟ کیا اس کا مالک آپ کے ہاتھ اسے بیچ دے گا؟''
''وہ بھلا کیوں بیچے گا؟ کیا عبد الحمید لاہوری کا ''پادشاہ نامہ'' انگریزوں نے واپس کیا؟ کیا کوہ نور ان لوگوں نے واپس کیا؟''
''لیکن وہ تو کروڑوں کی چیزیں ہیں، اور وہ بھی پونڈ میں، نہ کہ ہندوستانی روپیوں میں۔ یہ تو ایک تصویر ہے، وہ بھی کسی شہزادی یا ملکہ کی نہیں۔ بھلا ''پادشاہ نامہ'' اور کوہ نور کہاں اور یہ تصویر کہاں؟ یہ تصویر تو اس کا موجودہ مالک دے ہی دیں گے، نہیں تو بھاری داموں میں آپ کے ہاتھ بیچنے پر ضرور راضی ہو جائے گا۔ ہے کہ نہیں؟''
''مانتا ہوں کہ یہ تصویر کوئی بڑا خزانہ نہیں، لیکن پھر بھی یہ قوم ایسی نہیں کہ ہاتھ آئی چیز کو جانے دے۔''
''یعنی وہ تصویر بھی انگریزی حکومت کے قبضے میں ہے اور آپ اس سے واپسی کی درخواست نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے؟''
''دونوں ہی باتیں ہیں۔''
''بھئی معاف کیجئے گا آپ چبا چبا کر کیوں بات کر رہے ہیں؟ صاف کہیئے تو کچھ میں عرض بھی کر سکوں۔'' میں نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔

''آپ کے کیے کچھ نہ ہوگا'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔'' بہر حال سنئے۔آپ جانتے ہیں میں برٹش لائبریری میں چیزیں ڈھونڈا کرتا ہوں۔ ایک بار بالکل اتفاقاً مجھے لارڈ رابرٹس، وہی Forty-one Years In India والا لارڈ رابرٹس (Lord Roberts) جس نے زینت محل کے بارے میں حد درجہ گستاخانہ اور بیہودہ باتیں لکھی ہیں، اس کی ڈائری کی خبر لگی کہ جس کے اندراجات سے اس نے اپنی کتاب میں بہت کام لیا تھا۔ میں نے سنا کہ وہ ڈائری ایبر ڈین یونیورسٹی (Aberdeen University) کے کتب خانے میں ہے لیکن عام مطالعے کے لیے نہیں ہے۔ خیر میں نے اپنے تعلقات کو کام میں لا کر وہاں تک رسائی حاصل کر لی۔ میں نے ڈائری میں جگہ جگہ ایسی چیزیں پائیں جن کا ذکر رابرٹس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے۔''

''یعنی لوٹ مار کے واقعات، یا انگریزوں کے مظالم؟'' میں نے کہا۔

''وہ تو یقیناً، لیکن اس میں بادشاہ کے اور میرزا فتح الملک بہادر کے ذاتی کاغذات کا بھی ذکر تھا کہ قلعے کے کتب خانے اور دفاتر کی لوٹ میں سے کچھ چیزیں اس کے ہاتھ لگیں، جیسے میرزا فتح الملک بہادر کا ذاتی روزنامچہ۔ میں نے اس سے پہلے اس زمانے کے کسی معمولی شہزادے، کجا کہ ولی عہد سلطنت کے روزنامچے کا ذکر نہ سنا تھا۔ رابرٹس نے لکھا ہے کہ میں نے وہ سب کاغذات انڈیا آفس میں جمع کرا دیئے تھے۔''

''تعجب اور سخت تعجب ہے کہ آج تک کسی کو اس کا خیال نہ آیا۔آپ کی دریافت تو بڑی اہم ثابت ہو سکتی ہے۔''

''جی۔ پھر میں نے برٹش لائبریری میں ہر جگہ ڈھونڈا، تمام ممکن فہرستیں، کیٹلاگ، اور سالانہ رپورٹیں دیکھیں، کچھ پتہ نہ لگا۔ میں امید کھو چکا تھا لیکن بس اتفاق ہی کہیئے کہ ایک دن ایک بڑے میاں مجھے مل گئے جنھیں انڈیا آفس کی نوکری سے سبک دوش ہوئے کوئی پچیس تیس برس گذر گئے ہیں۔ ان سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ ۱۸۵۷ کے بہت سے کاغذات جنھیں غیر اہم قرار دیا گیا تھا، وہ کتب خانے کی فہرست میں درج ہی نہ ہوئے تھے۔ انھیں بکسوں میں بند کر کے تہ خانے میں رکھوا دیا گیا تھا کہ کبھی فرصت اور وسائل ہوں گے تو انھیں کیٹلاگ کیا جائے گا لیکن وہ نوبت ہی نہ آئی۔''

''بھئی واہ۔ یہ تو بڑی عجب بات ہوئی۔''

''جی ہاں، خیر مزید تفصیل کو چھوڑتے ہوئے بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بہت تلاش کے بعد وہ سب بکس مجھے مل گئے۔ چمڑے کے سات بکس تھے، جیسے کہ اکثر جہازی استعمال کرتے ہیں اور ہر

بکس کے مشمولات کی تفصیل بھی کاغذوں کے ساتھ بستے میں بندھی ہوئی تھی۔ ایک بکس میں بہت سی دستاویزوں کے ساتھ میرزا فخرو مرحوم کا روز نامچہ بھی تھا... لیکن اس میں کچھ اور بھی تھا۔''

وسیم جعفر خاموش ہو گئے، جیسے آگے بتانا چاہتے نہ ہوں۔ اب مجھے بھی کرید ہوئی کہ وہ کیا چیز ہو سکتی تھی، بادشاہ کی وصیت، یا مرزا الٰہی بخش کی غداری کے بارے میں کوئی نئی بات، یا... وہ جو بات مشہور ہے کہ دہلی کے قلعے سے لے کر آگرے کے قلعے تک سرنگ تھی، اس کا کچھ ثبوت، یا... یا گڑا ہوا خزانہ، بھلا کیا شے ہو سکتی تھی؟

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی؟'' میں نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

''جاننا کیا معنی، میں وہ چیز آپ کو دکھائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنا بریف کیس کھول کر انھوں نے ایک مضبوط، بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ ان کے ہاتھ میں خفیف سی لرزش تھی۔ لفافہ مہر بند نہ تھا، لہٰذا میں نے اس کا فلیپ کھول کر اس کے اندر رکھا ہوا کوئی چھ انچ اونچا اور پانچ انچ چوڑا موٹا کاغذ نکال لیا۔

کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کی عمر یہی چوبیس چھبیس سال کی رہی ہو گی۔ سانولا رنگ، لیکن اس قدر تر و تازہ چہرہ گویا کسی نے سوسن کے پھول کا جوہر نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ سیدھی، نازک سی ناک، لیکن دونوں نتھنے ذرا پھڑکتے ہوئے سے، جیسے اس نے کوئی اچھی بات سنی ہو یا کوئی اچھی بات کہنے والی ہو۔ کوئی ڈیڑھ دو سو برس پرانی تصویر دو چشمی تھی لیکن اس زمانے کی عام تصویروں سے بر خلاف صاحب تصویر کو یوں دکھایا گیا تھا گویا وہ مصور، اور تماشائی، دونوں کے وجود کا پورا احساس رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جنس اور شباب کا ایسا بھرپور شعور تھا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا یہ تصویر اپنی آنکھ یا ابرو سے مجھے کوئی اشارہ کرنے والی ہے۔ لیکن اس اشارے میں کوئی رکاکت یا سوقیانہ پن نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی چنوتی تھی، کہ کیا تم اس فتنہ سامانی سے عہدہ برآ ہونے کا دل رکھتے ہو؟ سڈول چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، ان پر لمبی لمبی پلکیں، لیکن سایہ فگن نہیں، چلمن کی طرح کچھ اٹھی ہوئی۔ آنکھوں کا رنگ شربتی، گہرا اور ہلکی سی سنہری دمک لیے ہوئے، اور سفیدی ایسی سفید اور اس میں ہلکی سی ٹھنڈک کی ایسی کیفیت جیسے تازہ کھلا ہوا گل مشکی۔ آہو کی سی لمبی سڈول گردن میں مالائے زمرد، نولڑوں کا، لیکن سب دانے برابر کے اور ہم رنگ و ہم شکل تھے۔ گلے کے نیچے تک وادی شانہ میں چنے کی دال کے برابر زمرد ہی زمرد تھے جن کی سبزی آنکھوں میں ہری دوب کی طرح کھبی جاتی تھی۔ آنچل سر پر نہ تھا، اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ

صاحب تصویر کو آنچل کے ڈھلک جانے کا علم ہے۔ سنہرے بادلے سے پٹا ہوا آسمانی دوپٹہ شانے اور سینے کو بے پروائی سے کچھ ڈھک رہا تھا کچھ نمایاں کر رہا تھا۔ بہت گھنی چوٹی، تھوڑی سی کھلتی ہوئی، ہر لٹ میں ایک دو موتی ٹکے ہوئے، گویا بے خیالی میں وہاں الجھ گئے ہوں۔

لیکن افسوس کہ تصویر ادھوری تھی، لیکن اس لیے نہیں کہ مصور نے اسے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ کسی بے درد نے اسے اس طرح پھاڑ ڈالا تھا کہ تہائی سے کچھ زیادہ تصویر ضائع ہو گئی تھی۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا:

''یہ... یہ تصویر... وزیر خانم کی تو نہیں؟ اسے پھاڑ کس نے ڈالا؟'' میں نے وفور وحشت میں یہ بھی نہ محسوس کیا کہ میرا دوسرا سوال کس قدر احمقانہ ہے۔

وسیم جعفر نے کہا، ''اس کی پشت پر ایک تحریر ہے۔ پڑھیے۔'' ان کے چہرے پر کچھ سیاہی مائل تپش تھی، بیماروں جیسی۔ ان کی آواز میں اب اور زیادہ لرزش تھی۔

میں نے کاغذ پلٹا تو دیکھا کہ اس پر خط شکستہ میں تحریر تھی، مٹی مٹی سی۔ شاید کبھی کسی نے اسے پانی سے دھونے کی کوشش بھی کی تھی۔ سیاہ روشنائی آنسو بھرے کاجل کی طرح پھیل گئی تھی، حرف بہت جلی نہ تھے، لیکن مجھے پرانے شجرے اور دستاویزیں پڑھنے کی جو مشق تھی وہ کام آئی۔ ذرا سی کوشش کر کے میں پڑھ لیا ''شبیہ حقیقی وزیر خانم صاحب عرف چھوٹی بیگم، سلمہا اللہ تعالیٰ''۔ اس کے آگے کچھ تاریخ تھی لیکن وہ کوشش کے باوجود مجھ سے پڑھی نہ جا سکی۔

''مبارک ہو، وسیم جعفر صاحب، آپ کی تلاش کامیاب ہوئی،'' میں نے بڑے جوش سے کہا۔ ''لیکن... لیکن یہ تصویر... یہ تصویر کیا انھیں بکسوں میں ملی جن کا ذکر آپ فرما رہے تھے؟ اگر ایسا ہے تو... تو آپ اسے لائبریری سے نکال کیونکر لائے؟''

''جی ہاں۔'' انھوں نے ''جی'' پر زور دے کر کہا۔ ''میں اسے نکال لایا۔ اور اب یہ میری ہے۔'' ان کے لہجے میں مبارزطلبی تھی، گویا مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ ہمت ہو تو میری شکایت کر دو، یہ تصویر مجھ سے چھنوا لو۔

''مگر... مگر بھلا کیسے یہ ممکن ہو سکا، یہ تو بتائیں۔'' میں نے حلیمی سے کہا۔ میں انھیں خفا نہ کرنا چاہتا تھا، اور یوں بھی مجھے اس معاملے میں کوئی داروغۂ اخلاق بننے کا شوق تو تھا نہیں۔ تصویر پر اصل حق تو وسیم جعفر ہی کا تھا، قانون کچھ کہے۔

''بات یہ ہے خلیل اصغر صاحب،'' انھوں نے کچھ رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''اس تصویر کا کہیں

اندراج نہیں ہے۔ آپ کو میں بتا ہی چکا ہوں کہ ان بکسوں کا کیٹلاگ اب تک نہیں بنا ہے، صرف کچی فہرست ہر بکس کے اندر رکھی ہوئی ہے، لیکن یہ تصویر اس فہرست میں درج نہیں۔ ہر فہرست کی نقل لائبریری کے ڈائرکٹر کے قبضے میں مہر بند بھی رکھی ہوئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ فہرست بھی اس تصویر کے ذکر سے خالی ہو گی۔''

وہ کچھ دیر کو چپ ہو گئے، میں ڈر کے مارے کچھ نہ بولا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر وسیم صاحب نے کچھ اور بھی آہستہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

''دراصل یہ تصویر میرزا فخرو صاحب کے روزنامچے میں دو ورقوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی، اسی حالت میں جیسی آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ میں شاید پہلا شخص ہوں جس نے اس روزنامچے کے سارے ورق کھول کر دیکھے ہیں۔ جب یہ تصویر مجھے ملی تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ وزیر خانم کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ لیکن میں اور وزیر خانم کی تصویر! ایسا میرا نصیبہ کہاں؟''

وہ پھر چپ ہو گئے۔ میں بھی اسی طرح خاموش رہا۔ اس وقت ان کا عالم ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے بیچ میں بولنے کی کچھ بات سوجھتی نہ تھی۔

''بڑی دیر تک تو میں نے کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہ کی۔ خدا معلوم یہ تصویر ان کی نہ ہو، کسی اور کی ہو۔'' بالآخر انھوں نے سلسلۂ کلام پھر جاری کیا۔ ''پھر میں نے آنکھیں بند کر کے اس کاغذ کو کئی بار الٹا پلٹا، اور پھر آنکھیں کھول دیں... وہ عبارت آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب آگے کیا کہوں۔ تصویر کو میں نے بے سوچے سمجھے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ آپ جانتے ہی ہیں لائبریری میں بریف کیس، بیگ، پیکٹ، کچھ بھی لے جانا ممنوع ہے۔ سردیوں کے اوور کوٹ تو رواج اور قاعدے کے مطابق اتار کر کلوک روم میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصویر چھوٹی سی ہے، اور مجھ پر کوئی شک بھی نہ کر سکتا تھا۔ بس میں نے اتنا کیا کہ اس دن اور کچھ کام نہ کیا، سب کاغذات سمیٹ کر لائبریری کے عملے کو واپس کیے اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے چلتا ہوا لائبریری کے باہر ہو گیا۔''

''حق بہ حقدار رسید۔'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا، گویا انھیں شک ہو کہ میں ان کا تمسخر کر رہا ہوں۔

''کیا واقعی؟ کیا واقعی آپ کا یہی خیال ہے؟'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولے۔

چونکہ مجھے اپنے دل میں پوری طرح اطمینان تھا کہ اخلاقی طور پر اس تصویر کے مالک وہی

تھے، میں نے ذرا جوش سے جواب دیا:

"جی بالکل۔ مجھے اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ خدا مبارک کرے۔"

انھوں نے دوبارہ مجھے غور سے دیکھا، لیکن اس بار انداز یہ تھا کہ مجھے متنبہ کر رہے ہوں کہ انھیں میری رائے کی چنداں پروا نہیں۔ تصویر تو انھیں کی تھی اور انھیں کی رہے گی۔

"اچھا اب لیجیے، دیوانِ ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد ملاحظہ کیجیے۔" انھوں نے ایک پرانی سی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے اب بھوک لگ رہی تھی اور تصویر کی دریافت اور صاحب تصویر کی کرشمہ جاتی شخصیت نے میرے حواس بھی کچھ زائل کر رکھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے احمقوں کی طرح منھ پھاڑ کر انھیں دیکھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ انھوں نے ابھی، کچھ پہلے بھی دیوان ذوق اور وزیر خانم کی تصویر کا ذکر کیا تھا۔ میں ہاتھ بڑھا کر کتاب ان سے لے لینے کے لیے اٹھا تو انھوں نے کہا:

"صفحہ ۱۴۱ ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے وہاں ورق نشان رکھ دیا ہے۔"

میں نے وہ صفحہ کھولا اور بڑھتی ہوئی نفرت، کراہیت اور استعجاب کے ساتھ یہ عبارت پڑھی:

"شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر میں باکمال تھیں۔ عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴۔۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہو گئے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچے سے نکالی، اسے دیکھا اور کہا کہ استاد اسے ذرا دیکھیے۔ استاد سمجھ گئے کہ اسی کی تصویر ہے۔ دیکھ کر کہا، بہت خوب۔ مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی۔ پھر کہا دیکھیے تو سہی۔ اگر واقعی معشوق ہو تو کیسا ہو۔ استاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے۔ چاہتا ہے میں بھی بڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! ان سے پھر بھی رہا نہ گیا۔ تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا بھلا استاد اس حسن میں کچھ نقص تو بتایئے۔ استاد نے دیکھا اور کہا ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ استاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا لڑکا ہے اور ایک بیسوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔"

میرے جی میں آئی، ورق کو کتاب سے چیر کر مٹھی میں مسل ڈالوں اور اسے غسل خانے کے فلش میں بہا دوں۔ لیکن ظاہر ہے یہ بے وقوفی اور بدمذاقی ہوتی۔

"میں ماننے کو تیار نہیں۔ مغل شاہزادہ، وہ بھی ولی عہد، ہزار گئی گذری حالت پر بھی اس قدر بے حیا نہیں ہو سکتا۔" میں نے گرم لہجے میں کہا۔ "بادشاہوں کی غیرت یہ بات گوارا ہی نہ کر سکتی تھی

کہ ان کی عورتوں کو کوئی نامحرم شہزادہ بھی دیکھ لے، کجا کہ ایک معمولی ملازم، چاہے وہ شاعری میں ان کا استاد ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر متانت اور تمکین بھی کوئی شے ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مولانا نے داغ یا مرزا فخرو سے کوئی دشمنی نکالی ہے۔"

"میں اس کو خارج از امکان نہیں قرار دیتا، خاص کر جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ واقعہ یا لطیفہ بالکل بے محل اور بے موقع درج کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر ولی عہد نے دلالوں کی طرح وہ تصویر دکھا کر صاحب تصویر کے حسن کی داد چاہی بھی تو شیخ ذوق کی یہ ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسا رکیک اور سوقیانہ جواب دیں۔"

"لیکن مولانا کو پرخاش کیوں ہوگی، بھلا کوئی بات بھی تو ہو۔"

"پتہ نہیں۔" وسیم جعفر نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ نے شاید غور کیا ہو مولانا نے بادشاہ اور اصحاب حویلی کے خلاف اور بھی کئی باتیں کئی جگہ لکھی ہیں۔ شاید اس زمانے کی تاریخ نگاری کا فیشن یہی رہا ہو۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ حویلی والے سب تھے ہی ایسے زوال آمادہ اور بے غیرت کہ ان کی تاراجی ہی بہتر تھی۔"

"ہاں پھر تو فیشن ہی بن گیا۔ نیاز صاحب نے داغ صاحب کے بارے میں جو لکھا سو لکھا لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی ارباب قلعہ کے ساتھ پوری طرح انصاف نہ کیا۔"

"خیر، پھر بھی ان کا انداز غنیمت تھا۔ یہاں مولانا کو دیکھئے، میرزا فخرو بہادر کو "لڑکا" بنا رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان کی عمر ۲۴ یا ۲۵ کی ہوگی اور وزیر خانم "بڑھیا" تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا فتح الملک بہادر اور وزیر خانم کی عمریں برابر ہی برابر رہی ہوں گی۔ شاہزادہ ۱۸۱۱ میں پیدا ہوا تھا اور وزیر خانم کی بھی پیدائش کچھ اسی زمانے کی ہے، ممکن ہے وہ شاہزادے سے چار چھ مہینے چھوٹی ہی رہی ہوں۔"

"بہر حال۔ چلیے اب یہ تصویر تو آپ کے قبضے میں آ گئی۔ یہ بڑی کامیابی ہے لیکن افسوس کی آپ اس کے بارے میں کچھ لکھ نہیں سکتے۔"

"کیوں نہیں لکھ سکتا؟ میں کبھی نہ کبھی اس موضوع پر کچھ لکھوں گا ضرور۔ آپ دیکھئے گا۔"

اس گفتگو کے کچھ دن بعد میں ہندوستان واپس آ گیا۔ وسیم جعفر کے علی الرغم مجھے اپنے مقصد میں کچھ بھی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ برہان پور کے فاروقی اور گورکھ پور کے خدائی جی دونوں ہی اپنی کہانی مجھ منکشف کرنے سے گریزاں رہے۔ اس ناکامی اور مایوسی کو تو میں نے کم و بیش بھلا ہی دیا

لیکن وزیر خانم کی تصویر کو میں نہ بھول سکا۔ مجھے افسوس رہا کہ میں مورخ یا ناول نگار ہوتا تو محبت، فن، اور زندگی کی تلاش کی داستان میں ضرور لکھتا۔

کوئی تین چار مہینے اور گذرے تھے جب مجھے مارٹن اینڈ مارٹن (Martin and Martin) نام کی ایک قانونی فرم کے پارٹنر مسٹر ڈگلس ایبرنتھی (Douglas Abernethy) کے خط کے ساتھ ایک لفافہ، اور کوئی پچاس اوراق پر مشتمل ایک پیکٹ ملا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ ''ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے رنج ہے کہ ہمارے ایک قدیمی موکل ڈاکٹر وسیم جعفر، پی۔ ایچ۔ ڈی۔، الیف۔ آر۔ ایچ۔ ایس۔، وغیرہ، ساکن ۱۴ / ۴۲، پورٹو بیلو روڈ، لندن، کا گذشتہ ۱۹ ستمبر کو لندن میں انتقال ہو گیا۔ انھیں پھیپھڑے کا سرطان تھا۔ مرض کا مقابلہ انھوں نے آخری وقت تک نہایت پامردی سے کیا، لیکن سرطان آہستہ آہستہ ان کے سارے بدن میں سرایت کر گیا تھا۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں ہدایت کی تھی کہ منسلک کاغذات اور سر بہ مہر لفافہ ان کی وفات کے بعد آپ کی خدمت میں ارسال کر دیے جائیں۔ متوفی کی ہدایت یہ بھی تھی کہ اگر آپ منسلک کاغذات پر مبنی کوئی تاریخ مرتب کرنا چاہیں تو تحقیق اور دیگر اخراجات کے لیے ان کے ترکے سے ایک ہزار پونڈ کی رقم آپ کو پیش کر دی جائے۔ علاوہ ازیں، ڈاکٹر جعفر کی تمام کتابیں اور کاغذات برٹش لائبریری میں محفوظ ہیں اور ان کی وصیت کے مطابق ان میں سے کسی بھی کاغذ یا کتاب کی نقل آپ کو موصوف کی جائداد کے خرچ پر مہیا کی جا سکے گی اگر آپ کو ان میں کسی کی ضرورت اپنی تصنیف کے لیے محسوس ہو۔ براہ کرم اس خط اور منسلک کاغذات کی رسید سے مطلع فرمائیں، شکریہ۔''

پیکٹ کو میں نے الگ رکھ کر لفافے کو کھولا۔ اس میں وزیر خانم کی تصویر تھی، ایک کونے میں وسیم جعفر نے باریک لیکن روشن حروف میں اپنے دستخط ثبت کر کے تاریخ بھی درج کر دی تھی۔

کتاب

چھوٹی سی کتاب تھی، بالکل جیسے صفیر بلگرامی کی ''رشحات صفیر''۔ نام کے اعتبار سے تو ''رشحات صفیر'' مجموعۂ اشعار لگتی ہے، لیکن ہے یہ دراصل تذکیر و تانیث کا لغت۔ اردو میں تذکیر و تانیث کے انتشار کے باوجود صفیر نے اس کتاب میں اردو مذکر مونث کے قاعدے بھی بیان کرنے یا

وضع کرنے کا جو کھم اٹھایا تھا۔ کتاب اس اعتبار سے ناکام رہی تو کیا ہوا، اور ہر طرح سے تو کار آمد تھی۔ ''رشحات صفیر'' مطبع نور الانوار، آرہ سے ۱۸۷۶ میں چھپی تھی، پھر کبھی نہ چھپی اور اس کے نسخے اب اس قدر کمیاب تھے کہ النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے تھے۔ میں اس سے بہت کام نہیں لیتا لیکن اسے عزیز بہت رکھتا ہوں۔ دو ڈھائی سو صفحے، گدلا کاغذ، گندی چھپائی لیکن جلی اور روشن کتابت۔ بہت موٹی دفتی کی جلد جس پر چمڑا مڑھا ہوا۔ پچھلے مالک نے کتاب کو شاید احتیاط سے نہ رکھا تھا۔ دفتی دونوں طرف ٹیڑھی ہو گئی تھی، جلد کی سنہری جدول اتنی دھندلی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ چمڑا جہاں جہاں سے سوکھ کر ترخ گیا تھا، بادامی گتہ اس کے نیچے صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں جب بھی کوئی لفظ دیکھنے کے لیے ''رشحات صفیر'' کھولتا تو چمڑے پر ہلکی سی کریم یا زیتون کا تیل ضرور پھیر دیتا، کہ چمڑا کچھ نرم ہو جائے اور اس میں مزید دراریں نہ پڑیں۔ یورپ اور امریکا والے ایسے کاموں کے لیے برفانی لومڑی (Mink) کے تیل کی بنی گاڑھی پالش استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بے گناہ جانوروں کی جان لے کر اپنا الو سیدھا کرنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہاں اگر کوئی دوسرا چارہ ہی نہ ہو تو اور بات ہے۔

گتے کی خاکی اور چمڑے کی کتھئی بھوری رنگت اب تطاول ایام اور میری ہلکی روغن آمیزیوں کے باعث کچھ سیاہ پڑ گئی تھی۔ اس سبب سے وہ کتاب، میرا مطلب ہے ''رشحات صفیر''، کچھ اور بھی پرانی لگنے لگی تھی۔

مگر یہ کتاب تھی کیا، اور کس کی تھی، کون اسے لا کر میرے پلنگ پر رکھ گیا تھا، یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے اسے چھوا تو گرم گرم سی لگی، جیسے ابھی ابھی کسی نے دھوپ یا آگ کے پاس سے اٹھالی ہو۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو کچھ رکاوٹ کا سا دھوکا ہوا، گویا دفتی کی جلد نیچے کے کاغذوں کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہو۔ جلد پر کوئی نام تھا نہیں، اور پشتہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن نہ بھی ٹوٹا ہوتا تو یہ صاف ظاہر تھا کہ اس پر مصنف، یا مالک، یا تصنیف کے بارے میں کچھ نہ لکھا تھا۔ یہ کتاب مخطوطہ ہے کہ مطبوعہ؟ عمر کے لحاظ سے تو بہت قدیم نہ معلوم ہوتی تھی، رہی ہو گی یہی کوئی سوا ڈیڑھ سو برس کی۔ لیکن اتنی عمر کی بھی کتاب قیمتی، بلکہ بے حد قیمتی ہو سکتی تھی۔ کہیں کوئی بالکل نایاب شے نہ ہو۔ مثلاً میر کے مکاتیب، یا بہادر شاہ ظفر کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان؟ مجھے جھر جھری سی آ گئی۔ لیکن زور لگا کر کتاب کو کھولوں اور ورق واقعی باہم چپکے ہوئے ہیں تو سب ضائع ہو جائے گا۔ تو پھر کیا؟ میں نے کچھ جھنجھلاہٹ اور کچھ بے صبری سے اپنے دل میں کہا۔ ضائع ہو جائے کم بخت ضائع ہو جائے۔

اب بھی یہ میرے یا کسی کے کون کام کی ہے۔ نہ کھلے گی تو بند ہی تو رہے گی۔

میں نے اس بار ذرا زور سے کتاب پر ہاتھ مارا... ہلکی سی حرارت ویسی ہی تھی۔ حرارت؟ یہ کیا فضول اوہام ہیں؟ حرارت کا لفظ تو عام طور پر ہلکے جسمانی بخار کے لیے انسانوں کی ضمن میں برتتے ہیں۔ یہ کتاب اگر کہیں سے گرم گرم آئی بھی ہوگی ... (کیا مطلب؟ گرم گرم آئی ہوگی کا کیا مطلب؟ کیا یہ کتاب نہیں کباب ہے؟) تو بھی اب تک تو ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔ آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر کیا خبر اس مقام تک آتے آتے کس کس نے اس کتاب کو پڑھا اور برتا ہے۔ اور کیا ضرور ہے کہ اردو ہی کی کتاب ہو؟ فارسی عربی عبرانی کچھ ہو سکتی ہے۔ ہاں انگریزی سنسکرت تو ہے نہیں کہ وہ بائیں طرف سے کھلتی... لیکن جب تک کھلے نہ مجھے کیسے معلوم ہو یہ کتاب بائیں سے کھلتی ہے کہ دائیں سے کھلتی ہے۔

میں نے ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے کتاب کو کہیں بیچ سے کھولنا چاہا۔ ورق کچھ بھاری بھاری لگے، لیکن سب کے سب باہم چپکے نہ تھے۔ بھاری یوں جیسے بہت دیر تک پانی میں تر رکھے گئے ہوں اور پھر سائے میں خشک کیے ہوں۔ عبدالرحمٰن چغتائی جن کاغذوں پر تصویر بناتے تھے ان کے ساتھ پہلے یہی سلوک وہ کرتے تھے۔ لیکن وہ تو کاغذ ہی خاص طرح کا ہوتا تھا اور اس پر وہ کچھ مسالے اور انڈے کی سفیدی، کچھ ہلکا السی کا تیل بھی لگا کر اسے پانی بلکہ بارش میں ڈلوا دیتے تھے۔ تو ایسے کاغذ پر یہ کتاب لکھی گئی تھی؟ پھر تو شاید بہت پرانی نہ ہوگی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ کاغذ کچھ پھولے پھولے سے تھے گویا پانی میں ارادتاً ڈبائے اور خشک نہ کیے گئے ہوں، بلکہ کسی حادثے کی بنا پر دیر تک آب زدہ رہے ہو۔ شاید کسی بگڑے دل رئیس نے پڑھتے پڑھتے کسی بات پر الجھ کر یا اکتا کر اسے گہرے حوض میں پھینک دیا ہو۔ پھر بعد میں افسوس کر کے انھوں نے شاید اسے نکلوا لیا ہو، یا کوئی اور ہی لے بھاگا ہو۔ (سنا ہے ولی دکنی کے کسی حریف نے ان کا بھی دیوان اچانک اٹھا کر ندی میں جھونک دیا تھا...)

میر سوز کے بھی تو اوراق اشعار میر نے شاید ان کے ہاتھ سے لے کر آصف الدولہ کی عین موجودگی میں حوض میں ڈبو دیے تھے؟ میرا دل ایک بانس اچھلا۔ ولی نہ سہی میر سوز سہی۔ میر سوز نے بعد میں چپکے سے میر کی آنکھ بچا کر وہ اوراق نکال کر سکھا صاف کر کے مجلد کرا لیے ہوں گے۔ کیا عمدہ دریافت ہوگی! مگر یہ کہانی بھی سراسر فرضی ہے۔ اچھا فرضی سہی لیکن اس کتاب کے اوراق بہر حال ایک دو غسل کر چکے تھے اور دیر دیر تک بھیگے رہے تھے۔

میں نے اس بار دفتی کو اٹھا کر اور قریب سے دیکھنا چاہا کہ شاید اب سوکھ گئی ہو اور پوستین الگ دکھائی دے جائے...دفتی بڑی آہستگی سے کھل گئی۔ مجھے خیال بھی نہ رہا کہ اب تک میں اس وہم یا کشاکش یا اضطراب میں تھا کہ دفتی اور پوستین اور ورق سب آپس میں چپک کر ٹھوس چوکھٹی لوح نہ بن گئے ہوں۔

جلد کھلی تو ایک مری ہوئی ننھی منی روپا مچھلی جلد کے موڑ اور پوستین کے درمیان پڑی نظر آئی۔ لو اچمن کی بچاری نگہبان اور گلچیں جو بھی تھی اس کو بھی موت آگئی! لیکن ہوا لگتے ہی اس میں تھوڑی بہت حرکت ہوئی...(ہوا لگتے ہی؟ سنا تو گیا ہے کہ کتاب کو ہوا لگتی رہے تو روپا مچھلی مر جاتی ہے، پنپ نہیں سکتی؟) اور وہ دھیرے دھیرے سرک کر (پھسل کر؟) پوستین کے پیچھے چلی گئی۔

پوستین کتھئی پیلی سانپ کی کھال جیسے رنگ اور قماش کے موٹے کاغذ کی تھی جو اب سے کوئی سوا ڈیڑھ سو برس پہلے مقبول تھا۔ اسے کلکتے میں انگریزی کتابوں کے جلد سازوں نے ولایت سے منگا کر عام کیا تھا۔ گہرے رنگوں کے باعث اس پر کچھ لکھا بھی ہوتا تو پڑھا نہ جاتا اور کاغذ جگہ جگہ سے شکستہ الگ تھا۔ (اس کاغذ میں خرابی یہ تھی کہ یہ ٹوٹتا بہت جلد تھا۔ اس میں لچک نہ تھی۔) جلد کی داب کے ساتھ کئی جگہ تو ٹوٹ ہی چکا تھا، اور خود پوستینی ورق پر بھی دراریں پڑ رہی تھیں۔ (روپا مچھلی انھیں میں سے ایک درار کے پیچھے جا چھپی تھی۔ نہیں، شاید سرک کر یا پھسل کر جا رہی تھی... بھلا مرا ہوا کیڑا چل کہاں سکتا ہے۔) سلائی اگرچہ فی الحال محفوظ معلوم ہوتی تھی لیکن اندرونی پشتہ بھی اب سلائی سے الگ ہو رہا تھا۔ جڑائی لئی یا گوند کی نہیں، سریش کی تھی۔ اس کی بد بو مدت ہوئی اڑ چکی تھی لیکن خود سریش کی تہ گدلے شیشے کی طرح جگہ جگہ سلائی اور پشتے سے چپکی ہوئی تھی۔ چلو خیر سلائی ٹوٹی نہیں ہے اور جز سب الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر سامنے سے نہ کھل سکی تو کوئی ماہر جلد ساز اسے پشتے کی طرف سے کھول ہی لے گا۔

میں نے پوستین کا ورق پلٹا۔ جس طرح کے کاغذ کی یہ پوستین تھی اس کی دوسری طرف کاغذ عموماً بالکل سادہ ہوتا تھا، یعنی اس میں رنگ تو ہوتا تھا، لیکن ایک ہی رنگ، لہٰذا اس پر کچھ لکھنا چاہیں تو لکھ سکتے تھے، بس بھاری قلم یا بہت روشن سیاہی درکار ہوتی تھی۔ لیکن یہاں بھی کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ اگلا ورق کتاب کا پہلا صفحہ تھا لیکن خالی۔ لاحول ولا قوۃ، کوئی کچھ اپنا نام، دستخط، مہر، تاریخ، کچھ تو چھوڑ گیا ہوتا۔ سو رنگ ہے خرابی پر کچھ تو رہ گیا ہے کے مصداق کچھ تو مجھ تک پہنچ جاتا۔ میں تو حتی الامکان اپنی ہر کتاب پر اپنا نام ضرور لکھتا ہوں، اور اگر پرانی کتاب ہو تو اس پر کچھ کتاب کی

تفصیلات کا حاشیہ بھی چڑھاتا ہوں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کہیں پوری کتاب ہی اسی طرح سادہ ورق نہ ہو۔ میں نے دل میں کہا، چلو چھوڑو، کتاب کو (اگر یہ واقعی کتاب ہے) اٹھا کر پرے کرو۔ صبح دیکھیں گے۔

میں کتاب کو سرہانے کی طرف تکیے کے نیچے کھسکانے جا ہی رہا تھا دفعتہً مجھے اپنی گردن کی پشت پر روئیں کھڑے ہوتے ہوئے لگے۔ جیسے کوئی میرے پیچھے ہے اور جھک کر کتاب کو پڑھنے یا پہچاننے کی کوشش میں ہے اور اس کی سانس میری گردن کے اطراف میں ہے۔ اس اکیلے گھر میں کون... پیچھے گردن گھمانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، اور یوں بھی میری گردن ذرا اکڑی ہوئی سی ہے (ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگ گردن جلا پر عمل کرنے کی ہمت نہیں)، میں التہاب و وجع مہرات (spondylitis) کا پرانا مریض ہوں، سر کسو سے فرو نہیں آتا کا رتبہ خود بخود حاصل ہو گیا ہے۔ قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ خیر گردن کو کسی نہ کسی طرح دھیرے دھیرے کر کے ایک حد تک موڑ لیتا لیکن اصل معاملہ تو بکھری ہوئی ہمت کو مجتمع کرنے کا تھا۔ سانس کی تو آواز بھی اب صاف سنائی دے رہی تھی، کتاب یوں ہی کھلی ہوئی تھی۔

اچانک اپنے ہی آپ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کتاب بند ہو گئی۔ میں ابھی ٹھیک سے چونک بھی نہ پایا تھا کہ کتاب پھر کھلی اور کسی نے سرگوشی کے لہجے میں، لیکن بالکل صاف صاف ہر حرف کو ادا کرتے ہوئے کچھ کہا۔ مگر کیا کہا، یہ میں نہ سمجھ سکا۔ خدا معلوم اردو تھی یا پشتو یا ترکی، میرے لیے سب برابر تھیں۔ میں نے ہمت پھر مجتمع کرنی چاہی کہ دیکھوں تو سہی کیا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن اچانک کتاب کے کھلے ورق پر ایک نارنجی شنجرفی لہر لرزاں لرزاں گذر گئی۔ نہیں میں شاید بھولتا ہوں لرزاں تو وہ بالکل نہ تھی۔ وہ تو اس طرح گذری تھی جیسے جاندار ہو، بل کھاتی ہوئی، قمقمے کی چوڑی کی طرح لیکن ورق اب بھی خالی تھا... پھر کچھ ایسا لگا کہ خالی تو نہیں تھا۔ کبھی اس پر کچھ لکھا ہوا ہو گا جسے کسی بے درد نے بہت آہستہ آہستہ رگڑ کر مٹا دیا تھا۔ آتشی شیشہ اٹھاؤں، کم بخت کو اسی دراز میں تو رکھتا ہوں لیکن دراز کہاں، میں تو پلنگ پر دراز ہوں۔ میں نے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ذرا سا سوراخ بنایا اور ایک طرف سے مٹھی کو کچھ زیادہ کھلا چھوڑے رکھا جس طرح بچپن میں دور بین خورد بین کا کھیل کھیلتا تھا۔ یعنی کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے میں مٹھی کو خورد بین فرض کرتا، مٹھی بند کر کے ایک آنکھ میچ کر نیم وا مٹھی کو ایک آنکھ سے لگاتا، اس طرح کہ باریک سوراخ والا سرا دوسری طرف ہوتا۔ پھر باریک سوراخ سے گذار کر تار نگاہ شاید زیادہ روشن اور شوخ ہو جایا کرتا تھا اور مہین

لکھی ہوئی عبارت کا ایک دو لفظ مجھے پہلے سے زیادہ صاف دکھائی دینے لگ جاتا تھا۔

لیکن اب تو مجھے آنکھ کی حقیقت سب معلوم ہے۔ یہ تار نگاہ وار نگاہ فضول توہماتی تشکیلات ہیں۔ روشنی آنکھ سے نہیں نکلتی، آنکھ کے اندر آتی ہے تو دکھائی دیتا ہے۔ ابن الہیثم نے یہ بات ہزار برس پہلے بتادی تھی۔ لوگوں کو یقین تب آیا جب اسے انگریزی کتابوں میں ثابت کیا گیا۔ لیکن مٹھی کی لمبائی ایک طرح کی طوالت عدسہ (Focal length) بھی تو بناتی ہے، میرے ضدی ذہن نے کہا۔ اور اس سے آنکھ کی بصارت پذیری بڑھ جاتی ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ڈاکٹر سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرایا تھا تو اس نے ایک سیاہ ٹکیہ میری آنکھ پر رکھی تھی۔ ٹکیے میں صرف ایک مہین سا سوراخ تھا۔ میری کمزور آنکھ پر بھی اس نے وہ ٹکیہ رکھی تو اس باریک جوف سے مجھے بہت سے حرف صاف صاف نظر آگئے جو عام طور پر میرے لیے ناخوانا تھے۔ میں بہت خوش ہوا کہ میری نیم کور آنکھ ٹھیک ہو رہی ہے، لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ یہ کچھ خاص امید افزا بات نہیں، دلچسپ ضرور ہے۔ اسے Pinhole effect کہتے ہیں۔ تو میں اسی Pinhole effect کو کیوں نہ کام میں لاؤں، محدب شیشہ نہیں ہے نہ سہی۔

ہوگا، Pinhole effect ہی ہوگا، لیکن میرا تو ہاتھ کانپ رہا تھا، مٹھی بندھ ہی نہ رہی تھی اب تو بدن میں بھی ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی پیچھے کوئی تھا زیر لب مسکرا رہا تھا چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے مجھ سے کسی نے کہا خوشی سے وہ چہرہ کھلا جارہا ہے خوف کے مارے میرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا پیچھے مڑ کر دیکھا نہیں نہ دیکھ سکتا ہوں نہ واقعی کوئی چہرہ یا کوئی ہستی میرے شانے کی اوٹ سے کتاب کو یا کتاب کو دیکھنے کی میری کوشش کو دیکھنے میں محو ہے اور کوئی ہے بھی نہیں اور کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا اور کوئی گل گل شگفتہ بھی ہو رہا ہے اور میں... میرے سر و گردن کی پشت پر کسی سانس کا لمس اور سرگوشی اکیلا گھر کسے آواز دوں کہ برائے خدا مجھے اس عذاب سے یہ کتاب ہے کہ کوئی لوح طلسم؟ لوح طلسم پر تو کچھ لکھا ہوتا ہے جسے طلسم کشا ہی پڑھ سکتا ہے۔ پسینے کی ایک بوند میرے ماتھے سے پھسل کر داہنی آنکھ میں آرہی۔ بائیں تو بہت کمزور ہے، دائیں آنکھ سے ہی سارے باریک کام کرتا ہوں۔ اضطراراً میرا ہاتھ اٹھا کہ پسینہ خشک کروں۔ ''کھل جائے گی۔'' کسی نے کہا۔ گھبراہٹ میں میرا ہاتھ مٹھی کی طرح آپ ہی آپ بھنچ گیا اور زور سے میری آنکھ پر اس طرح لگا جیسے کسی نے جبراً اسے ہلکے ہتھوڑے کی طرح میری چشم و ابرو پر کھٹاک سے ٹھونک دیا ہو۔

مٹھی کے سرے پر باریک سوراخ ننھی سی سوئی کی طرح، سنہرے پکھراج کی کنی سا جگمگا رہا

تھا اور کتاب کے پہلے ورق پر، جہاں حاشیہ ہوتا ہے، اگر اس صفحے پر حاشیہ ہوتا، اسی سنہری پکھراجی روشنائی میں کچھ لکھا ہوا تھا لیکن مٹا مٹا سا۔ میں نے آنکھ کو خوب بھینچ کر اسے مٹھی کے باریک سوراخ سے پیوست کرنا چاہا۔ ''کھل جائے گی تو سن سکو گے۔'' کسی نے کچھ اس طرح کہا گویا آواز میرے کان میں نہیں ریڑھ کی ہڈی میں سمو گئی ہو۔ پسینے کی نئی بوندیں ماتھے اور آنکھ سے ہو کر مٹھی کو تر کر رہی تھیں جیسے آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے ہوں، دکھائی کیا دیتا۔

میں نے کچھ سراسیمگی کچھ برہمی کے عالم میں کتاب کو پھر پرے ہٹانا چاہا...تو وہ ہٹی ہی نہیں۔ پتھر بن گئی۔ میں نے کچھ زیادہ زور لگانے کی ہمت کی ہی تھی، ہاتھ ابھی بڑھایا بھی نہ تھا کہ لو وہ کتاب تو آپ ہی آپ کسی ورق پر کھل گئی، جیسے ہوا کے کسی غیر محسوس جھونکے نے اپنا کام دکھایا ہو۔ کچھ لکھا ہوا تھا۔ فارسی تھی کہ اردو، پتہ نہ چل رہا تھا۔ سارا ورق دونوں طرف سے کرم خوردہ، شاید ہی کوئی سطر سوراخ سے خالی ہو۔ مجھے غصے اور خوف اور مایوسی سے رونا آنے لگا ہے لیکن آنکھ میں تو آنسو نہیں پانی کی دھند ہے۔ یہ پانی کہاں سے آیا؟ وہی، جو کتاب کے اوراق میں تھا اور کہاں سے۔ وہ پہلا ورق آہستہ آہستہ اپنے زور پر اٹھا، اپنی قوت سے پلٹا، کتاب ٹھیک سے کھلنے والی ہے شاید۔ دوسرے ورق پر پیشانی کے بائیں جانب کچھ پڑھنے میں آنے لگا تھا۔

کوئی شعر معلوم ہوتا تھا، لیکن اکثر حرف طعمۂ دیداں ہو چکے تھے۔ میں نے مٹھی کے سوراخ سے اور پھر مٹھی کھول کر ورق کو ممکن حد تک آنکھوں کے نزدیک لاکر پڑھنے کی کوشش کی۔ بے ...ہجر...در مرگ...آں نیست...شبے ...افسانہ بگذرد۔ کس کا شعر ہے؟ یہ شعر تو پڑھا ہوا ہے، سینکڑوں بار کا دل ہی دل میں دہرایا ہوا۔ بارہا اس کی کیفیت اور اسرار پر وجد کر چکا ہوں۔ بابا...بابا؟ طاہر عریاں؟ نہیں یہ ان کی زبان نہیں۔ بابا...بابا...بابا فغانی گیلانی؟ نہیں اس نام کا کوئی شاعر نہیں گذرا۔ نصیری گیلانی، ہاں بابا نصیری گیلانی۔ اور پھر پورا شعر میں نے پڑھ لیا، یا یاد آ گیا اور میں نے سمجھا کہ ورق پر پڑھ لیا ہے

بے خوابیم ز ہجر در مرگ می زند
ایں نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد

وہی پکھراجی سنہری روشنائی بہت مٹی مٹی سی لیکن ایک زرد بہار تھی کہ ان حرفوں سے پھٹی پڑتی تھی۔ کیسی کششیں ہیں اور کیسے جوڑ۔ صرف ایک دو دائرے اور نہ جانے کتنی کششیں۔ مرگ، نیست، شبے، اور بے خوابیم کو بھی یوں لکھا تھا کہ ''بے'' اور ''خوابیم'' میں بھی کشش ڈال دی تھی۔ اور علم

کی طرح دل میں کھبتے ہوئے ''این'' اور ''آں''، اور ''افسانہ'' کے الف۔ این نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد کیا پر اسرار بات ہے اور اس موقعے پر تو اور بھی رمزناک معلوم ہوتی ہے۔ یہ رات ایسی رات نہیں کہ کہانی کی طرح گذر جائے یا کہانی کہانی اسے گذار دے ختم کر دے۔ ''سنو گے تو کہوں۔'' کوئی پھر بولا ہے۔ خدا معلوم کوئی جنات ہے کیا ہے۔ میرے جسم و جان کا جنگل اس آواز کو سن کر تھرا اٹھا ہے۔ ساکت گمبھیر فرش شب کے اوپر لمبے قدموں سے کون گذرا ہے ابھی؟ لیکن کون مجھے سنائے گا، اور کیا سنائے گا؟ کون ہے جو مجھ سے کہہ رہا ہے ''سنو گے تو کہوں۔'' کیا سنوں؟ کیوں سنوں؟ ہجوم سادہ لوحی نے گوش ہوش میں خروش بے معنی کا کف بھر دیا ہے کتاب بند ہو گئی۔

مجھے اپنے ہاتھ پر اور ہاتھ پر ہی نہیں، بدن پر قابو نہیں رہ گیا۔ ہزار چاہتا ہوں کہ جی کو مضبوط کروں، آنکھیں بھینچ لوں۔ انھیں دیر تک بند رکھوں۔ پھر گوشہء چشم سے بہت دھیرے دھیرے دیکھوں کہ کتاب اب بھی وہیں ہے کہ نہیں۔ میرے پیچھے والے [والی؟] کی سانسیں اب بھی میری گردن کے باریک روئیں مرتعش کر رہی ہیں کہ نہیں۔ جاتے ہیں کیسے کیسے کمیں چشم وا کرو۔ میر محمد تقی صاحب نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، یا شاید نہیں دیکھا، تو وہاں کھڑکی نہیں باریک شیشے کی دیوار تھی جس پر مخطوطہ لکھا ہوا تھا۔ آر پار کا منظر سب اس مخطوطے میں منقش تھا اور جہاں جہاں جگہ خالی تھی وہاں سے نسیم بھی کبھی تیر سی، کبھی معشوق سی، کبھی مصرع طرح سی چھن کر آجاتی تھی۔ کتاب ہے کہ بہت سی غیر متعلق اشیا سے ترتیب دیا ہوا کوئی منظر؟

لیکن میری آنکھیں تو ابھی بند ہی ہیں، میں نے دل میں کہا۔ میری آنکھیں خوف سے بند ہیں شاید؟ لیکن خوف مجھے اس کتاب سے نہیں، اپنے آپ سے تھا... شعر کے نیچے بھی کچھ لکھا ہوا تھا، حسب معمول مٹا مٹا سا۔ روشنائی وہی افشانی شنگرفی سی، یا شاید لاجوردی سی۔ مگر بھلا لاجوردی پر شنگرفی کا شک کیوں کر گذر سکتا تھا؟ میں نے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں پرانی کتابیں دیکھی اٹھائی اور برتی ہیں۔ خود میرے پاس ایسی کتابوں کی کثرت نہیں تو کمی بھی نہیں۔ ایسا کبھی نہ دیکھا کہ زرد نیلگونی اور سرخی مائل زعفرانی ایک سا معلوم ہو۔ لیکن یہ بھی ہے کہ دہلی کے پرانے مصوروں اور خطاطوں کے خاص رنگ چار تھے: سفید، سنہرا، لاجوردی، اور شنجرفی۔ یہ رنگ ہمیشہ گھر کی چہار دیواری میں بڑے راز دارانہ انداز میں تیار ہوتے تھے، کیا مجال کسی کو کسی کے نسخے اور پرچہء ترکیب استعمال کی بھنک پہنچ جائے۔ تو یہ شاید ایسے ہی کسی گھرانے کی خفیہ روشنائی ہو گی جس کے رنگ میں اور بھی رنگوں کی چھوٹ تھی۔

کچھ ''میرزا...'' کے بعد کوئی لفظ تھا، ایک لفظ یا شاید دو لفظ اس کے پہلے۔ میرزا؟ میرزا غالب، میرزا سودا؟ کچھ ''نو...'' سا بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو کیا اسے ''میرزا نوشہ'' پڑھوں؟ کیا یہ غالب کے دستخط تھے؟ میرا دل زور سے دھڑکا۔ لیکن غالب نے خود کو ''میرزا نوشہ'' تو کبھی لکھا نہ تھا، دوسرے لوگ کہتے تھے۔ اور نوشہ...نواب...تو کیا ''میرزا نوشہ'' لکھا ہوا تو ہے لیکن کسی اور کے قلم سے ہے؟

اچانک مجھے بالکل صاف سمجھ میں آ گیا کہ ''نوشہ'' نہیں، ''نواب'' ہے، اور ''میرزا'' کے پہلے ہے۔ ''میرزا'' کے بعد جس لفظ کو میں ''نو...'' گمان کر رہا تھا وہ ''خان'' کے ''خ'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دفعتہً سب آئینہ ہو گیا۔ ''نواب میرزا خان'' لکھا ہوا تھا، اور دستخط کی طرح نہیں، بلکہ گویا کسی نے پہلے بابا نصیری کا شعر لکھا پھر یہ نام لکھا، پھر نیچے کچھ اور لکھا۔ مثلاً ''ملاحظہ نمایند''، یا ''مطالعہ فرمایند''، یا ''عرض دیدہ شد''، یا ''داخل کتاب خانہ شد''، وغیرہ۔ داغ کو لیکن کسی کتاب خانے سے تعلق نہ تھا۔ رام پور میں وہ داروغہ اصطبل مقرر ہوئے تھے جس پر کہتے ہیں بعض لوگوں کو ناگواری ہوئی تھی شہر دہلی سے آیا اک مشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا۔

(کسی نے فرمایا ہے کہ یہ شعر رسا رام پوری کا نہیں ہو سکتا۔ وہ ''پرانے'' آدمی تھے۔ ''اصطبل'' میں موحدہ ساکن ہے، بروزن مفعول۔ وہ موحدہ کو متحرک کر کے ''اصطبل'' کو بروزن فاعلن بھلا کیوں کر لکھ سکتے تھے؟ میں کہتا ہوں کیوں نہ لکھتے؟ ''اصطبل'' کا اردو میں ایک تلفظ تحریک موحدہ بھی ہے۔ اور اگر نہ بھی ہو تو کیا آفت آ گئی۔ عربی میں موحدہ ساکن ہو گی، اردو والے متحرک بولتے ہیں اور ان کے لیے وہی صحیح ہے۔ خیر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ...یہ پرانے آدمی کی بھی خوب کہی۔ پرانے آدمی اردو کے اپنے لوگ تھے عربی فارسی کے غلام نہ تھے جو ''اصطبل'' کو بروزن فاعلن باندھنے کو گدھے کی دولتیاں کھانے کے برابر جانتے۔)

کتاب پھر آپ سے آپ بند ہو گئی۔ معاً ہلکی سی ''چٹ'' کی آواز ہوئی، پھر ایک ورق کہیں اور سے کھلا۔ انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ہاتھ کا لکھا تھا یا کانٹے کے حروف کا چربہ تھا۔ کوئی ماہر خطاط ہی ہو گا جس نے اطالوی کاپر پلیٹ (Italic Copperplate) سے کچھ مشابہ طرز میں سیاہ روشنائی سے آڑے لمبے حروف میں لکھا تھا۔ مارسٹن بلیک (Marston Blake) کا نام صاف پڑھا گیا۔ پھر صفحے کی آخری سطروں میں اور جلی حروف میں یہ عبارت بھی صاف دکھائی دی:

MeerzaFuthoolmoolk Bahadoor Ghoolam Fakhrooddeen Rumz, 1849

اب ہاتھ لگا کر اگلا ورق پلٹا تو بالکل خالی۔ دوسرے ورق پر کچھ لکھا نظر آیا لیکن کھلتا نہ تھا کہ اردو ہے یا فارسی۔ میرا جی الجھنے لگا۔ بھلا یہ کس طرح کی کتاب ہے؟ مطبوعہ ہے کہ مخطوطہ؟ مطبوعہ ہوتی تو صفحے کے صفحے اس عجب ڈھنگ کے نہ ہوتے کہ کوئی خالی ہے، کوئی گھنا لکھا ہوا ہے اتنا کہ پڑھا نہ جائے اور کوئی بہت ہی پاشاں۔ کہیں انگریزی ہے کہیں کچھ اور۔ عجب جناتی چیز ہے، میں نے دل میں کہا۔ اب اسے تکیے کے نیچے محفوظ رکھ دوں سو جاؤں۔ صبح دیکھوں گا۔ لیکن ابھی تو سر شام ہی کا سماں تھا۔ رات بہت دور تھی اور میرے سونے کا وقت ابھی بالکل نہ تھا۔

یہ کتاب نہیں کوئی جناتی کارخانہ ہے۔ بولتی ہے، چپ رہتی ہے، آپھی آپ کھلتی ہے، آپھی آپ بند ہوتی ہے، کبھی ڈراتی ہے، کبھی رجھاتی ہے۔ آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) کی کتاب کا نام The Ghost in the Machine تھا تو اس کتاب کو The Ghost in the Book کا نام دے دوں؟ لیکن کوسلر نے تو اس عنوان کے ذریعہ دیکارت (Descartes) کے نظریے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انسانی جسم ایک ظرف ہے اور روح، یا دماغ، یا قوت تفکر اس کا مظروف۔ یعنی روح اور مادہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ کوسلر کو خوف تھا کہ اگر سائنس یوں ہی زور دکھاتی رہی تو ایک دن وہ مشینوں میں قوت نامیہ کا اصول ڈال دے گی یا دریافت کر لے گی اور میں ...میں تو ان تمام گم شدہ چیزوں کو تلاش کر رہا ہوں...(کہ ہم پرندے مقامات گم شدہ کے ہیں) جنھیں ہم کتابوں میں بند کر کے، اور کتابوں کو کالے نیلے بستوں میں باندھ لپیٹ کر ندی کے اس پار جھاڑی جھنڈیوں میں پھینک آئے تھے کہ ہماری بندشیں ڈھیلی تھیں اور وزن زیادہ اور کمریں خمیدہ۔ اور جب ہم ندی کی سیاہی مائل ریت کے کگاروں پر افتاں و خیزاں نیم تاریکی میں کشتیاں ٹٹول رہے تھے تو وہ بستے ایک ایک کر کے ہماری کمروں سے پھسلتے گئے مگر ہم نے کچھ خیال نہ کیا۔

اے پری خواں یہ پری زادوں کی تسخیر نہیں کتاب میں سے کچھ آواز سی آئی جیسے کوئی گنگنا رہا ہو جیسے شیشے کی صراحی میں پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہو رہا ہو جیسے نہایت ہی نازک چھوٹے سے تانپورے پر کوئی پری سروں کو سدھ کر رہی ہو۔ بڑی دلفریب گونج تھی۔ نغمہ گرا ہے بوند بوند پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج اڑتی پھری ہے ذہن میں گرد خیال ہر طرف۔ پھر اچانک کتاب کا صفحہ روشن ہو گیا، جیسے سنیما کا چھوٹا سا پردہ ہو، میرے گھر میں تو ٹی وی بھی نہیں۔ اور یہ تصویریں تو رنگین ہیں۔ لیکن سنا ہے خواب تو ہمیشہ سفید و سیاہ ہی ہوتے ہیں۔ ہندی والے شویت شیام کہتے ہیں، لفظ خوبصورت ہے لیکن عجب طرح کا تصنع ہے اس پیکر میں جو اس لفظ یا فقرے کے ذریعہ ذہن میں روشن ہوتا ہے۔ لال قلعے کا

لاہوری دروازہ...لیکن یہاں تو چہل پہل کچھ اور طرح کی ہے؟ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے کچھ بے ہنگم سے لوگ، کیلے کھاتے ہوئے، گہری گاڑھی لپ اسٹک اور کچھ اکتائے ہوئے کچھ برہم چہروں والی عورتیں، اسکوٹروں، کاروں اور بسوں کا دھواں اور شور، سڑک کے دونوں طرف دکانیں اور ٹھیلے، پلاسٹک کی تھیلیاں، گول گپے اور چاٹ کے دونے، بدصورت بیمار رنگوں کے پلاسٹک کے گلاس اور آئس کریم کی پیالیاں، یہ سب کچھ نہیں۔ میرے پیچھے جامع مسجد صاف دکھائی دیتی ہے۔کوئی کہتا ہے، آج تو چوک سعد اللہ خاں کی چھب ہی نرالی ہے، حضرت پیر و مرشد ظل سبحانی مینا بازار تشریف لے جائیں گے...پھر کہیں سے ستار پر کھرج میں کسی راگ کی آروہی کے سر گونجتے ہیں...

پا...نی...سا...رے...رے

یہ تو تلک کامود ہے، آروہی میں رکھب کے سر لگ رہے ہیں، گندھارو ذرا سا، لیکن کھرج پورے زور میں۔ کیسی گونجتی ہوئی سی آواز ہے، ستار لگتا ہی نہیں ہے، سرود لگتا ہے۔ خدا جانے مضراب اور صاحب مضراب میں کتنی جان ہوگی، سروں میں پھیلاؤ اور گہرائی اور وزن ہے۔

رے...ما...پا...نی...سا...

اور اب اوروہی...

سا...نی...دھی...پا...ما...گا...رے...گی...سا...

پھر پورا راگ بجنے لگتا ہے:

سا...نی...سا...پا...نی...سا...رے...رے...پا...ما...گی...

نہ بجانے والا نظر آتا ہے نہ اس کی سنگت والے۔ لاہوری دروازے پر رونقیں اور بھی بڑھ گئی ہیں، لیکن کچھ کچھ لوگوں کی چال ذرا مدھم ہے...تلک کامود رات کے دوسرے پہر کا راگ ہے۔ یہ سورٹھ اور دیس سے بہت مشابہ ہے۔ مشاق سازندے یا گویے ہی انھیں الگ الگ کر سکتے ہیں۔اس راگ میں گذرتی ہوئی رات کا درد اور بھولے ہوئے لمحات کی کسک اور آنے والی صبح کا خوف ہے جب شمعیں بجھا دی جائیں گی، جب چراغوں کی لوؤں کے سر قلم ہوں گے۔

انور شعور

O

بے رخی اپنے صنم سے نہیں ہوتی ہم سے
یہ خطا رب کے کرم سے نہیں ہوتی ہم سے

مسکراتی ہوئی نظروں کا اگر ہو کہ نہ ہو
التجا دیدۂ نم سے نہیں ہوتی ہم سے

ہم مسرت سے تدبیہ، شغل بہت کرتے ہیں
بادہ نوشی کسی غم سے نہیں ہوتی ہم سے

کھینچتی ہے ہمیں دنیا ترے خوابوں سے مگر
ہجرت اس باغِ ارم سے نہیں ہوتی ہم سے

ہم عہد و مہر سے پاتے ہیں سفر کی تحریک
حرکت نقشِ قدم سے نہیں ہوتی ہم سے

آزماتے ہیں وہ انداز دگر سے بھی ہمیں
دل لگی صرف ستم سے نہیں ہوتی ہم سے

سختیاں جھیل کے جینے کا مزہ ہے کچھ اور
زندگی ناز و نعم سے نہیں ہوتی ہم سے

کوئی تدبیر کہ ہم رنج و الم سے نکلیں
شدت رنج و الم سے نہیں ہوتی ہم سے

رات ہم صرف زیادہ سے ہوئے تھے بے حال
ایسی لغزش کبھی کم سے نہیں ہوتی ہم سے

اے شعور آپ کی ہر بات کی تائید کریں
کیوں توقع ہے یہ ہم سے، نہیں ہوتی ہم سے

O

آج خالی گلاس ہے میرا
اس لیے دل اداس ہے میرا

فائدہ کیا حرام نوشی سے
جب مقدر ہی پیاس ہے میرا

آئینہ دیکھ کر ہوا احساس
غم گسار ایک پاس ہے میرا

جان لیتا ہے بے کہے سب کچھ
وہ قیافہ شناس ہے میرا

میں نمایاں نہیں ہوں محفل میں
بیش قیمت لباس ہے میرا

جو کہوں میں وہ سن لیا کیجئے
ایک ہی التماس ہے میرا

کچھ نہیں وہ بجز قیاس شعور
اور یہ بھی قیاس ہے میرا

O

مت پوچھ اضطراب مئے ناب کے بغیر
ہر سانس ہے عذاب مئے ناب کے بغیر
اعصاب جاگتے ہیں مئے ناب سے مرے
رہتا ہوں محو خواب مئے ناب کے بغیر
اس ماہ کتنی بار مئے ناب کی ادھار
مشکل ہے یہ حساب مئے ناب کے بغیر
ہوتا ہے ارتکازِ توّجہ تو کیف میں
کیسے پڑھوں کتاب مئے ناب کے بغیر
شب کاٹنے میں لوگ خدا جانے کس طرح
ہوتے ہیں کامیاب مئے ناب کے بغیر
پیسے نہ ہوں تو شام گزرتی ہے اے شعور
بے انتہا خراب مئے ناب کے بغیر

O

اب کسی کام کو دل نہیں چاہتا
اور آرام کو دل سے نہیں چاہتا
دل نہیں چاہتا صبح کی سیر کو
محفلِ شام کو دل نہیں چاہتا
اے خدا ایسی بینائی کس کام کی
دیدِ اصنام کو دل نہیں چاہتا
کر تو سکتے ہیں سیدھی ہم اس کی زبان
راست اقدام کو دل نہیں چاہتا
چیخ پر آدمی کا نہیں اختیار
ورنہ کہرام کو دل نہیں چاہتا
کوئی آتا بھی ہے محض پیغام سے
محض پیغام کو دل نہیں چاہتا
پہلے پل پل ترا نام جپتے تھے ہم
آج کل نام کو دل نہیں چاہتا
اس قدر در بہ در ہو چکے ہیں کہ اب
گام دو گام کو دل نہیں چاہتا
کیسا پیغمبری وقت ہے اے شعور
کشف و الہام کو دل نہیں چاہتا

احمد جاوید

☆

در خوابم آمد آں شمسِ تبریز اے ذرہ ساماں برخیز برخیز
مخفی ہے شاید اُس کم نما سے دل کی بصارت ہے آنکھ سے تیز
دامن بچاؤں جلنے سے کیسے گرتے ہیں آنسو سب شعلہ آمیز
آمادہ رکھنا دل کے سب آفاق وقت ِ سحر ہے یارانِ شب خیز
دریا بضاعت ہے جُرعہ جُرعہ ہے کوزۂ دل کس شے سے لبریز
دامن ہمارا ایسے نہ جھاڑو ہے ذرّہ ذرّہ ویرانہ انگیز
خطِ ثلث کی کرتا ہوں جب مشق لکھتا ہوں شیریں فرہاد پرویز
ہے برقِ رنگیں وہ غنچۂ سرخ یا بوسہ مشرب اک شعلۂ تیز
مرنا ہے بھائی فرض آدمی پر واجب نہیں ہے جینے سے پرہیز

☆

دشمن ہمارا انسان تو ہے اس ممتنع کا امکان تو ہے
دل کا یہ ہم پر احسان تو ہے نادیدہ کی بھی پہچان تو ہے
ہم ہیں حبابِ سیلِ تمنا دم بھر کا وافر سامان تو ہے
ہے قابلِ فہم اشکال اس کا مشکل بھی اتنی آسان تو ہے
اندھی ہے مانا چشمِ تماشا آئینے جتنی حیران تو ہے
ہم جانتے ہیں اوقات اپنی سرکار پھر بھی ارمان تو ہے
ہاں اہلِ دُنیا میری گرہ میں گھر واپسی کا سامان تو ہے
اللہ رکھے، یہ دشت اب تک آباد یعنی ویران تو ہے
بے برکتی کے اس دور میں بھی اپنی جنوں پر گزران تو ہے
دل نام اک شے کھوئی گئی ہے دھیلے کا ہے پر نقصان تو ہے
پانی نہیں ہے دریا میں لیکن حسبِ روایت طوفان تو ہے
مروی ہے کس سے یہ قولِ باطل زردار آخر انسان تو ہے

گھر سے نمایاں ہے ترکِ وحشت
حالانکہ یہ بھی ویران تو ہے

کچھ ہے کہ جس کو بھولے ہوئے ہیں
ہم کو کم از کم یہ دھیان تو ہے

یہ بھی بہت ہے نسیانیوں کو
مستحضر اپنا نسیان تو ہے

☆

دل نے کیا ہے وہ خرمن ایجاد
ہر دانہ جس کا ہے گلشن ایجاد

بس گریہ ناکی بس، ہو چلا ہے
وہ اشک پیدا، وہ دامن ایجاد

یہ بھی ہنر ہے دستِ جنوں میں
جیب آفریں ہے اور دامن ایجاد

اچھا تو گویا وہ ایک ہی ہے
خنجر کا صانع اور گردن ایجاد

تیار کرکے حمامِ وحشت
کرنے چلا ہوں میں گلخن ایجاد

خیاط ہوں میں دیوانگاں کا
کرتا ہوں چاکِ پیراہن ایجاد

سب منصرف ہیں دل کی ضمیریں
جب سے ہوئے ہیں ما و من ایجاد

آہنگِ ہستی یہ ہے تو میں بھی
کرتا ہوں طرزِ نابودن ایجاد

تم کان دھر کے دل کو سنو تو
کیا نغمہ گر ہے یہ شیون ایجاد

خورشید طینت ہے ذرّہ ذرّہ
دل نے کیا ہے ایسا بن ایجاد

رکھی اسی نے ہر شے ادھوری
جس نے کیا ہے پورا پن ایجاد

کب ہوگا وقتِ چشم آفرینی
اے جلوہ تعمیر اے روزن ایجاد

اے لامکانی تیرے لیے میں
دل میں کروں گا اک مسکن ایجاد

درد آفرینی گر دل لگی تھی
درماں بھی کر دو تفریحاً ایجاد

☆

مت کر سخن میں جاوید ضائع
دل کے صنائع دل کے بدائع

عشق ایک جنس عالی ہے اور دل
خود مشتری ہے، خود ہی ہے بائع

ناصح نے سن کر میری کہانی
بولا تھا اک لفظ شاید فجائع

کس کیمیا داں کی ہے یہ تحقیق
آنسو نہیں ہے از قسم مائع

ملکِ عرب میں عشاق سارے
کہتے ہیں دل کو خیر الودائع

اے بے حصولی پایا ہے تجھ کو
مفقود کر کے سارے ذرائع

فرہنگِ دل کے سب اندراجات
ہیں ثابت الاصل عند الشرائع

اہلِ لغت کا اس پر ہے اجماع
مطلوب دل ہے فوق الذرائع

یہ چشمِ و دل ہیں یعنی کہ یہ یہ
نے اشک رائج نے آہ شائع

واعظ مبارک اب عاصیوں کو
نوکِ زباں ہیں جملہ شنائع

رویا ہے جس کو تعبیر کیجیے
وہ چشم یعنی عین الوقائع

ہے یہ حکیم الامت کی تشخیص
اذہاں پر ہیں غالب طبائع

سیّد سراواں کے ہیں دہاتی
میاں ہم کہیں کے طاغی و طائع

دل کی کتاب مطبوع جاوید
بارے ہوئی ہے سارے میں شائع

اجمل سراج

خوف انجانا ٹھہر گیا ہے
دل ویرانہ ٹھہر گیا ہے
اُس کے لبوں پر آتے آتے
ایک بہانہ ٹھہر گیا ہے
بات یہاں تک آ پہنچی ہے
آنا جانا ٹھہر گیا ہے
ٹھہر گیا ہے دل کا جانا
"دل کا جانا ٹھہر گیا ہے"
اب میری دہلیز پہ آکر
ایک زمانہ ٹھہر گیا ہے
نئے گھروں کی دیواروں پر
رنگ پُرانا ٹھہر گیا ہے
اجمل تیرے چُپ رہنے سے
غم افسانہ ٹھہر گیا ہے

O

شکستہ، دل ہمارا، ہورہا ہے
سمندر کیوں کنارا ہورہا ہے
یہ آنکھیں کیوں چھلک آئی ہیں یکدم
یہ دل کیوں پارہ پارہ ہورہا ہے

جسے ہم دوست رکھنا چاہتے ہیں
وہی دشمن ہمارا ہورہا ہے
خسارے میں ترقی ہورہی ہے
ترقی میں خسارہ ہورہا ہے
گرا تھا جو تری آنکھوں سے اجمل
وہ آنسو اب ستارہ ہورہا ہے

☆

پیش جو آیا سرِ ساحلِ شب بتلایا
موجِ غم کو بھی مگر موجِ طرب بتلایا

رنگ محفل کا عجب ہوگیا جس دم اُس نے
خامشی کو بھی مری حسنِ طلب بتلایا

ہے بتانے کی کوئی چیز بھلا نام و نسب
ہم نے پوچھا نہ کبھی نام نسب بتلایا

یوں ہی آیا تھا ترا ذکر کہیں اور ہم نے
جو ترے باب میں معلوم تھا سب بتلایا

یہ اُداسی کا سبب پوچھنے والے اجمل
کیا کریں گے جو اُداسی کا سبب بتلایا

خورشید عالم

غزل

آئے تیرے لیے تری خاطر نہیں رہے
ایسے رہے ہیں ہم کہ بظاہر نہیں رہے

کیا بات ہے جہان میں ایسی کہ رفتگاں
اک بار جو رہے ہیں یہاں پھر نہیں رہے

اے کشتگان شوق نہ سمجھو ہمیں بحال
سنبھلے ہوئے بھی کب ہیں اگر گر نہیں رہے

کل شب چراغ و ساغر و مینا ترے بغیر
ہوتے ہوئے بھی بزم میں حاضر نہیں رہے

کچھ اتنے تیز رو تھے کہ یہ بھی خبر نہ تھی
آنکھیں نہیں رہیں کہ مناظر نہیں رہے

مدّت ہوئی کہ اب یہاں اڑتی نہیں ہے دھول
کیا راہِ عشق تیرے مسافر نہیں رہے

☆

جتنی مشکل ہے مجھے اتنی ہی آسانی ہے
میرا سامان میری بے سرو سامانی ہے

جیب و دامان و گریبان کی خبر کیا رکھوں
مرے ملبوس سے باہر مری عریانی ہے

وسعتِ وعدۂ فردا میں بھٹکتا ہوا دل
آج اِک لمحۂ موجود کا زندانی ہے

اس لیے بھی نہیں لگتا دلِ تنہائی پسند
گھر میں جو تھی وہ کہاں دشت میں ویرانی ہے

پوچھ لینے سے تمہارے جو ہوئی ہے لاحق
کیا بتاؤں کہ مجھے کیسی پریشانی ہے

جس قدر ہو سکے نقصان اٹھا لے اے دل
یہ مری پہلی نہیں آخری نادانی ہے
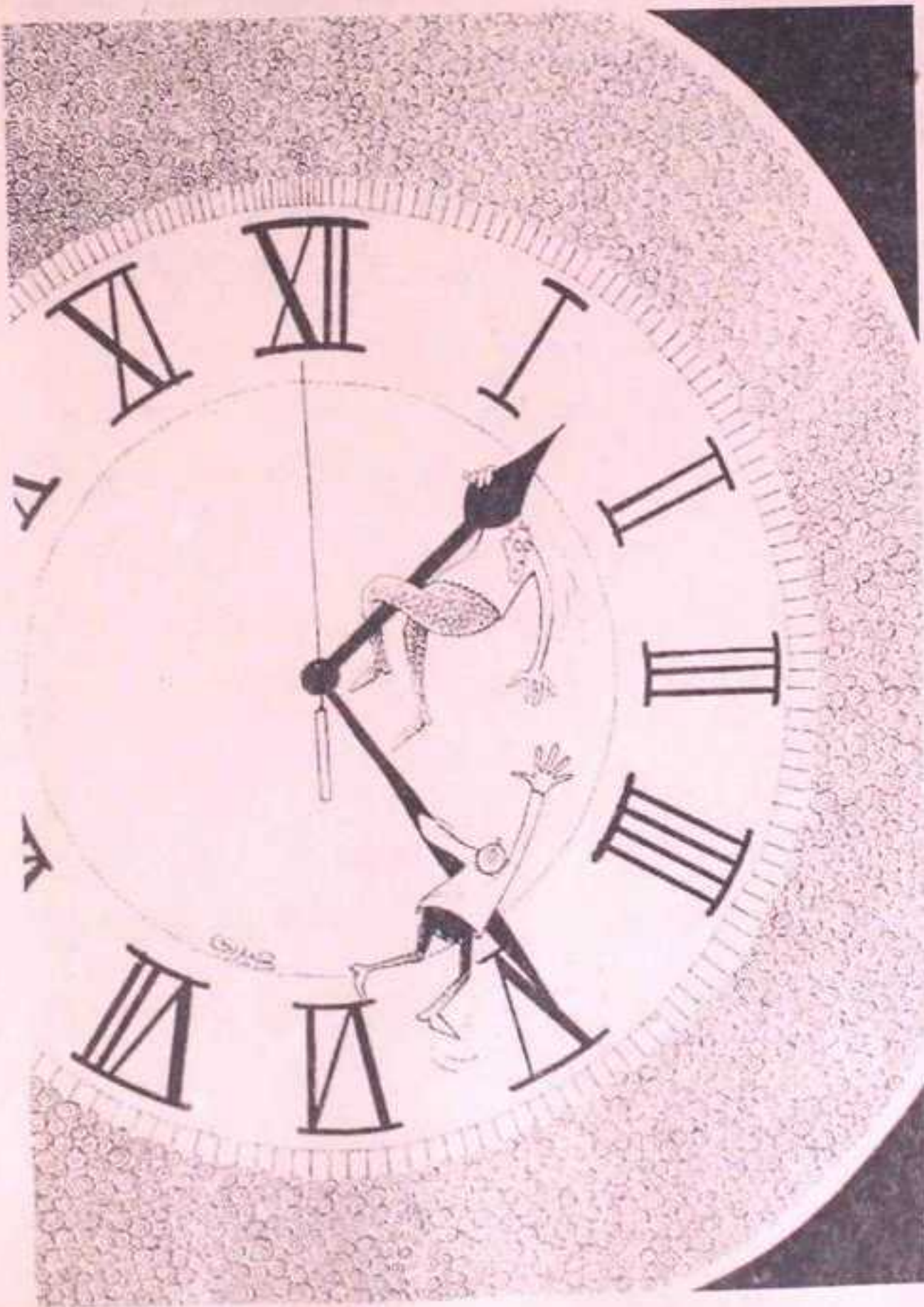
عارف امام

میری بھی پت رکھیو بھلا مرے لال قلندر سائیں
میں ہوں اور تنہائی کا ہے اک ڈونگا ساگر سائیں

مست ملنگ ہوں میں بھی سائیں ڈالتا ہوں دھمال
رقص میں ہے اک ہجر کا دریا میرے بھیتر سائیں

سوھنی تر سکدی سی دریا کچے گھڑے دے نال
میری سوھنی کیویں ترے گی سات سمندر سائیں

بے کل ہوں بیراگی ہوں موہے لاگی پیا کی پیت
آگ وچھوڑے کی ہے بھڑکتی سینے اندر سائیں

آپ کے اوپر کھلے ہوئے ہیں عشق کے راز و نیاز
کوئی نہ جانے دل دیاں لگیاں آپ سے بہتر سائیں

اک جندڑی وچ کیویں سمجھاں سائیں میں اپنا آپ
آپ نے اپنے بھید چھپائے میرے اندر سائیں

آپ کی لہریں کب دھوویں گی میرے بدن کا میل
میں گندے پانی کا جوہڑ، آپ سمندر سائیں

☆

ایک ہی درد مرا ایک وظیفہ میرا
اس کی گردان سے نکھرا لب و لہجہ میرا

مانگتا ہوں میں کبھی مانگنے والوں کی طرح
بس مرا سائیں بڑھا دیتا ہے حصہ میرا

اک سخی نے کبھی ڈالی تھی ترے نام کی بھیک
جب سے خالی ہی نہیں ہوتا ہے کاسہ میرا

جب یہ پوچھا گیا کس شکل کے ہوتے ہیں فقیر
ساری دنیا کو دکھایا گیا چہرہ میرا

آبِ گریہ سے وضو کرتا ہوں دورانِ نماز
پھر مجھے مجھ سے ملا دیتا ہے سجدہ میرا

مجھ کو سیراب کیا تشنہ لبی نے میری
ویسے کہنے کو رہا نہر پہ قبضہ میرا

آنکھ سے اشک نہ ٹپکے گا تو مرجاؤں گا
باعثِ گردشِ انفاس ہے گریہ میرا

کس طرح ہووے نہ پھر سینۂ افلاک میں چھید
کتنی صدیوں کی ریاضت ہے یہ نوحہ میرا

میرا ذمہ جو نہ کٹ جائے زبانِ شمشیر
اک ذرا ختم تو ہو لینے دو خطبہ میرا

خاکِ مقتل کو ملایا گیا مٹی میں مری
اس کی بخشش کہ بڑھایا گیا رتبہ میرا

☆

کوئی نیزہ مرے سینے میں گڑا رہ جاتا
میرا لاشہ کسی مقتل میں پڑا رہ جاتا

قافلے والے مجھے کھینچتے اپنی جانب
اور میں بچوں کی طرح ضد پہ اڑا رہ جاتا

وہ بھی آجاتا دمِ نزع سرہانے مرے
اس کا چہرہ مری آنکھوں میں جڑا رہ جاتا

لوٹ لیتا زرِ انفاس کو قزاقِ اجل
صرف پیَروں میں فقیری کا کڑا رہ جاتا

وقت ہوتا نہ اگر زود فراموش تو پھر
پختہ ہوجاتے مکاں، کچا گھڑا رہ جاتا

تیرے کوچے میں پڑے سارے فقیروں کو سلام
درمیاں ان کے کہیں میں بھی پڑا رہ جاتا

☆

میرا جھگڑا تو آسمان سے تھا
یہ زمیں درمیاں میں کیوں آئی

محوِ سجدہ تھا کُل وجود مرا
پھر جبیں درمیاں میں کیوں آئی

ہاں بھی ہوسکتا تھا نتیجۂ کُن
یہ نہیں درمیاں میں کیوں آئی

گاڑنا تھا علم کو سینے پر
شہ نشیں درمیاں میں کیوں آئی

کب فقیروں کو خوفِ خنجر تھا
آستیں درمیاں میں کیوں آئی

گفتگو ہو رہی تھی ساغر سے
انگبیں درمیاں میں کیوں آئی

☆

داغِ سجدہ جبیں کے بیچوں بیچ
اور بت آستیں کے بیچوں بیچ

حجرۂ دل میں ہے مقیم وہی
جس کا گھر ہے زمیں کے بیچوں بیچ

میرا سائیں خرام کرتا ہے
فرش و عرشِ بریں کے بیچوں بیچ

ہجے کر کے نہیں کے لفظ کو پڑھ
ہاں کی 'ہ' ہے نہیں کے بیچوں بیچ

اپنی مستی میں رقص کرتا ہوں
عین دنیا و دیں کے بیچوں بیچ

لا کی ہے اک خلائے لامحدود
لامکاں اور مکیں کے بیچوں بیچ

زندگی کی صدا سنی میں نے
اور دمِ واپسیں کے بیچوں بیچ

شمعِ وعدہ کی لو بھڑکتی ہے
قلب خیمہ نشیں کے بیچوں بیچ

آپ کو چھوڑ کر چلا جاتا؟
شک میں پڑتا یقیں کے بیچوں بیچ

☆

اپنے ہی چنگل سے چھڑا کر خود کو میں
مستی میں ہوں مست بھلا کر خود کو میں

ذرے ذرے سے مری خوشبو آتی ہے
کتنا پھیل گیا ہوں مٹا کر خود کو میں

عادت ہے بس خود کو اذیّت دینے کی
ہنستا ہوں ہر بار رُلا کر خود کو میں

ہاتھ اٹھا کر عرش کو چھولوں جب چاہوں
بڑھنے لگا مرے یار گھٹا کر خود کو میں

کون مجھے دفنانے آئے گا صحرا میں
چلتا ہوں کاندھے پہ اٹھا کر خود کو میں

اب بھی وقت ہے آجاؤ سائیں ورنہ
رقص کروں گا آگ لگا کر خود کو میں

☆

وسوسوں کی دکان ہے دنیا
دو گھڑی کا گمان ہے دنیا

میرے سائیں کے دم سے ہے آباد
ورنہ خالی مکان ہے دنیا

اس کی رفعت کا ذکر کرتا ہوں
اور مری ہم زبان ہے دنیا

میں مسافر رہِ عدم کا ہوں
اور مری میزبان ہے دنیا

اس کو رستہ نہیں سمجھ لینا
راستے کا نشان ہے دنیا

اتنی صدیوں کی عمر پاکر بھی
کس قدر نوجوان ہے دنیا

کچھ ہمیں کو نہیں ہے اس سے غرض
ورنہ سونے کی کان ہے دنیا

سب بنائے ہوئے خدا کے ہیں
ایک ہی۔ خاندان ہے دنیا

☆

واہموں کی دکاں سے کیا لینا
ہم فقیروں کو یاں سے کیا لینا

اس نے تم کو زمیں پہ بھیج دیا
اور اب آسماں سے کیا لینا

اپنی مستی میں مست ہیں ہم کو
گردشِ کن فکاں سے کیا لینا

ہم تو دل کی اذاں کے قائل ہیں
مولوی کی اذاں سے کیا لینا

اپنے سائیں کے در پہ آن پڑے
اب ہمیں جسم و جاں سے کیا لینا

شعر ہم پر نزول کرتا ہے
ہم کو حرف و بیاں سے کیا لینا

جس طرف دیکھیے ادھر ہے وہ
اب یہاں اور وہاں سے کیا لینا

اپنے حجرے میں ہیں سکون سے ہم
ہم کو سیرِ جہاں سے کیا لینا

نام جپتے ہیں اپنے سائیں کا
کام اور اس زباں سے کیا لینا

اک بدن بھر زمین مانگتے ہیں
اور اس خاکداں سے کیا لینا

اپنے اندر کمی ہے کس شے کی
دوسروں کے یہاں سے کیا لینا

☆

جو نہ مانگیں وہ نعمتیں دے دیں
شعر کہنے کی فرصتیں دے دیں

سجدہ و بندگی کے بیچوں بیچ
رقص کرنے کی ساعتیں دے دیں

سر جھکانے کا یہ صلہ بخشا
سر اُٹھانے کی ہمتیں دے دیں

پردہ ڈالا خرابیوں پہ مری
میری خوبی کو شہرتیں دے دیں

میں تو گدڑی پہن کے نکلا تھا
میرے سائیں نے خلعتیں دے دیں

پاؤں ٹکتے نہیں زمیں پہ مرے
مجھ کو اتنی محبتیں دے دیں

حالتِ شکر کے سوا ہم نے
اس کو سب اپنی حالتیں دے دیں

ساعتِ عمر کھینچ کر اس نے
توبہ کرنے کی مہلتیں دے دیں

اس کی بخشش کی حد بھی ہے کوئی
ہم فقیروں کو عزتیں دے دیں

ہم بھلا ان کو نذر کیا دیتے
جن کو مولیٰ نے آیتیں دے دیں

حسن عابدی

قافلہ

ڈھول میں لپٹی کالی چادر، شیشوں والی ست رنگی رتی
ٹوٹے ہوئے کھٹولے
خالی مٹکے، کالی ہانڈی، چم چم کرتا کاسہ
برسوں کی گھر داری کا سارا اثاثہ
بچے بالے، ماں کے پیٹ میں پلنے والا
سب خچر پر لدے ہوئے ہیں
آسمان کی آگ تلے،
یہ مٹی کے بھوبھل میں جلنے والے
ریتلی دھرتی کے ''بیٹے'' پانی لینے نکلے ہیں
ٹیلوں کا سایہ بھی ان سے، اتنی دور ہے
جیسے سورج سے سیارے،
جیسے آنسو سے انگارے
بادل اُوپر اُوپر منڈلاتے ہیں
سایے کی چادر پھیلا کے،
اُجڑے پجڑے لوگوں کے ساتھ چلے آتے ہیں
لیکن سوکھے ہیں تو بادل بھی
حاکم کے کارندے بن جاتے ہیں
انہی کے اونچے ایوانوں پر، پانی برساتے ہیں
مٹی چاٹ کے جانے والے، یونہی چلتے رہتے ہیں
چلتے رہتے ہیں۔
ان پر سایہ غم نہیں ہوتا
رستہ ختم نہیں ہوتا
خچر کی پیٹھ کا بوجھ بھی کم نہیں ہوتا۔

ابرار الحسن

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

کسی صورت بھی میرا دیوتا راضی نہیں ہوتا!
نوائے نیم شب کی گونج تک واپس نہیں کرتا،
تڑپ اٹھتے ہیں، نالے سجدہ ہائے صبح خیزی کے،
فلک سے، کہکشاں سے کوئی آہٹ بھی نہیں آتی،
زمیں کے قلب سے ہلکی سی دھڑکن بھی نہیں اُٹھتی،
ہوا خاموش رہتی ہے، سمندر کچھ نہیں کہتا......
وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتا، وہ میری کچھ نہیں سنتا
کسی صورت بھی میرا دیوتا راضی نہیں ہوتا!

ریاضت کی دل و جاں سے
نچھاور کر دیے ہیں پھول راحت کے،
جو تھا حاضر کیا ہے...... جیب بھی، دستار و دامن بھی،
گریباں چاک ہے، سر خاک ہے، گھر مثلِ صحرا ہے،
کسی صورت بھی میرا دیوتا راضی نہیں ہوتا!
فلاکت حال ہوں تو نارسائی اور ڈستی ہے،
کبھی خوشیاں میسّر ہوں تو یہ کھٹکا سا رہتا ہے
مری زندہ دلی سے وہ کہیں برہم نہ ہو جائے،
کسی صورت بھی میرا دیوتا راضی نہیں ہوتا۔
نہ جانے کس نے ایسے دیوتاؤں کو بنایا ہے!

بس اب یہ دل میں ٹھانی ہے......

میں اپنا دیوتا خود ہی تراشوں گا،

مرے دل میں جو رہتا ہے اُسے باہر بلاؤں گا،

بتاؤں گا اُسے کیا میرے نالوں کا مداوا ہے،

تمنا زندگی کی کس طرح دل میں جگاتے ہیں،

سکھاؤں گا اُسے آداب خوئے دل نوازی کے

طریق بندگی کی دلربا رسمیں بناؤں گا،

میں اُن میں ڈوب جاؤں گا، میں اُن میں تیر جاؤں گا،

بس اب یہ ٹھان لی ہے دیوتا خود ہی تراشوں گا!

شاہین

ایک منظر

بازوؤں میں
اور کولھوں میں لگاتی
نقرئی خوابوں کے ٹیکے
وسط اکتوبر کی رات

مانٹریال اور لاس ویگز
کی بساطِ رقص میں لپٹا ہوا
بیل گاڑی میں سوار
آوارہ چاند

تال کے پانی میں
رہ رہ کر
چمکتی سی
کوئی عیار آنکھ۔

گوش نزدیکِ لبم آر

کہیں زندگی بھر
بھٹکنا ہی تیری نہ تقدیر ہو
یوں نہ چل
جیسے ساری سڑک تیری جاگیر ہو۔

زخموں کی برات

دھیرے دھیرے
یوں تو جل بجھتی ہے
آتش دان کے شعلوں میں رات
راکھ میں پھر بھی سلگتی رہتی ہیں بے نام سی یادیں
کہ جن سے ماند پڑ جاتی ہے کچھ بے مہریٔ اوقات
اور ہم تان لیں چادر
تو آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں وہ لمحات
جن کے قرب سے تازہ ہے فصلِ ممکنات

اور پھر اک بار
جنّت اور دوزخ میں بیک وقت
اپنے رکھتے ہیں قدم ہم
صبح دَم
جب بند ہو جاتا ہے بابِ التفات

تم نے تو پایانِ کار
ڈھونڈ لی اپنے لیے اک کائنات
ہم کہ پاگل تھے
لیے پھرتے رہے ناحق
زمانے بھر میں زخموں کی برات

ایک ہیں جنّت کے اور دوزخ کے رستے
جس طرح ملتی ہے مل جائے نجات۔

ہم سا آخر کون ہے؟

جاگتے میں خواب دیکھیں
اور ہم خوابوں میں جاگیں
کتنی دنیا اکیلے ساتھ لے کر
بے ارادہ
رات بھر آوارہ سے پھرتے رہیں

کون سی آواز ہے
کون سی آواز کی خوشبو ہے
جس کا ہم تعاقب کررہے ہیں
کون سی آواز کی خوشبو کا جادو ہے
کہ ہم جس کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں
کچھ کھلتا نہیں!

ہم ہی وہ آواز ہیں شاید
خرابے میں وگرنہ
ہم سا آخر کون ہے؟

اچھوت سورج

اچھوت سورج کی روشنی میں
بجھے ہوئے دل
صداقتوں پر پڑے ہوئے
سب کثیف پردے اٹھا گئے ہیں
اچھوت سورج کی روشنی میں
تمام کہسار و باغ و جادہ نہا گئے ہیں

اچھوت سورج کی روشنی نے
ہر ایک کو اپنے لمس سے
ظلمتوں کے آگے
سلیقہ مندی کے ساتھ سینہ سپر کیا ہے
اچھوت سورج کی روشنی نے
ہر ایک سینے میں گھر کیا ہے
اچھوت سورج نے بے ہنر کو ہنر دیا ہے
اچھوت سورج نے محنتوں کا ثمر دیا ہے

اچھوت سورج نے اتنے سورج کیے ہیں پیدا
اچھوت سورج پہ کوئی بھی ہاتھ اٹھا کے دیکھے
جو زیر دستوں کے حق میں تھا قہر آسمانی
زمین سے اُگنے والی تابانیوں سے
زور آزما کے دیکھے

آئینہ

تم کہ ہر وقت ہو مصروف سے
کیا کرتے ہو؟
کیوں کمی وقت کی ہر پل تمہیں تڑپاتی ہے؟
ایک رونا ہے کبھی ختم جو ہوتا ہی نہیں
شاید اس بات کا احساس تمہیں رہتا ہے
ہم میں مصروف نظر آتے ہیں جو لوگ معزز ہیں وہی
اور جو لوگ معزز ہیں بہت قیمتی ہیں
اور ہم جیسے بہت سارے کہ ہیں تیرہ نصیب
اہمیت کچھ نہیں رکھتے

کہ ہمیں وقت سے کچھ لاگ نہیں
ہم کہ ہیں اپنی ہی اوقات سے شرمندہ و عاجز پیہم
ایسے احباب سے ملنے میں
بھلا عار نہ کیوں آئے تمھیں؟

وقت ناوقت
یہی وقت کی موہوم کمی کا ماتم
ہر بڑے شخص کی پہچان ہے یہ
لیکن ایسا ہے
کہ تم کو جو کبھی وقت فراغت کا میسر آئے
اور اگر
اپنے ہی آپ سے ملنے کی خلش دل میں مچل جائے
تو اک روز اِدھر آ جانا!

نصیر احمد ناصر

دنیا چالاک لوگوں کے لیے بنی ہے

بچے معصومیت سے پوچھتے ہیں
مرنے کے بعد
جانوروں کی روحیں کہاں جاتی ہیں
کیا مچھلی کی روح
سمندر سے چلی جاتی ہے
اور پرندے
درختوں کی شاخوں کا روپ دھار لیتے ہیں؟
بچے نظریہ کار نہیں ہوتے
وہ ارتقا اور تناسخ کا فلسفہ بھی نہیں سمجھتے
وہ نہیں جانتے
کون کس جنم میں کیا تھا اور کیا ہوگا
انہیں کیا معلوم
کہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے
جن کی خوراک
معصوم روحیں ہوتی ہیں
وہ جانوروں کی ہوں یا انسانوں کی!

ایک تصویر زا نظم کا اسکڑوگرام

دیواریں دروازوں سے باہر نکل آئی ہیں
راستے تنگ ہیں

اور قدموں کے نشان زیادہ
نیم دراز دھوپ کی ڈھلوانوں پر
اپنے ہی سایوں کو پھلانگتے ہوئے
منھ کے بل گر پڑنا
عین سچائی ہے انوکھا پن نہیں
کسی دیرینہ خواب کو دیکھتے ہوئے
آنکھوں کو پتہ ہی نہیں چلتا
کہ ان کے سمندروں سے کتنا پانی نکل چکا ہے
دریا عبور کرنا آسان ہے
لیکن کنارے پر پاؤں رکھنا بہت مشکل
بستیوں کے نواح سے گزرتے ہوئے
تاریخ کے راستے
کھیتوں، چراگاہوں، انگور کے باغوں
اور عورتوں کے نشیب وفراز میں غائب ہوجاتے ہیں
نئی فصلیں تیار ہونے تک
موسم ملتوی ہوتے رہتے ہیں
فلسفے چند لوگوں کے لیے ہیں
اور موت سب کے لیے
کوئی نظم نہ لکھ سکنا
شاعر کا المیہ نہیں ہوتا
زندگی مرگ مسلسل سے دوچار ہو
تو موت ایک گھسا پٹا لفظ بن کر رہ جاتی ہے
متروک دنوں کی آبیاری سے
بے دلی کی مشقت کے سوا کچھ نہیں اگتا
اس سے پہلے کہ ہم حالت تنہائی میں

کسی نادیدہ ستارے سے دیکھ لیے جائیں
آؤ! ان کہنہ عمارتوں کے صدر دروازوں سے گزریں
جن پہ ایستادہ غلام روحیں
گرد و غبار سے اٹے جسموں
اور بھربھری ہڈیوں میں تبدیل ہو چکی ہیں
اور ہاتھ کے ایک اشارے سے
اپنے ہی قدموں میں گر پڑیں گی
بادلوں کے پنچھی
اور بارشوں کا دھواں
موسمیاتی سیارے کی دسترس سے اب زیادہ دور نہیں!

مفرور

دیکھو، میرے دل میں راستے تلاش مت کرو!
تمہیں کیا معلوم
کہ میں کتنی دُور سے چل کر آیا ہوں
اور ابھی کتنی دُور جانا ہے
زمین چاروں طرف سے رات کے خلا میں ڈوبی ہوئی ہے
اور وہ ایک اک ستارے میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں
تمہاری پناہ گاہ کی روشنی
انہیں اس طرف کھینچ لائے گی
اور مجھے کیموفلاژ کرنے کی پاداش میں
وہ تمہاری آتما نذرِ آتش کر دیں گے
اور گوشت مالِ غنیمت کی طرح بانٹ لیں گے
میں ایک بار پھر قیدِ دوام میں ڈال دیا جاؤں گا

دیکھو، وقت کم ہے
آنکھیں صدیوں تک خوابوں کی متحمل نہیں ہوسکتیں
جسم سرحدیں پار کرتے ہوئے
خاردار تاروں میں اُلجھ جاتے ہیں
اور ہاتھ تارِ عنکبوت کی طرح
کھڑکیوں کے شیشوں سے چپکے رہ جاتے ہیں
سنو، ہوا کے کان سرگوشیوں سے بھرے ہوئے ہیں
اور وہ آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ
جنگلوں اور پہاڑوں کو فتح کرتے ہوئے
خشکی کے آخری سرے تک آپہنچے ہیں
اس سے پہلے کہ سمندر اُن کی دسترس میں آجائیں
مجھے نکل جانے دو
ان جزیروں کی طرف
جہاں کبھی وحشی قبائل آباد تھے
مگر اب تیل تلاش کرنے والی کمپنیوں کی رہائش گاہیں ہیں
وہاں پام کے گھنے درخت
طلوعِ آفتاب تک مجھے چھپائے رکھیں گے!

کنٹرول لائن

وہ ہمیں ملنے آتے ہیں
ہواؤں اور بارشوں کے ساتھ
دروازوں کے پاس
اُن کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں
اور خالی برآمدے

کپڑوں کی سرسراہٹ
اور جسموں کی مہک سے بھر جاتے ہیں
دیواریں الانگتے، چھتوں اور چھجوں سے پھسلتے
بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے
بادلوں کے سایوں کی طرح
نیم پختہ دالانوں کے سناٹے میں
آنکھیں انہیں دیکھتی ہیں
دسترس سے دور
اور طویل فاصلوں کی طرف جاتے ہوئے!

کھڑکیاں منہ کھولے ہوئے
اونگھتی ہیں
اور سوچتی ہیں کہ
زمین کو پچھاڑ کر
اس کے سینے پر بیٹھے
فتح مندی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے
ان پہاڑوں سے پرے بھی
کوئی جھیل ہوگی
اور پرندے
اور سفید بادل
اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے
گھنے درختوں کے جھنڈ
ناہموار گھاس کے میدان
ریوڑ اور تنہا گڈریے
اور دور جاتے ہوئے راستے ہوں گے

کوئی گاؤں، کوئی شہر ہوگا
یا پھر کوئی دوسرا ملک
جہاں کوئی شاعر (میری طرح) بیٹھا
نظمیں لکھ رہا ہوگا!

کاغذوں پر حدیں باندھنا آسان ہے
چند نقطوں اور لکیروں سے
پہاڑ، ندیاں، نالے، نشیب
کھیت، بستیاں، علاقے، علمداریاں
درے اور خفیہ راستے
یہاں تک کہ قلعے اور فصلیں
اور فصیلوں پر آہنی سروں کی قطاریں، بن جاتی ہیں
مگر دیواریں الانگتے سایوں
دروازوں، کھڑکیوں، دالانوں
اور دلوں کے دور دراز منطقوں تک پھیلے
سناٹوں کی نشاندہی کرتے ہوئے
زمین کے نقشے پر
دھوپ اور بارش کا رنگ بدل جاتا ہے!

عدالت کو کیا معلوم!

یہاں زندہ رہنے کی خواہش ایسی ہے
جیسی بے پر کی تتلی
اور موت کا پروانہ لینے کے لیے بھی
عدالت میں جانا پڑتا ہے

جو اپنے فیصلے کی بنیاد
گواہوں کے بیانات پر رکھتی ہے
عدالت کو کیا معلوم
کہ خدا دکھی لوگوں کو گواہی دینے
کبھی کبھی خود کٹہرے میں آ جاتا ہے!

رات زندگی سے قدیم ہے

یہ سچ کی وہی فصل ہے
جو مٹی کی نمو سے اٹھی
اور آسمان تک پھیل گئی
تب ہم بہت دور تک چلے تھے
اور باتوں کے بے انت سلسلے
ہمارے درمیان بچھی مسافت سے طویل تھے
اور جب ہم نے پاؤں اٹھانا سیکھ لیا
تو ہمیں دھکیل دیا گیا
ابدیت کے بے آغاز راستوں کی طرف
اور تم نہیں جانتے تھے
کہ رات زندگی سے قدیم ہے
اور تمہاری ہری بھری شاداب فصلیں
میری روح کو غذا
اور بدن کو روشنی فراہم نہیں کر سکتیں
تم نے بارہا مجھے پکارا
اور میں خاموش رہا
کہ خاموشی میں عافیت تھی

سروں اور ہاتھوں کی فصلیں کاٹنے والے
قلم کی تراش
اور موقلم کی خراش سے نابلد ہوتے ہیں
مٹی راستہ بننے سے پہلے
رنگوں کا بلیدان مانگتی ہے
لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے
ریوڑ ہانکتے ہوئے
دانش اپنے آپ میں تنہا ہوتی ہے
تنہا اور بے امان......
میں ان کھیتوں میں بارہا بویا اور کاٹا گیا ہوں
میں دھرتی کا بیج ہوں
یا کائنات کا دل،
تمہاری آواز
مجھے نمو کے سفر پر اکساتی رہے گی
اور پھر ایک دن ہم اتر جائیں گے
ان دریاؤں کے پار
جہاں راستے ہیں نہ مسافر
دھوپ ہے نہ شام
بس ایک خواب جیسی دھند ہے
اور پہاڑ جیسی رات
جس کے آخری سرے پر
(اور رات کا آخری سرا ہوتا ہی کب ہے)
ایک کچی دیوار پر پوتا ہوا وقت ہے
اور کوسوں دُور
کئی راستوں کو رگیدتی ہوئی

ایک سڑک ہے
طویل اور بے نشان....
کیا ہم اپنے قدموں سے بنائے ہوئے راستوں
اور اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے
درختوں کو بھول سکتے ہیں!

بیاضِ وقت کا اگلا ورق خالی ہے

تم کن موسموں کے انتظار میں
ہونٹوں پہ خشک سالی
اور آنکھوں میں بارشیں سنبھالے ہوئے ہو؟
تمہارے حصے کے آسمان کو
بدبو دار سانسیں دھندلا کر رہی ہیں
بادل، ہوا اور آبی بخارات ذخیرہ کرنے کی
اجازت اُن کو ہے
جن کے تصرف میں دوسروں کے حصے کی زمینیں ہیں
تمہارے پاس تو چلنے کے لیے پاؤں بھر راستہ بھی نہیں!
فیکٹریوں میں دھوپ
اتنی وافر مقدار میں تیار ہوتی ہے
کہ تمہاری رات
نوکِ قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی کے
ایک نقطے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی
زائر اور روانڈا میں
ہزاروں لاکھوں کالے انسان مرنے سے
کیا زمین پر دھبوں اور پرچھائیوں کا

قحط پڑ گیا ہے؟
جہاں پیدا ہونے پر طبلک
اور مرنے پر ماتمی دھنیں بجائی جاتی ہیں
وہاں زندگی اور موت کے درمیان
تم کون سی نئی سمفنی ترتیب دینا چاہتے ہو؟
ہزاروں سال پہلے کا
بے شعور انسان
ہڈیوں سے بانسری بنانے
اور سُر کی لے پر انگلیاں بجانے کا فن جانتا تھا
لیکن تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم
کہ سورج، چاند اور سیارے
نادیدہ کہکشائیں، بلیک ہولز، دُمدار ستارے
خلائی رصدگاہیں
ارضی شہر اور بستیاں
تمہارے وقت کی دسترس سے دُور
ایک ایسی صدی میں داخل ہونے والی ہیں
جہاں لیزر کی شعاعیں
تمام روشنیوں پر غالب آجائیں گی
اور تمہارے انتظار کا دورانیہ ختم ہونے سے پہلے ہی
کائنات کی بیاض سے
گیت اور الفاظ تحلیل ہو جائیں گے!

محمد انور خالد

کلہاڑی آج تک پہچانی جاتی ہے

کلہاڑی اپنے پھل سے اور سرسوں پھول سے پہچانی جاتی ہے
سو ہم نے کچھ یہاں کھویا نہ پایا
عدالت زادۂ زنجیر نے مجھ کو بنایا آدمی زادہ
سو میں جیسا بھی ہوں اپنی طرح ہوں
کہ جنگل آگ سے اور آگ اپنی ہار سے پہچانی جاتی ہے
کہ ہر شے جس طرح پہلے کہیں تھی پھر وہیں ہوگی
محبت یار کو لوٹائی جائے گی
عداوت بھائی کو،
اور دوستی اپنی جگہ محفوظ ہوگی
برف میں پتھر کی صورت
اسے بیگانگی کی آگ دینا
کلہاڑی اپنے سر سے اور لڑکی پاؤں سے پہچانی جاتی ہے
سو اس کو روک لیتے ہیں زمیں زادے
خود اپنے بازوؤں میں
پاؤں سے نیچے دبا کر
خاک پر ہم اس کا بڑھنا روک دیتے ہیں
مگر وہ منہ چڑھی مٹی اڑاتی کھیلتی
کچی منڈیریں پھاندتی گاتی ہوئی
لڑکی کسی سے کب رُکی ہے
محبت اصطلاحاً چاہنا ہے

اور کس نے کس کو چاہا
کلہاڑی جانتی ہے
یا جو اپنے گھر میں پایا گیا
جس رات بارش ہو رہی تھی
اور جنگل رقص میں تھا
تیز بوچھاروں کی زد میں
دو بدن پاگل ہوئے تھے
جب کلہاڑی نے انہیں دوبار کاٹا
تیز بارش دھند چادر چار دیواری
کلہاڑی نے مگر سب کچھ بہت تفصیل سے دیکھا
کلہاڑی اپنا منصب جانتی ہے
اور اپنا فیصلہ نافذ بھی کرتی ہے
یہ کچی شاخ والی، سبک، روشن ہلالی نرم پتری،
بانس سے پیوستہ،
کافی ہے کسی عورت کے دل پر اپنا پہلا حرف لکھنے کو
کلہاڑی نے مگر جنگل نہیں دیکھا
یہ کچی شاخ والی اوڑھنی کے ساتھ آویزاں کلہاڑی جیسی شے نے
آج تک جنگل نہیں دیکھا
درختوں میں ہزار آسیب
سوکھی جھاڑیوں میں آگ
مٹی میں نمک
سو مسئلے ہیں
اور کلہاڑی نے ابھی جنگل نہیں دیکھا
کلہاڑی بس اسی سے آج تک پہچانی جاتی ہے۔

معین نظامی

کہانی

کہانی اوّل اوّل
لفظ کے جگنو کی صورت میں
مراسم کے گھنے نادیدہ جنگل میں ملی مجھ کو
کہانی اور میرے درمیاں
ساتوں سمندر، اجنبیت بن کے حائل تھے
کئی احباب بن دیکھے سُنے بھی اس کے گھائل تھے
اگر اُس میں اور مجھ میں
بہت موہوم سی ایک غائبانہ دوستی سی تھی
بالآخر ایک دن، میں
اتفاقاً پانیوں کے پار جا پہنچا
مجھے لفظوں کی تہ میں
سر پٹکتی بازگشتِ وردِ دُنیا بھی سنائی دی
غم دل کی کراہیں بھی
پس دیوارِ معنی کچھ سُنیں میں نے
اور اُن مخفی صداؤں کے ہجوم بے کراں میں
کھلکھلاتے قہقہے بھی تھے
بناوٹ کے، سجاوٹ کے، حقیقت کے!
دیارِ غیر میں اپنے تلف ہوتے ہوئے
احساس کی شمع فروزاں کی
بہت شائستہ، آداب آشنا اور نرم لرزش بھی
مہذّب سی کسک بن کر
مثالِ نقشِ فریادی دکھائی دی

اور اُن سطروں کی رگ رگ میں
خلوص وحدت جذبات کا دھارا بھی تھا
جو مختلف اقوام کے
کچھ سادہ و پُرکار کرداروں میں بہتا تھا
کہانی لکھنے والا ان میں رہتا تھا!
سماجی بے حسی اور انفرادی افراتفری کی
بہت نزدیک سے کھینچی گئی
کچھ زندہ تصویریں
ہماری اجتماعی نوحہ گر تھیں
میں اپنے آپ سے کہتا تھا:
درد و غم کی خوشبو سے
گلابی، ریشمی دھاگوں کے یہ لچھے بنانے میں
زمانے، تجربے اور عمر کی کتنی ریاضت کارفرما ہے!
پھر ایک دن یہ ہوا
خواہش کے خواب آلود گُہرے میں
بہ ذاتِ خود کہانی مل گئی مجھ کو!

جذب

کئی سال پہلے کا قصہ ہے
قصہ نہیں ہے، حقیقت ہے
جس کی
مرے خاندانی مؤرخ بھی تصدیق کرتے ہیں
اور تذکرے لکھنے والے بھی
اس سانحے کی صداقت پہ سب متفق ہیں
کہ میرے معزز قبیلے کا اک نوجواں

جو بہ جا طور پر حاصلِ خانوادہ تھا
اور اپنی زیبائی و پارسائی میں بھی
اُس زمانے میں اور اُس علاقے میں بے مثل تھا
مبتلائے جنوں ہو گیا تھا!
مجھے یاد ہے، سب سے پہلے یہ قصّہ
مجھے میری مرحومہ دادی نے
گرمی کی ایک چودھویں رات کو
اپنی آغوش میں بھر کے، رو کر سُنایا تھا
وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ نوجواں صاحبِ کشف تھا
جذب کی ایک کیفیتِ خاص
ہر وقت اُس کا احاطہ کیے رہتی
اور اس کا ماتھا اندھیرے میں بھی یوں چمکتا تھا
جیسے کوئی چاند ہو!
جب وہ چالیس برسوں کی حسّاس سرحد میں داخل ہوا
تو مشیّت نے مُلکِ جنوں کے قبالے پہ نام اُس کا لکھا
رضائے الٰہی نے رغبت کے ہاتھوں سے
تاجِ زِخود رفتگی اُس کے سر پر رکھا
کیف نے تختِ سرگشتگی پر بٹھایا اُسے
وجد نے مرشدِ اہلِ مستی بنایا اُسے
عشق نے قیدِ عقل و خرد سے چھڑایا اُسے
درد نے نغمۂ دوستی یوں سنایا اُسے
کہ پھر ہوش ہرگز نہ آیا اُسے
چار ماہ اور کچھ دن
وہ خوش بخت اس منصبِ بے خودی پر
بہ صد ناز فائز رہا

اور اسی حالِ بے حال میں بارگاہ الٰہی میں پہنچا
خدا اُس کی مٹی کو سرسبز رکھے !
(۲)
میں کچھ دن سے، اپنی علالت کے باعث
بہت سخت تشویش میں مبتلا تھا
مگر آج اپنے معالج سے یہ بات سُن کر مسرت ہوئی ہے
کہ میرا خلل، اُس کی دانست میں
بے ضرر سے جنوں کی کوئی قسم ہے
جس کی تشخیص مشکل ہے
لیکن یہ طے ہے کہ مُہلک نہیں ہے!
یہ صدیوں پرانے زمانے میں ہوتی تھی
اور تازہ تر مغربی نفسیاتی کتابوں میں
پوری وضاحت سے لکھا ہوا ہے کہ مغرب میں
عرصے سے اس کے جراثیم نایاب ہیں
اور مشرق میں بھی، آج کل کے زمانے میں تو،
شاذ و نادر ہی ہوں گے!
یہ دورے عموماً وراثت میں ملتے ہیں
اور پانچویں یا چھٹی پُشت میں
ان کا ہلکا سا تکرار رہتا ہے اور کچھ نہیں!
وہ مجھے لکھ کے دینے کو تیار ہے
کہ اگر اُس کی تجویز کردہ مُسَکِّن دوائیں
میں دو ماہ بے ناغہ جاری رکھوں
تو مجھے عمر بھر اس مَرَض کی شکایت نہ ہوگی!
(۳)
میں خوش ہوں کہ اپنے معالج کی

تجویز کردہ مُسکّن دوائیں
نہیں لے سکوں گا
کہ مہنگی بہت ہیں!

نیند آتی نہیں!

نیند آتی نہیں
نیند آئے بھی کیا؟
میرے اطراف میں الجھنیں اس قدر ہیں
کہ میں اُن کے گرداب میں غوطہ زن
رات کے طفلِ گُم گشتہ کی اُنگلی تھامے
اُسے مادرِ صبح تک چھوڑ آتا ہوں
اور مجھ کو درپیش یہ مسئلہ
اتنا سادہ بھی ہرگز نہیں ہے
کہ جتنا بہ ظاہر مری نظم کی ابتدا میں نظر آ رہا ہے!
یہ تحت الشعوری اذیت گرہ در گرہ ہے
مجھی پر جو واضح نہیں ہے
تو اوروں پہ کیا منکشف ہو سکے گی؟
مری نفسیاتی معالج کو
میری بگڑتی ہوئی صورت حال پر سخت تشویش ہے
اور یہ سنگین حالت
اگر اُس کے علم و عمل اور خدوخال کے بس میں ہوتی
تو میں ایک عرصے سے
بے دست و پا تجربہ گہ نہ ہوتا
یقیناً کوئی ہوش مندانہ اقدام کرتا!

وہ بے حد پریشان ہے
کیوں کہ وہ نیک دل بیوہ
اپنے مریضوں سے اتنی ہی مخلص ہے
جتنی کسی دور میں اپنے مدفون شوہر سے ہوگی
سنا ہے کہ اب میرے جیسوں کے
ناگفتہ بہ ماضی و حال کی پوری تحقیق و تفتیش ہی
اُس کا واحد کمال ہُنر ہے
کہ جس سے وہ پیسے بنانے کو ترجیح دیتی نہیں

☆

آج میں نو بجے رات کو
حسب معمول اُس کے دفتر میں پہنچا
تو اُس خوبصورت عمارت میں
اُس کے سوا اور کوئی نہیں تھا
میں اپنی مریضانہ تاریخ کی زرد فائل لیے
پہلے جیسا جھجکتا ہوا
اُس کے مخصوص کمرے میں داخل ہوا
تو غنودہ سے اک لیمپ کی روشنی میں
وہ سرچشمۂ خندہ، افسردہ سی لگ رہی تھی
مجھے دیکھتے ہی
وہ بالوں کی آوارہ لٹ
اپنے ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے
نیم بیمار آواز میں خود کلامی سی کرنے لگی
''آئیں، تشریف رکھیں!
سنائیں دوا چل رہی ہے؟
ابھی FAVERIN اور دو ماہ تک تو چلائیں
اگر چہ یہ مہنگی بہت ہے

یہ پانی تو لیجے!
مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ
کچھ دن سے میں کیوں نہیں سو سکی ہوں؟''

معبدِ معذرت میں

بہت مدّتوں بعد کل وہ بُت صندلیں
معبدِ معذرت میں ملا تھا مجھے
اُس فضا میں کہیں عذر خواہی کے عُود
اور ندامت کے لوبان کی روشنی تھی
چراغانِ چون و چرا کی چکاچوند کے اُس طرف
لمس کی نیم تاریک محراب میں
جب تلافی کی بوسوں کی خوشبو نے کھینچا
تو ہم سحر زدگی کی حالت میں کھنچتے گئے تھے!
وہاں ہم نے کچھ وقت کشفِ حجاباتِ دُوری میں کاٹا
بدن کے پُر اسرار سے کاخ و کُو میں
بہت پہلے جیسی ہوس میں ملوّث
مقدّس ملاقات کی آرزو میں

ایک غلام گردش میں

وہ لب
جن کو ہم سادہ دل
آبروئے خموشی سمجھتے تھے، اُن کو
ہماری شکستہ سماعت نے کل
چہچہاتی ہوئی بلبلوں کی طرح

ذوقِ شیریں بیانی میں دیکھا
وہ چہرہ
جسے طاقِ ایوانِ باطن میں رکھا ہوا تھا
جسے حاصلِ دو جہاں جانتے تھے
جسے روح کا رازداں جانتے تھے
جسے بارہا باغِ نورِ معانی میں دیکھا
اُسے ہم نے کل نیم شب
ایک جشنِ طرب میں
طنابِ تلذذ میں جکڑے ہوئے
خیمۂ رائگانی میں دیکھا
یہ منظر، دلِ زار نے
شعلۂ برق کی چشمکِ ناگہانی میں دیکھا

مَوقِف

محبت کے بارے میں
اس رُبعِ مسکوں میں
جتنے بھی موقف مروّج رہے ہیں
میں اُن سب پہ قائم رہا ہوں
اور اب بھی تہ دل سے قائم ہوں
لیکن
محبت سے مجھ کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا ہے
کہ وہ روزِ آغاز ہی سے
مرے سلسلے میں
کسی خاص موقف پہ قائم نہیں ہے!

امام شامل

عبادت

میری مسجد کی ایک کوٹھری تھی
جہاں سے ہم آنے جانے والے
نمازیوں کو دیکھا کرتے تھے
میرے دادا جب سجدہ ریز ہوتے تھے
تو میں تپتی دھوپ میں
سائیکلیں چلایا کرتا تھا......

میری کزن ایک چالاک لڑکی تھی
جو مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں
اپنے سپنے دکھاتی تھی
اور پھر اجنبی ہو جاتی تھی

میں نے اس کے بعد بھی کئی محبتیں کی ہیں
یک طرفہ
اور الم ناک محبتیں
ہوس ناک
اور مقدس محبتیں
میرے دادا اب بھی شاید کہیں
اپنے سفید عمامے میں سجدہ ریز ہوں
وہ سجدہ جو لمحوں میں
اور صدیوں میں پھیلا ہوا ہے۔

کشور ناہید

ادل سومرو: تعارف

پابلو نیرودا نے لکھا تھا "تم چاہے جتنے پھول اجاڑ ڈالو۔ بہار کو تو آنا ہے" ہمارے ادب میں بہار کی نوید بن کر ادل سومرو سامنے آ رہا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی واقعہ کے چند سال گزرنے کے بعد، اس پر ادب نمودار ہوتا ہے۔ یہ ان زمانوں کی باتیں ہیں جب اطلاع برسوں بعد ملا کرتی تھی۔ آج کے دور میں ملٹی میڈیا کے ذریعے کانوں، ناک، منھ، ہر ذریعے سے اطلاع فراہم ہوتی ہے۔ آنکھوں نے جب کتّوں کو انسانوں کی بوٹیاں نوچتے دیکھا اور کتّے کا پٹہ عورت کے ہاتھ میں دیکھا تو مجھے اپنے عورت ہونے پر ندامت محسوس ہونے لگی۔

وہ سارے موضوعات جن پر مجھے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ندامت محسوس ہوتی ہے وہ سارے موضوع ادل سومرو کی گرفت میں آ گئے ہیں۔ منچھر جھیل کو یرقان ہونے سے لے کر آگے تک۔ جب میں آج کل حیدرآباد جاتی ہوں اور مجھے پلا مچھلی نہیں ملتی ہے۔ میں جب لورالائی جاتی ہوں تو بچوں کو سوکھی روٹی ہنستے ہنستے کھاتے دیکھتی ہوں۔ لاڑکانہ میں لوگوں کو امرود سے روٹی کھاتے دیکھتی ہوں اور جہلو میں لسی کے ساتھ روتی کھاتے دیکھتی ہوں تو شکر کرتی ہوں کہ ان کو پیٹ کا دوزخ مٹانے کو کچھ تو مل رہا ہے۔ عراقیوں، افغانیوں اور روانا کے لوگوں کی طرح، صرف کھانے کو بندوق کی گولیاں تو نہیں مل رہیں۔ ادل سومرو نے انسان کے رشتوں کی نہیں زمین سے جڑے ان سارے رشتوں کی ازلی داستان سنائی ہے جس میں سادہ الفاظ بھی تیر کی طرح لگتے ہیں اور کہیں بھی مبالغے یا نعرہ بازی کا گمان نہیں ہوتا ہے۔

مزاحمتی شاعری کا ایک دور تو ضیا الحق کے منحوس مارشل لاء کے زمانے میں تھا تو دوسرا دور تب شروع ہوا جب آمریت، خود پر جمہوریت کا لیبل لگا کر، دنیا بھر کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ جب کہ آزادیٔ اظہار کا مطلب صرف تعریف و توصیف ان لوگوں کی کرنا کہ جو حکومتی کارندے ہوں نہ کہ کلمۂ حق کہنا۔ معلوم نہیں یہ کبھی کہا بھی گیا ہوگا۔

کالی دیوی کے بارہ ہاتھ ہوتے ہیں۔ ظلم کرنے والے ہاتھ کا اسی لیے پتہ نہیں چلتا ہے۔ مجھے ادل سومرو کی نظموں میں سارے کے سارے بارہ ہاتھ الگ الگ دکھائی دے رہے ہیں۔

ادل سومرو

ملاّحوں کے درد کا نوحہ

سائیں!
ہماری منچھر[1] کو یرقان ہوا ہے
اُسے بچالو۔
زہر آلودہ پانی سے
مفلسی اُبلنے لگی ہے
کنول مُرجھا گئے ہیں
دیسی اور پردیسی پنچھی
سارے اُڑ گئے
ہر کشتی ویران کھڑی ہے۔
مچھلیاں اب تو
خوابوں میں بھی نہیں آتیں۔
سورج کی دھوپ
اور ستاروں کی چھاؤں میں
ہم مچھیرے
صرف دکھوں کے جال
بُنتے رہتے ہیں۔
ہماری آنکھیں
اب رنگوں اور موسموں کا

---

[1] منچھر جھیل۔ دادو سندھ میں واقع ایشیا کی سب سے بڑی جھیل جو کہ زہر آلودہ پانی کی وجہ سے اب تباہی کے کنارے پہنچ چکی ہے۔

فرق نہیں کر پاتیں۔
آوازوں اور ہنگاموں کی
اس دنیا میں
ملاحوں کے درد کا نوحہ
کون سُنے گا۔
بچے سارے بھول گئے ہیں
کھیل تماشے
ہو جمالو
سائیں!
ہماری منچھر کو یرقان ہوا ہے
اُسے بچالو

چھوٹی کلاس کا المیہ

کلاس سوسائٹی کے شکار ہم لوگ
ہر کام آخری تاریخ میں کرتے ہیں
آخری تاریخ میں
بچوں کے اسکول کی فیس
آخری تاریخ میں
بجلی کے بل کی ادائیگی
آخری تاریخ میں
(موت سے تھوڑی دیر پہلے)
مریض کے لیے دوائی۔
ہماری کوئی تاریخ ہی نہیں ہے۔
زندگی کی دوڑ میں

ہم تھکے ہوئے لوگوں کو
بے نام سی آبرو کے لیے
سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔
چیونٹیاں قطار بناتی ہیں۔
ہاتھیوں کو قطار بنانے کی ضرورت نہیں
قطار میں کھڑا ہونا بھی
چھوٹی کلاس کا مسئلہ ہے۔
ہم اس قطار سے نکلنا چاہتے ہیں
لیکن ہوتا یوں ہے
کہ معتبر ہونے کی کوشش میں
ہم پاؤں کی دھول بن جاتے ہیں۔

تمہاری ٹرین کسی وقت بھی آ سکتی ہے

ہر ایک کو جانا ہے مسافر
اپنا سامان سمیٹ لو
تمہاری ٹرین کسی وقت بھی
آ سکتی ہے
ٹرین لیٹ بھی ہو سکتی ہے
لیکن پلیٹ فارم پر
سونے کی اجازت نہیں ہے۔
نیند، عاشقوں اور مسافروں کی
دشمن ہے۔
اسٹیشن پر ریل گاڑیاں
اچھی لگتی ہیں۔

اسٹلا جوزف کو بھی
ریل گاڑیاں اچھی لگتی تھیں
اور ایک دن ریل گاڑی نے
اُسے نگل لیا۔
جو اچھے لگتے ہیں
وہی مارتے ہیں۔
ثروت حُسین نے
اپنی ٹرین کا انتظار
کرنے سے انکار کردیا
اور ایک دن وہ بھی
ٹرین کو پیارا ہوگیا۔
جب گاڑی جانے لگے
تو ہاتھ مت ہلانا
سب کو جانا ہے جاناں!
سفر تو سب کو کرنا ہے۔
عطیہ داؤد کو معلوم ہے
کہ منافقوں کو اس دنیا میں
شرافت کی پل صراط کا سفر
کتنا مشکل ہے۔
یہ زندگی
ریل کی پٹڑیوں کے
بیچ کا سفر ہے
ہر لمحے ڈر سا رہتا ہے۔
ٹرین کسی وقت بھی آسکتی ہے۔
آؤ عذرا عباس سے

پوچھتے ہیں کہ
سارا شگفتہ کی قبر
ڈھونڈنے میں کتنا وقت لگے گا۔
وقت بہت کم ہے مسافر!
کھانے کے لیے بھی مشکل سے
وقت نکالنا پڑتا ہے۔
باربی کیو کا رواج بڑھ رہا ہے
اور ٹماٹو کیچپ کی
طلب میں اضافہ ہو رہا ہے
ٹماٹو کیچپ کے عنوان سے
نظم لکھنے والے
جو سب کو پیاری تھی
وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔
تم اگر کسی کو پیارے
نہ بھی ہو
پھر بھی تمہیں ایک دن
اللہ کو پیارا ہونا ہے
تمہاری ٹرین
کسی وقت بھی آسکتی ہے۔

نیا ناچ

میر علی مراد خان!
تم نے
شیروں کی کھالوں سے

بنا ہوا خیمہ
انگریز افسر کو
تحفے میں دیا تھا۔
آج تمہارے دیس میں
ایک بھی شیر باقی نہیں رہا،
اور گیدڑ
انگریزی دُھن پر
ناچتے ہوئے
''ہو جمالو'' گا رہے ہیں۔

☆ میر علی مراد خان۔ سندھ کے تالپور حکمران، جو شکار کے حوالہ سے مشہور تھے۔

وائی

سال کا سُورج ڈوب رہا ہے
راج گھاٹ پہ کون کھڑا ہے
سادھو بیلا سوچ رہا ہے
شاعر/ شیخ ایاز ہے جس کا
تلواروں سے گیت لڑا ہے۔
سادھو بیلا سوچ رہا ہے
سندھو میں جو تیر رہا ہے
کس سوہنی کا یار گھڑا ہے
سادھو بیلا سوچ رہا ہے
بنکھنڈی مہراج کا اب تک
مندر میں اک خواب پڑا ہے
سادھو بیلا سوچ رہا ہے

ڈاکٹر رفیع مصطفی ٹورنٹو میں مقیم سائنس دان ہیں جن کا شعبہ کمپیوٹر ہے۔ ان کا یہ مضمون "پاکستان لنک" میں شائع ہوا۔

رفیع مصطفیٰ
ترجمہ: حمرا خلیق

ڈراؤنے خوابوں کا رشتہ

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی آج تک مجھے اپنی ماں کا اس کچی سڑک پر جان بچانے کے لیے بھاگنا یاد ہے جو ایک آسیب کی طرح مجھے ڈراتا ہے۔ میں نہایت مایوس کن انداز میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ لیکن اس کے برابر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ میں اس وقت صرف چھ سال کا تھا اور زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اماں نے اپنا تمام سامان ایک گٹھری میں باندھ لیا تھا جسے وہ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں رک کر پیچھے مڑ کر یہ دیکھتی کہ میں کتنی دور ہوں۔

"بیٹا جلدی کرو" وہ چلاتی۔ لیکن میں اس سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ میرے ابا بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ میں بار بار پیچھے دیکھتا تھا کہ شاید وہ مجھے کہیں نظر آ جائیں۔ لیکن مجھے لوگوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے جو دوڑتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ابا انہی قطاروں میں کہیں پھنس گئے ہیں۔

ہم اپنی جانیں بچا کر ہندوستان کی سرحد عبور کر کے پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ ہم مسلمان تھے۔ لیکن کسی وجہ سے ہم اپنے ہی وطن کے باشندے نہیں رہے تھے۔ ہم یہاں پناہیں تلاش کرتے، دہشت سے بھرے دن رات گزارتے اور راتوں کی بے خوابی میں وقت کاٹا تھا۔ لوگ ساری ساری رات اپنے گھروں کی حفاظت کرنے کے لیے جاگ جاگ کر پہرہ دیتے۔ ہم نے سنا تھا کہ لاشوں سے بھری ٹرینیں پاکستان پہنچ رہی ہیں۔ آس پاس کے دیہاتوں سے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں آ رہی تھیں۔ ہم ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے۔

اب جب کہ میں ساٹھ سال کا ہونے والا ہوں وہ کچی سڑک آج بھی میری زندگی کا حصہ

ہے۔ میں آج تک اپنی ماں کے پیچھے انہیں پکڑنے کے لیے دوڑ رہا ہوں۔ اپنے ڈراؤنے خوابوں میں آج بھی خود کو چھ سال کا دیکھتا ہوں۔

میں تقریباً ۳۵ سال پہلے کینیڈا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ جب میں تعلیم مکمل کر کے واپس پاکستان پہنچا اور میں نے یونیورسٹی میں ملازمت شروع کی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ وہ پہلے والا ملک نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان چار سال میں جب میں ملک سے باہر تھا، پاکستان میں کیا گڑبڑ ہوگئی۔ پورا ملک پاگل پن کا شکار ہو چکا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے۔ وہ اسے لسانی جھگڑوں کا نام دے رہے تھے۔ وہ ہر اس پروفیسر کو نکال پھینکنے کے درپے تھے جو ان کے نزدیک صحیح زبان نہیں بولتا تھا۔ مجھے اپنے خاندان والوں کو بچانے کے لیے ایک مرتبہ پھر کہیں بھاگ جانا تھا، لیکن کہاں؟ کچھ دن بعد ایک ہسپتال گیا جہاں میرے کئی ساتھی، ان کے بیوی بچے زخمی سروں اور ٹوٹے پھوٹے اعضاء کے ساتھ داخل تھے..... میرے والد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کینیڈا واپس چلا جاؤں۔

کافی مہینوں بعد جب ہم کراچی کے ہوائی اڈے پر سیکورٹی چیک میں سے گزر رہے تھے، میرے بیٹے نے مجھ سے پوچھا کہ دادا دادی ہمارے ساتھ کیوں نہیں چل رہے ہیں۔ میں ایک منٹ کو رُکا۔ اور مڑ کر اپنے والدین کو دیکھنے لگا۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ وہ بوڑھے تھے اور انہیں میری مدد کی ضرورت تھی۔ میں واپس ہونا چاہتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میرے والد ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ میری ہچکچاہٹ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کو کہا۔ اس وقت مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ میں انہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہ وقت تھا جب میرے ڈراؤنے خوابوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمیشہ اندھیرا گھپ اور میں فسادیوں سے ڈر کر بھاگتا ہوا، کبھی میں خود کو رن وے پر جہاز کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دیکھتا جو مجھے چھوڑ کر اُڑنے والا ہوتا۔ میں اپنی بیوی اور بچوں سے جلدی جلدی آنے کو کہتا اور پھر دوڑنا شروع کر دیتا۔ میں ہمیشہ جہاز میں سوار ہونے سے رہ جاتا۔ اور ایک اجنبی ہوائی اڈے پر دُھند میں کھو جاتا۔ جہاں اپنے اور اپنے گھر والوں کے جہاز کے ٹکٹ خریدنے کے لیے میرے پاس پیسے بھی نہ ہوتے۔

کل میری بیوی نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا ہم ایک دن کے اندر کینیڈا چھوڑ سکتے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں نفرت جنم لے چکی تھی۔ مجھے ایک گفتگو یاد ہے جس میں ایک شخص نے کہا تھا

"یہ مسلمان انسانیت کے لیے سرطان کی طرح ہیں۔ اگر انسانیت کو زندہ رکھنا ہے تو انہیں نیست و نابود کر دینا چاہیئے۔" میں نے ان لوگوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔

ان حالات میں یہ غصہ اور نفرت حق بجانب تھی لیکن بحیثیت ایک مسلمان میں اس کا الزام لینے کو قطعاً تیار نہیں تھا۔ میں نے کینیڈا کو اپنا وطن صرف ایک وجہ سے بنایا تھا۔ کیونکہ اپنی شناخت پر ہونے والے جبر سے میں تنگ آ چکا تھا۔ مجھے آزادی چاہیئے تھی۔ اور اس آزادی کی میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تھی، سوچا تھا یہی میرا وطن اور گھر ہے اور مرتے دم تک رہے گا۔ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ نئی دوڑ اور نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کی مجھ میں اب سکت نہیں تھی۔ اب میں ڈراؤنے خوابوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

جب میں نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو مسمار ہوتے دیکھا تو میں وہ افراتفری، خوف و دہشت اور موت کے ہولناک مناظر دیکھ کر وحشت زدہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ واقعہ تمام زندگی لوگوں کے ذہنوں میں بار بار ڈراؤنا خواب بن کر اُبھرتا رہے گا۔

میں نے دس سال پہلے بغداد میں ہونے والی بمباری کا تصور کیا۔ پھر میرے ذہن میں اس اسرائیلی کا تصور آیا جو اپنے بچّے کو بغل میں دبائے اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ کیا اس کے آسیب زدہ خواب میرے خوابوں سے مختلف ہوں گے یا وہ فلسطینی ماں جو اپنے بچّے کی لاش اٹھائے مایوسی کے عالم میں بے سُدھ بیٹھی تھی۔ میں افریقہ کے قحط میں اس ماں کو دیکھ سکتا تھا جس کا بچّہ فاقے سے مر رہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ مجھے پتہ چلے کہ اس ماں کا ذہن میں کس قسم کا خواب ہے۔

ایک مرتبہ میں بمباری سے بچ جانے والے ایک شخص سے ملا تھا جس کی دادی کو میں جانتا تھا۔ میں اس دادی کے خوابوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ پھر مجھے ایک عراقی عورت کا چہرہ یاد آیا جو بغداد کی ایک ویران سڑک پر بمباری کے دوران بھاگتی پھر رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں وحشت سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ کیا اس کے ڈراؤنے خواب بھی وہی تھے جو اس ننھی سی ویت نامی بچی کے جو سائیگون کی سڑکوں پر جلنے کے نشانات لیے برہنہ جسم مدد کے لیے پکارتی پھر رہی تھی۔

کسی وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کا تعلق مجھ سے ہے۔ ہم ایک ہی سلسلے میں جڑے ہوئے ہیں، ڈراؤنے خوابوں کا رشتہ۔

انیل نوریا
ترجمہ: اسد محمد خاں

دہرہ دون کا درزی

وشوا ہندو پریشد اور ہندو جاگرن منچ نے ہندو عورتوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ کوٹ دوار میں مرد ذات کے درزیوں کو (جو تقریباً سبھی مسلمان ہیں) اپنے کپڑے کا ناپ دینے نہ جایا کریں۔ (ایک خبر)

یہ خبر پڑھی تو مجھے اُتر آنچل کے کچھ ایسے مسلمان درزیوں کا خیال آیا جنھیں میں جانتا تھا۔

ہم میں سے وہ جنھوں نے ۱۹۶۰ء میں ہوش سنبھالا ہے، تقسیم کی بہت سی کہانیاں سن چکے ہوں گے۔ میں نے بھی ایک کہانی سنی ہے جو میرے دادا جی بار بار دُہرایا کرتے تھے۔ یہ کہانی دہرہ دون کے شمال میں بسے گاؤں راج پور کے ایک مسلمان کے بارے میں تھی۔ راج پور سمجھو اب تو دہرہ دون کا ہی حصہ ہے۔

میری کہانیوں کے ذخیرے میں اس کہانی نے یوں جگہ بنائی ہے کہ یہ ایک ایسے محبت بھرے، جانے مانے درزی کی کہانی ہے جو الائچی پیش کرکے ہر آنے والے کا سواگت کیا کرتا تھا۔

کہانی آگے یوں چلتی ہے کہ۔۔۔

پارٹیشن کے بعد ایک بار رُڑکی علاقے میں کہیں جاتے ہوئے میرے دادا جی نے دیکھا کہ ایک وین سے دفن کے لیے لاشیں اُتاری جا رہی ہیں۔ ایک لاش جو اُتاری گئی اُس کے ہاتھ آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔ ہتھیلیاں اُس کی یوں ملی تھیں جیسے وہ۔۔۔ لاش، کچھ پیش کر رہی ہو۔

دادا جی نے غور سے دیکھا۔ اُنھیں کچھ جانا پہچانا سا لگا۔۔۔ یہ راج پور کے اُسی الائچی ماسٹر کا مُردہ تھا۔

اس واقعے نے دادا جی کو ایسا ہلا کے رکھ دیا کہ وہ اس جھٹکے سے پندرہ برس بعد بھی نہ نکل پائے۔ میرے ذہن میں، جو اس وقت بچہ ہی تھا، اس قصے نے گہرا اثر چھوڑا ہوگا۔ کیوں کہ دادا جی

سے یہ سب سننے کے چالیس برس بعد میں اُس ''الائچی ماسٹر'' کے بارے میں کچھ اور جاننے کے ارادے سے چل پڑا۔ میں دہرہ دون وادی کے بے شمار درزیوں سے ملا اور اس طرح ایک بڑے میاں، نذر ماسٹر سے میری ملاقات ہوگئی۔

نذر ماسٹر کی عمر ۷۵ سال ہوگی۔ وہ لڑکے ہی تھے جب سہارنپور سے کام کی تلاش میں ادھر آئے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے ایک درزی مسعود حسن انصاری کی شاگردی شروع کردی جنہوں نے ۱۹۱۲ء میں سٹی کوتوالی کے قریب اپنی دکان کھولی تھی۔

اچھی سیاسی سمجھ رکھنے والے نذر ماسٹر بہت سے قوم پرست احتجاجوں اور مظاہروں میں حصہ لے چکے تھے۔ پلٹن بازار کے کتنے ہی مظاہروں میں وہ انگریز کی لاٹھی کھا چکے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وشوا ہندو پریشد اور اس سے منسلک تنظیموں کا اور ان کی ''کلچر پولیس'' کا ابھی کوئی وجود نہیں تھا۔ کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا بلکہ اس وقت انہیں سوچا بھی نہیں گیا ہوگا۔

نذر ماسٹر، وادی کے (آزاد پیشہ) دستکاروں کی قابلِ قدر روایت پر چلتے ہوئے، برٹش راج کے خلاف جدوجہد میں کود پڑے تھے۔ پلٹن بازار کے ایک اور حریت پسند درزی عبدالرحمٰن اس زمانے کی سولِ نافرمانی تحریک میں گرفتاری دے چکے تھے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کو گرفتاری کے بعد جب دہرہ دون میں رکھا گیا تو اُن کے کپڑے سلائی کے کاموں کے لیے نذر ماسٹر کے اُستاد انصاری صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔

پنڈت جی ایک شیروانی استاد کی دکان میں سلوائی گئی۔ مگر ایک چیز جسے بنانے میں نذر ماسٹر کے استاد کو مشکل پیش آئی، وہ تھی پنڈت جی کی گاندھی کیپ۔ نذر نے بتایا کہ نہرو جی اپنی ٹوپی کی لمبائی، اس کے زاویوں، اس کے کشتی نما گھماؤ اور سامنے کی اور عقب کی ڈھلان کے بارے میں بہت جُزرس تھے۔ جب مسعود حسن، گاندھی کیپ لے کر پہنچے تو پنڈت جی بہت خوش ہوئے کیوں کہ ٹوپی بالکل ٹھیک سلی تھی۔

اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ٹوپی کس نے سی ہے تو نہرو جی نے کہا اُسے میرے پاس لے کر آؤ۔ استاد اگلی دفعہ نذر ماسٹر کو ساتھ لے گئے۔ آج ۷۵ برس کے بوڑھے نذر ماسٹر، نہرو جی کی شاباش اور ان کے دیے ہوئے روپے کو بڑے چاؤ سے یاد کرتے ہیں۔

نذر سیاست میں سرگرم رہے ہیں۔ انہوں نے شہر میں کئی طرح کی تبدیلیاں آتے دیکھیں اور یہ دیکھا کہ کس طرح بہت سے مسلمان، جن کی زندگیاں پارٹیشن سے بکھر گئی تھیں، نئی اُمید سے

جیسے دوبارہ آباد ہوگئی ہیں۔ اگر چہ اُن میں کے بہت سے پاکستان بھی چلے گئے۔ پھر بھی نذر ماسٹر نے اس وقت کے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ بہت قریبی تعاون کیا اور لوگوں کے خدشات مٹانے اور سکون کی فضا پیدا کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔

ساتھ ہی اور کوششیں بھی چلتی رہیں اور اُن ہندوؤں اور سکھوں کے لیے جو پاکستان میں، خاص طور پر صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب میں، اپنے گھر آنگن چھوڑ آئے تھے، راج پور کا قصبہ گھر آنگن بن گیا۔

میں نے دیکھا، نذر ماسٹر کا چہرہ چمک اُٹھا تھا جب وہ ۱۹۶۹ء میں سرحدی گاندھی، خان عبدالغفار خان کی دہرہ دون آمد کا واقعہ سنا رہے تھے۔ نذر پہلے دور کی کانگریس کے ساتھ کام کر چکے تھے اس لیے وہ اپنی مایوسی چھپاتے نہیں ہیں۔ دُکھ سے کہتے ہیں کہ کانگریس والوں نے اپنے ورثے کو ضائع ہو جانے دیا۔ خاص طور پر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے گرا دیے جانے کی جس طرح اجازت دے دی گئی، اس پر وہ کراہت اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

جی ہاں، نذر ماسٹر کو راج پور کے الائچی پیش کرنے والے درزی خوب یاد ہیں۔ کہنے لگے ان کا نام منو شاہ تھا۔ منو شاہ کو رُڑکی کے قریب دفن کیا گیا تھا۔ وہ کون تھے؟ درزی تھے؟ یا خشک میوے کے بیوپاری؟

نذر ماسٹر کا کہنا ہے کہ منو شاہ فقیر تھے۔ نہیں تو اور کیا ہو سکتے تھے وہ؟

پروفیسر فتح محمد ملک

انقلاب پسند منٹو اور نام نہاد ترقی پسند

پاکستانی ادب کی تاریخ کی سب سے بڑی ستم ظریفی سعادت حسن منٹو پر رجعت پرستی کی تہمت ہے۔ منٹو کے خلاف یہ فتویٰ اُن ترقی پسندوں نے جاری کیا تھا جنہیں منٹو نے جواباً ''نام نہاد ترقی پسند'' قرار دے ڈالا تھا۔ اس اعتبار سے منٹو کا یہ ردِعمل حق بجانب ہے کہ جس زمانے میں منٹو روس میں اشتراکی انقلاب کا پُرجوش علمی اور عملی خیر مقدم کرنے میں مصروف تھا منٹو پر رجعت پسندی کا بہتان تراشنے والے یہ ترقی پسند ادیب عین اُس زمانے میں حقیقت کی دُنیا سے دور رومانی خوابوں میں پناہ گزین تھے۔ اس مضمون کے عنوان میں انقلاب پسند کا اسمِ صفت منٹو کے زمانۂ طالب علمی کی ایک کہانی کے عنوان سے مستعار ہے۔ پروفیسر سجاد شیخ نے اس کہانی کے مرکزی کردار سلیم کو منٹو کا ہمزاد ٹھہرایا ہے اور منٹو کو ''ایک آتش نفس انقلابی'' قرار دیا ہے۔ خود منٹو نے اپنے لڑکپن کی یادیں تازہ کرتے وقت اپنی تخلیقی شخصیت کے تشکیلی دور پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''کہاں ماسکو، کہاں امرتسر، مگر میں اور حسن عباس نئے نئے باغی نہیں تھے۔ دسویں جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے رستے روس پہنچنے کی اسکیمیں بنا چکے تھے۔ حالانکہ ان دنوں فیروز الدین منصور ابھی کامریڈ ایف۔ ڈی منصور نہیں بنے تھے اور کامریڈ سجاد ظہیر شاید بنّے میاں ہی تھے ہم نے امرتسر ہی کو ماسکو متصور کر لیا تھا اور اسی کے گلی کوچوں میں مستبد اور جابر حکمرانوں کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ کٹڑہ جمیل سنگھ، کرموں ڈیوڑھی، یا چوک فرید میں زاریت کا تابوت گھسیٹ کر اس میں آخری کیل ٹھونکنا چاہتے تھے ۲۔''

افسانہ نگاری کی دُنیا میں قدم رکھنے سے پہلے منٹو نے نامور اشتراکی ادیب اور مؤرخ باری علیگ کے زیرِ اثر عالمی فکشن کا بالعموم اور روسی فکشن کا بالخصوص گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُس نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز روسی ادب کے تراجم سے کیا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی جب منٹو نے رسالہ ''ہمایوں'' اور رسالہ ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر شائع کر دیئے تھے، آسکر

وائلڈ کے ڈراما ''ویرا'' کا ترجمہ ''انقلابِ روس کی خونی داستان'' کے ذیلی عنوان کے ساتھ منظرِ عام پر لا چکا تھا، میکسم گورکی کے افسانوں کے تراجم پر مشتمل کتاب چھپ چکی تھی اور منتخب روسی افسانوں کا پہلا مجموعہ ''روسی افسانے'' اردو دُنیا میں ایک نئی ادبی تحریک کی راہ ہموار کر چکا تھا۔ منٹو نے جہاں روسی افسانوں کے تراجم پر مشتمل اپنی کتاب کا انتساب ''فکرِ احمر'' کے نام کیا ہے وہاں باری علیگ نے اس کتاب کا مقدمہ ان سطور پر تمام ہوتا ہے:

> ''روسی ادب کے مطالعہ کے بعد مترجم نے روسی طرز کا ایک مختصر طبع زاد افسانہ ''تماشا'' لکھا ہے۔ افسانہ کا محلِ وقوع امرتسر کی جگہ ماسکو نظر آتا ہے۔ خالد نقاب پوش ہندوستانی خاتون کا بچہ ہونے کی نسبت سرخ دامن کا پروردہ دکھائی دیتا ہے۔''[۳]

گویا منٹو کی تخلیقی شخصیت کی ساخت پرداخت میں روس کا اشتراکی انقلاب اور روسی ادب ابنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ ''تماشا'' ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے بدنام زمانہ قتلِ عام کی یادوں سے پھوٹا ہے۔ اس قتلِ عام کے وقت سعادت حسن منٹو کی عمر فقط سات برس تھی اور پرائمری سکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ ایک اور افسانہ ''سٹوڈنٹ یونین کیمپ'' اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ برطانوی سامراج اِس وحشت و بربریت کی خوں آشام یاد نے بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک منٹو کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ دورِ آخر کے شاہکار افسانے'' ۱۹۱۹ء کی ایک بات'' اور ''سوراج کے لیے'' اسی ناقابلِ فراموش تاریخی سانحہ کی دین ہیں۔ یہ حقیقت کہ باری صاحب کو افسانہ ''تماشا'' پڑھتے وقت یہ کہانی امرتسر کی بجائے ماسکو کی واردات نظر آئی ہے اِس بات کا ثبوت ہے کہ منٹو اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی برصغیر کی زندگی کو انقلاب آشنا کرنا چاہتا تھا۔ یہ افسانہ منٹو کے افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' میں شامل ہے۔ منٹو کے ابتدائی افسانوں پر مشتمل اس کتاب کا ہر افسانہ انقلابی حقیقت نگاری کی روسی روایت سے پھوٹا ہے۔ اگر ہم ''آتش پارے'' کا موازنہ نامور ترین ترقی پسند افسانہ نگاروں کے پہلے افسانوی مجموعہ کے ساتھ کریں تو یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جس وقت یہ لوگ خواب و خیال کی وادیوں میں فرار کی راہوں پر گامزن تھے اور ایک پادر ہوا رومانیت اِن کا ادبی مسلک ہو کر رہ گئی تھی عین اُس وقت سعادت حسن منٹو زندگی کے سنگین حقائق سے مردانہ وار پنجہ آزما تھے۔ ''آتش پارے'' کے افسانوں کے کردار وہ غریب، بے کس اور مظلوم انسان ہیں جو سرمایہ داری کی چکی کے دو پاٹوں میں مسلسل پس رہے ہیں۔ منٹو ٹھکرائی ہوئی اِس

مخلوق کو اپنے فن کا موضوع بناتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کو ان کے مصائب و آلام کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ''آتش پارے'' کی آخری کہانی 'چوری' کی آخری چند سطریں ملاحظہ فرمائیں:

''مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر فخر کیوں ہے؟...... مسعود نے سوال کیا۔

''آہ! فخر کیوں ہے؟......'' بوڑھا مسکرایا ''اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں...... اپنی سرقہ شدہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں میرے عزیز!...... بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا''۔

''میں سمجھا نہیں''

''ہر وہ چیز جو تم سے چرالی گئی ہو، تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ...... مگر یاد رہے تمہاری یہ کوشش کامیاب ہونی چاہیے ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے''۔

لڑکے اٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا:

''آہ! اگر بڑے ہو کر وہ صرف کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں!''

بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا اُمید تھی؟''

چند برس بعد برصغیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام منٹو کی اسی ''اُمید'' کا کرشمہ تھا۔ یہ کتنی المناک حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک اپنے عروج کو پہنچنے کے بعد انڈین کمیونسٹ پارٹی کی آمریت کا شکار ہو کر انحطاط کے راستوں پر سرپٹ دوڑنے لگی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جس شخص نے اپنے معاصرین پر فکری صلابت اور نظریاتی استقامت میں سبقت حاصل کرتے ہوئے آغاز کار ہی میں حریتِ فکر و عمل کی روشن مثال قائم کر دی تھی اُس پر کمیونسٹ ملائیت نے رجعت پسندی کا فتویٰ صادر کر دیا۔ جب منٹو کی ترقی پسندی کی تحسین کی بجائے ترقی پسندی ہی کے نام پر تردید کی گئی تو قدرتی طور پر اُس نے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ اپنے افسانوی مجموعہ ''چغد'' کے دیباچہ میں وہ اپنے ترقی پسند دوستوں کے حُسنِ سلوک کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس کتاب کا ایک افسانہ ''بابو گوپی ناتھ'' جب ''ادب لطیف'' میں شائع ہوا تو میں بمبئی ہی میں مقیم تھا۔ تمام ترقی پسند مصنفین نے اس کی بہت تعریف کی۔

اس کو اس سال کا شاہکار افسانہ قرار دیا۔ علی سردار جعفری، عصمت چغتائی اور کرشن چندر نے خصوصاً اس کو بہت سراہا، ''ہل کے سائے'' میں کرشن نے اس کو نمایاں جگہ دی۔ مگر یکا یک خدا معلوم کیسا دورہ پڑا کہ سب ترقی پسند اس افسانے کی عظمت سے منحرف ہو گئے۔ شروع شروع میں دبی زبان میں اس پر تنقید شروع ہوئی، سرگوشیوں میں اس کو برا بھلا کہا گیا۔ مگر اب بھارت اور پاکستان کے تمام ترقی پسند ممٹیوں پر چڑھ کر اس افسانے کو رجعت پسند، اخلاق سے گرا ہوا، گھناؤنا اور شرانگیز قرار دے رہے ہیں۔ یہی سلوک میرے افسانے ''میرا نام رادھا ہے'' کے ساتھ کیا گیا، حالانکہ جب شائع ہوا تھا تو تمام ترقی پسندوں نے اُچھل اُچھل کر اس کی تعریف وتوصیف کی تھی۔''

منٹو نے آگے چل کر علی سردار جعفری کے خط کی روشنی میں ''ترقی پسندوں کی ان الٹی سیدھی زقندوں'' کے اوّلیں محرک کی درست نشاندہی کی ہے:

''یہاں لاہور سے میرے پاس ایک خبر آئی ہے کہ تمہاری کسی نئی کتاب پر حسن عسکری مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ سکا تمہارا اور حسن عسکری کا کیا ساتھ ہے۔ میں حسن عسکری کو بالکل مخلص نہیں سمجھتا۔ ''ترقی پسندوں'' کی ''خبر رسانی'' کا سلسلہ اور انتظام قابل داد ہے۔ یہاں کی خبریں ''کھیت واڑی'' کے ''کرملن'' میں بڑی صحت سے یوں چٹکیوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ علی سردار کو یہاں سے جو خبر ملی، بڑی معتبر تھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ''سیاہ حاشیے'' پریس کی سیاہی لگنے سے پہلے ہی ''روسیاہ'' کر کے رجعت پسندی کی ٹوکری میں پھینک دی گئی۔''

جو بات علی سردار جعفری نے بمبئی سے منٹو کے نام اپنے متذکرہ بالا خط میں کہی ہے وہی بات لاہور سے احمد ندیم قاسمی نے منٹو کے نام اپنے ۱۵۔ ستمبر ۱۹۴۸ء کے طویل کھلے خط میں کہی ہے۔ ۱۳ تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا یہ خط دراصل محمد حسن عسکری کی نثری ہجو ہے۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادبی رفاقت پر برصغیر کے ترقی پسندوں میں گہرے غم و غصہ کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ جب منٹو اور عسکری کی مشترکہ ادارت میں رسالہ ''اردو ادب'' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس غم و غصہ نے ایک باقاعدہ عملی پروگرام کی شکل اختیار کر لی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں سعادت حسن منٹو سمیت چند نامور ادیبوں کے بائیکاٹ کی ایک باقاعدہ

قرارداد منظور کر لی گئی۔ چنانچہ ''اردو ادب'' کے دوسرے اور آخری شمارے میں منٹو نے ''اُردو ادب'' سے ترقی پسندوں کے بائیکاٹ کی اطلاعات پر مشتمل خطوط پر ''حقہ پانی بند'' کی سُرخی جما دی۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کے خط کا پورا متن پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرا وہ خط جو میں نے کوئٹہ سے لکھا تھا، اپنے رسالہ ''اردو ادب'' میں شائع کر رہے ہیں، میرے اس خط کی اشاعت روک لیں، جب میں نے آپ سے افسانہ طلب کیا تھا، تو ہماری انجمن (انجمن ترقی پسند مصنفین) نے ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کر رکھی تھی کہ وہ رسالے جنھیں ترقی پسند ادب کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ایسے ادیبوں کی تحریریں شائع نہ کریں جنھیں ترقی پسند ادب کی تحریک سے اتفاق نہیں، اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے ، اور میں انجمن کے منشور، آئین اور فیصلوں کا پابند ہونے کے باعث یہ نہیں چاہتا کہ میرا وہ خط پڑھ کر ہماری تحریک کے ہمدرد الجھن میں پڑ جائیں، امید ہے آپ میرا وہ خط روک لیں گے اور اگر ایسا ناممکن ہوا تو یہ خط بھی شائع کر دیں گے، شکریہ۔''[۵]

محمد حسن عسکری سے ادبی رفاقت ہی وہ سنگین خطا تھی جس کی پاداش میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے سعادت حسن منٹو کا ''حقہ پانی بند'' کر دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ برصغیر کے ترقی پسند ادیب اور دانشور محمد حسن عسکری کے خلاف اچانک شمشیرِ برہنہ کیوں بن گئے تھے؟ اس سوال کا جواب محمد حسن عسکری کی پاکستانیت میں پنہاں ہے۔ محمد حسن عسکری کے ہاں پاکستانیت اور ترقی پسندی کے مابین کبھی تصادم کی کوئی کیفیت نمودار نہیں ہوئی۔ مئی ۱۹۴۶ء میں ''پاکستان'' کے عنوان سے شائع ہونے والے مضمون میں عسکری صاحب اس حقیقت کا برملا اعلان کرتے ہیں کہ:

''اس وقت مسلم لیگ ہر قسم کی استعماریت، استبداد اور سرمایہ داری کی مخالفت کر رہی ہے، چونکہ مسلم لیگ چار سو فیصدی عوامی اور جمہوری جماعت ہے، چونکہ مسلم لیگ کا پاکستان براعظم ہندوستان میں سب سے پہلی عوامی اور اشتراکی ریاست ہوگا، اور پاکستان کا قیام نہ صرف مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ہوگا، بلکہ خود ہندو عوام کے لیے بھی، چونکہ دنیا سے سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور مستقل امن و امان قائم کرنے میں پاکستان سے بہت مدد ملے گی، اس لیے میں مسلم لیگ سے متعلق ہونا فخر کی بات سمجھتا ہوں۔''[۶]

تحریکِ پاکستان سے وابستگی پر یہ فخر اور قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب کی پاکستانی شناخت

سعادت حسن منٹو

کو سنوارنے، نکھارنے اور خونِ جگر سے سیراب کرنے کا عزم وعمل ہی محمد حسن عسکری کی وہ خطا ہے جسے انڈین کمیونسٹ پارٹی نے کبھی معاف نہیں کیا۔ یہاں جھگڑا نہ تو ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے مابین ہے اور نہ ہی اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مابین ہے۔ سارا جھگڑا متحدہ ہندوستانی قومیت اور جداگانہ مسلمان قومیت کے درمیان ہے۔ برصغیر میں جداگانہ مسلمان قوم پرستی کے جس انسان دوست تصور نے تحریکِ پاکستان کو عوامی، جمہوری اور انقلابی رنگ و آہنگ بخشا تھا اور جس سے وابستگی پر محمد حسن عسکری بجا طور پر نازاں رہے اصل جھگڑا اُس تصور پر تھا۔ عسکری صاحب نے رسالہ ''نئی زندگی'' الٰہ آباد کے ''پاکستان نمبر'' کے ردِ عمل میں زیرِ نظر مضمون مئی ۱۹۴۶ء میں سپردِ قلم کیا تھا۔ ڈاکٹر سیّد محمود کی ادارت میں یہ خاص نمبر اسلامیانِ ہند کو تصورِ پاکستان کے ''نقصانات'' سمجھانے اور قیامِ پاکستان کے امکانات سے ڈرانے کی خاطر مرتب کیا گیا تھا۔ رسالہ ''نئی زندگی'' کے اِس ''پاکستان نمبر'' (جلد ۶، نمبر ۱، الٰہ آباد ۱۹۴۶ء) کے قلمکار...... دارالعلوم دیوبند سے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا محمد میاں اپنے مذہبی استدلال کے ساتھ، قاضی عبدالغفار اپنے نفسیاتی دلائل کے ساتھ، سیّد سجاد ظہیر کے بھائی سیّد علی ظہیر صدر آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنے سیاسی مسلک کے تبلیغی جوش و خروش کے ساتھ اور فورمین کرسچین کالج لاہور کے پروفیسر عبدالمجید خان ''پاکستان کے خلاف چودہ نکات'' کے ساتھ بہ اعادہ و تکرار قیامِ پاکستان کے حق میں اسلامیانِ ہند کی اجتماعی رائے کی تکذیب میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ الیکشن کے ذریعے حاصل کی گئی مسلمانوں کی اجتماعی رائے کے بطلان کی اِس سعی نامشکور کے ردِ عمل میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:۔

''جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ اب کوئی خالص علمی مسئلہ تو رہا نہیں اور نہ کبھی تھا۔ یہ تو کروڑوں انسانوں کی موت اور حیات کا سوال ہے۔ جو چیز دس

کروڑ انسانوں کا جائز مطالب ہو اور جس کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی دنے کو بھی تیار ہوں، وہ تو سمجھیے کہ مل ہی گئی...... آج نہیں تو ایک دن دیر سے۔ پاکستان کا قیام تو اٹل ہے ہی۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ مسلمان ادیبوں کے لیے پاکستانی کیسی نعمت ہوگا۔ پاکستان میں مسلمان ادیب کو اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہوگا اور وہ عوام سے زیادہ یگانگت بھی محسوس کرے گا۔ اس کا رابطہ اپنے عوام سے زیادہ براہ راست ہوگا۔ غرضیکہ پاکستان اردو ادب کو ایک نئی زندگی بخشے گا اور اس میں زندہ قوموں کا لب ولہجہ پیدا ہو سکے گا۔''

جب دُنیا کے نقشے پر پاکستان ایک اٹل حقیقت بن کر نمودار ہوا تو محمد حسن عسکری نے بڑی سرگرمی کے ساتھ بیک وقت دومحاذوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اوّل، پاکستان کی ادبی اور تہذیبی شخصیت کے تخلیقی وتعمیری امکانات کی تلاش وتعبیر، دوم، زبان، ادب اور کلچر کے نام پر بھارتی اشتراکی جماعت کی تخریبی سرگرمیوں کا انسداد۔ پہلے دوسرے محاذ کی خبر سنیے۔ انڈین کمیونسٹ پارٹی کے سرکردہ لیڈر سیّد سجاد ظہیر نے ۹۔نومبر ۱۹۴۷ء کے ''نیا زمانہ'' میں یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے مجاہد ''بیرونی حملہ آور'' ہیں اور اس تحریک کو کچلنے میں مصروف بھارتی افواج ایک ''جمہوری نصب العین'' کے حصول کی خاطر کشمیر میں قتل وغارت کا بازار سجانے میں مصروف ہیں:۔

''کشمیری عوام اپنے وطن اور آزادی کو بچانے کے لیے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں ہر جمہوریت پسند کو ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ موجودہ حالات میں ہر ایماندار شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انڈین یونین کی حکومت کے تمام اقدامات کی حمایت کرے گا جو کشمیری عوام کی امداد کے سلسلے میں کیے جا رہے ہیں...... ہندوستانی حکومت نے اپنی جمہوری روایات کا زندہ ثبوت پیش کر دیا ہے...... کشمیر کی سرزمین پر ہندوستانی فوجیں ایک جمہوری نصب العین کے لیے لڑ رہی ہیں...... موجودہ تباہی سے بچنے کا صحیح راستہ یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوری حکومت کو سامراجی ایجنٹوں کے ساتھ تعاون کرنے سے روکیں۔''

اُس وقت کی پاکستانی حکومت سامراجی ایجنٹوں کے ساتھ تعاون کر رہی تھی یا نہ کر رہی تھی؟ اس سوال کو فی الحال جانے دیجیے اور اس حقیقت پر غور کیجیے کہ سید سجاد ظہیر بھارتی حکومت کے سامراجی عزائم کی تکمیل کی خاطر پاکستان کیوں آ براجے تھے اور بالآخر اپنے مقاصد میں ناکامی کے

بعد اپنے وطن بھارت کیونکر جا پہنچے تھے؟ سجاد ظہیر نے پاکستان میں اپنی روپوشی کے دوران انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کو بھارتی ایجنڈے کی تکمیل کا آلۂ کار بنانے کے لیے جو ریشہ دوانیاں کیں اُن کا بروقت تدارک محمد حسن عسکری نے کیا۔ اس ضمن میں اُن کے مضامین بعنوان ''مسلمان ادیب اور مسلمان قوم''، ''پاکستانی ادیب'' اور ''قائداعظم کے بعد'' بطور مثال پیش کیا جا سکتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے ساتھ اُن کی ادبی رفاقت کا اولین محرک بھی یہی اندیشہ ہائے دور و دراز ہیں۔

منٹو اور عسکری کے اشتراکِ عمل سے جاری ہونے والے رسالہ ''اُردو ادب'' کے پہلے شمارے کا پہلا صفحہ قائداعظم محمد علی جناح کی یاد میں ایک ایسے مقالۂ افتتاحیہ سے شروع ہوتا ہے جس کی ایک ایک سطر خونِ دِل میں ڈبو کر لکھی گئی ہے اور جس میں بابائے قوم کو عہدِ حاضر کے اہلِ جذب وجنوں میں شمار کیا گیا ہے:۔

> ''قوم پر یقین اور ایمان کے علاوہ جناح میں ایک اور بات ایسی تھی جو اقبال کے سوا ہمارے زمانے کے کسی اور شاعر یا ادیب کو بھی نصیب نہیں ہوئی یعنی ایک عظیم خیال پر پورا اعتقاد۔ جب انہیں ایک مرتبہ یقین آ گیا کہ یہ ایک عظیم خیال ہے تو پھر وہ مادی رکاوٹوں کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ جناح کا شمار یقیناً انسانی تاریخ کے عظیم تصور پرستوں میں ہوگا۔ محض ایک تصور کی بنیاد پر اپنے آپ کو تخلیق کے لیے آمادہ کرنا، ایک پوری قوم کے اندر تخلیقی جذبہ ابھارنا، نفی کو اثبات میں تبدیل کرنے کا خیال دل میں لانا...... ان چیزوں کے لیے ایک بڑے شاعر کی شخصیت اور تخیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام قسم کا آدمی تو ایسے تصور کے بوجھ ہی سے پس کے رہ جائے۔ جناح کی شخصیت اور اس کے کارنامے کو شاعر کے تخیل سے بھڑانا محض شاعری نہیں ہے۔ جناح واقعی اہلِ جذب اور اہلِ جنوں میں سے تھا، بس اتنا ہی تو ہے کہ وہ از خود رفتہ نہیں ہوا۔''

اسی جریدہ کے اسی شمارے میں محمد حسن عسکری کا عہد آفریں مقالہ ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' شائع ہوا تھا جس میں عسکری صاحب نے گذشتہ ایک سو سال کے دوران مسلمان ادیب کی اپنی قوم سے بڑھتی ہوئی لاتعلقی کا حقیقت افروز تجزیہ کیا تھا اور مسلمان ادیب سے یہ تقاضا کیا تھا کہ وہ انسانی مسائل پر دل سوزی کے ساتھ سوچتے وقت اپنی مسلمان شناخت سے شرمانے کی بجائے اُس پر فخر کرے۔ اسی زمانے میں منٹو نے ''میرا صاحب'' کے عنوان سے بابائے قوم کا شخصی مرقع

پیش کیا تھا۔ منٹو کی اس مرقع نگاری سے ہمارے ہاں قائد شناسی کی اُس روایت کا آغاز ہوتا ہے جس میں عام اور غریب مسلمان کے دِل میں قائدِ اعظم کی لازوال محبت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر پاکستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے سعادت حسن منٹو کو رجعت پسند قرار دے دیا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ منٹو کا بائیکاٹ کرنے والی اس تنظیم کے سربراہ منٹو کے عزیز ترین دوست احمد ندیم قاسمی تھے جنہوں نے منٹو کی اس ''گمراہی'' کی ساری ذمہ داری محمد حسن عسکری پر ڈال دی تھی۔ وقت نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ غلطی پر منٹو اور عسکری نہ تھے بلکہ انڈین کمیونسٹ پارٹی کی تراشیدہ پارٹی لائن کی غلامانہ پیروی کے مرتکب پاکستانی ترقی پسند تھے۔ منٹو اور عسکری ہر دو کی غلطی اگر کوئی تھی تو وہ اُن کی سچی اور کھری پاکستانیت تھی۔

اپنے افسانوی مجموعہ ''یزید'' کی اختتامی غیر افسانوی تحریر میں سعادت حسن منٹو نے اپنے فکر و فن پر شہر بمبئی (ممبئی) کے احسانات گنوائے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ''یہاں بارہ برس رہنے کے بعد جو کچھ میں نے سیکھا، یہ اُسی کا باعث ہے کہ میں یہاں پاکستان میں موجود ہوں۔ یہاں سے کہیں اور چلا گیا تو وہاں بھی موجود رہوں گا۔'' جب وہ بھارت سے پاکستان کا مطلب ''سیکھ'' کر لاہور وارد ہوئے تو پاکستان میں آدرش فراموشی اور اشیاء پرستی کا چلن عام ہوتے دیکھ کر اُنہیں سخت صدمہ ہوا۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے غصہ تھا اس لیے کہ میری بات کوئی بھی نہیں سنتا تھا۔ ملک میں افراط وتفریط کا عالم تھا۔ جس طرح لوگ مکان اور ملیں الاٹ کروا رہے تھے، اسی طرح وہ بلند مقاموں پر بھی قبضہ کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتا تھا کہ اتنے بڑے انقلاب کے بعد حالات وہ نہیں رہیں گے جو پہلے تھے۔ پرانی پگڈنڈیاں بڑی سڑکیں بنیں گی یا ان کا وجود ہی مٹ جائے گا، اس کے متعلق وثوق سے اس وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ غیر کی حکومت اور اپنوں کی حکومت میں کیا فرق ہوگا، اس کے بارے میں بھی حتمی طور پر کوئی قیاس آرائی نہیں ہو سکتی تھی۔ فضا کیسی ہوگی؛ اور اس میں خیالات و احساسات کی نشوونما کیوں کر ہوگی۔ ریاست اور حکومت سے فرد اور جماعت کا رشتہ کیسا ہوگا یہ ایسی باتیں تھیں جن پر انتہائی غور و فکر کی ضرورت تھی۔ یہ کام ایسا تھا، جس میں ہمیں بیرونی نسخوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے نام نہاد

دانشوروں نے بڑی جلد بازی سے کام لیا اور قیادت کے شوق میں اپنا نیم رس جوہر پیالی میں ڈال دیا جہاں وہ عدم نگہداشت کے باعث گلنے سڑنے لگا۔ادب کے ان ترقی پسند ٹھیکے داروں نے پہلے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت کا کوئی رکن سرکاری پرچے میں کام کرے گا نہ اس کے لیے لکھے گا۔ میں نے اس کی مخالفت کی اور ان کو سمجھایا کہ یہ اقدام صریحاً غلط ہے۔ غلط ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز ہے۔''

سعادت حسن منٹو قیامِ پاکستان کو ایک معمولی واقعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ''ایک بڑے انقلاب '' سے تعبیر کرتے ہیں اور پاکستان کے اندر پاکستان کے تصور کے مطابق ایک انقلابی معاشرے کی تشکیل کے خواب کو برق رفتاری کے ساتھ عملی زندگی کے قالب میں ڈھالنے کے آرزومند ہیں جبکہ ادیب اور حکومت ہر دو اس فرض سے غافل دکھائی دیتے ہیں۔منٹو نے جہاں ترقی پسند ادیبوں پر کمیونسٹ پارٹی کی نظریاتی آمریت کی مذمت کی وہاں حکومت کے گھسے پٹے احتسابی حربوں کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا:۔

''ہماری سرکار نے بھی یہی مضحکہ خیز بات کی، مگر کچھ دیر کے بعد جبکہ ترقی پسند اپنی عدم تعاون کی قرارداد کا ڈھول کافی اونچے سُروں میں پیٹ چکے تھے۔ ریڈیو کی نشریات اور سرکاری پرچوں کے اوراق ترقی پسندوں کے افکار کے لیے بند کر دیئے گئے ۔ بعد میں کچھ ترقی پسند ''امرت دھارا ایکٹ'' کے تحت جیل میں ٹھونس دیئے گئے ۔حکومت حماقت کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے جو حماقتیں پے در پے اس سے ترقی پسندوں کو خاموش کرنے میں سرزد ہوئیں، میں ان پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے افسوس ہے کہ احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ جو بڑے بے ضرر قسم کے انسان ہیں، جن کی دماغی اور جسمانی ساخت لفظ سازش کے صحیح معنوں کی متحمل نہیں ہوسکتی، بیکار جیل میں ڈالے گئے۔ ایک کو بھائی بنانے کا شوق ہے، دوسرے کو بہنیں۔ معلوم نہیں دونوں کے اس معصوم شغل میں سیاسی ردعمل کی شرارت حکومت کو کہاں سے نظر آ گئی۔ غصے میں آ کر، بغیر سوچے سمجھے، حکومت نے ان لوگوں کو جیل میں ڈال دیا۔''

منٹو اپنے استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے حکومتِ پاکستان اور انجمن ترقی پسند مصنفین ، ہر دو کو پاکستانی ادب میں جمود کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:۔

''حکومت اور ترقی پسند مصنفین کی جماعت، دونوں احساس کمتری کا شکار ہوئے۔ مجھے اس کا افسوس تھا اور اب بھی ہے۔ زیادہ افسوس ترقی پسندوں کا تھا جنہوں نے خواہ مخواہ سیاست کے پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑائی۔ ادب اور سیاست کا جوشاندہ تیار کرنے والے یہ عطائی کریملن کے تجویز کردہ نسخے پر عمل کر رہے تھے۔ مریض، جس کے لیے جوشاندہ بنایا جا رہا تھا، اس کا مزاج کیسا ہے، اس کی نبض کیسی ہے، اس کے متعلق کسی نے غور نہ کیا۔ نتیجہ جو ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے کہ آج سب ادب کے جمود کا رونا رو رہے ہیں۔''

یہاں یہ بات یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی ادب میں جمود کا سوال سب سے پہلے محمد حسن عسکری نے اُٹھایا تھا۔ ترقی پسند اور جدید ادیب اس سوال کی معنویت کو نہ اُس وقت سمجھے تھے اور نہ آج سمجھتے ہیں۔ اس سوال کی اصل معنویت قیامِ پاکستان کے عظیم الشان واقعہ کے تہذیبی اور تخلیقی امکانات سے منٹو اور عسکری کے ہم عصر ترقی پسند اور جدید ادیبوں کی غفلت میں پوشیدہ ہیں۔ منٹو نے اپنا متذکرہ بالا مضمون بعنوان '' جیب کا کفن'' ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سپردِ قلم کیا تھا۔ نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود یہ '' غفلت'' جوں کی توں موجود ہے۔ اس لیے منٹو اور عسکری کا اُٹھایا ہوا یہ سوال آج بھی ہم سے جواب کا طالب ہے۔

حواشی

۱ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے پروفیسر سجاد شیخ کے درج ذیل مضامین:
۱۔ منٹو اور سامراج دشمن جدوجہد، رسالہ دستاویز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء
۲۔ منٹو اور روسی ادیب، رسالہ دائرے، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء

۲ بحوالہ افسانوی مجموعہ '' چغد'' ...... دیباچہ۔

۳ باری صاحب، صفحہ ۷۱، منٹونما، لاہور، ۱۹۹۹ء

۴ تفصیلات کے لیے دیکھیے: '' میرے ہمسفر'' از احمد ندیم قاسمی، لاہور، صفحات ۶۷ تا ۸۸، ۲۰۰۲ء۔

۵ اردو ادب ۲، لاہور، ص ۳۱۷۔

۶ مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۳۱۔

مشرف عالم ذوقی
ترجمہ: نبی احمد

منٹو کو آپ نے ''پاکستانی'' کیوں بنا دیا ہے انتظار بھائی......

اُردو افسانہ جب 'سپاٹ بیانی' کے عہد میں سانس لے رہا تھا۔ منٹو کی شکل میں غلامی اور فرقہ واریت کے ماحول سے ایک ایسے فنکار نے جنم لیا، جس کی ٹیڑھی میڑھی 'کافر' کہانیاں، اُردو کہانیوں کی ایک نہ بھولنے والی تاریخ بن گئیں۔ وہی منٹو جس نے ہندوستان میں جنم لیا۔ ہندوستان میں دھکے کھائے۔ ممبئی اور تب کے 'بامبے' کے فلم اسٹوڈیوز میں نوکری کی اور جس کا 'آئرن مین' ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی 'نومینس لینڈ' کے اس طرف جانے میں یقین نہیں رکھتا تھا، کیا منٹو آن کی آن میں پاکستانی بن گیا......؟

ساہتیہ اکادمی کی شائع کردہ پاکستانی کہانیاں (انتخاب، پیش لفظ): انتظار حسین، آصف فرخی، ترجمہ: عبدل بسم اللہ سے سب سے پہلا بنیادی سوال تو یہی ہے۔ پاکستان بن جانے اور آخری دنوں میں پاکستان چلے جانے بھر سے کیا منٹو پاکستانی ہوگیا...... کیوں کہ ترتیب دی گئی ۳۲ کہانیوں میں سے پہلی کہانی 'کھول دو' منٹو کے 'پاکستانی' قرار دیئے جانے کی جو روئیداد سناتی ہے، وہ ہمیں قبول نہیں۔

ساہتیہ اکادمی سے آگے یہ سوال پوچھا جائے گا کہ ایسے اہم اور نادر انتخاب کے مترجم کی تمہید محض ایک چوکیدار کی کیوں......؟ اور وہ بھی تب جب مترجم اُردو اور ہندی دونوں ادب کا ایک جانا مانا نام ہے عبدل بسم اللہ...... دوران تنقید بہت سے سوالوں کا جواب بسم اللہ دے سکتے تھے۔ لیکن تب، جب چوکیدار سے آگے اُن کے ادبی وزن کو پرکھا جاتا۔ جیسے ایک سوال تو عام طریقے سے انتخاب کرنے والے یعنی آصف فرخی اور انتظار بھائی سے پوچھا ہی جاسکتا ہے کہ بھائی، اس انتخاب کی بنیاد کیا تھی؟ اور ۳۲ کہانی کاروں کے انتخاب میں ایک طرف جہاں آپ

نے منٹو کو پاکستانی بنا دیا، وہاں کئی بے حد اہم نامی چھوڑ کیوں دیئے؟ مثال کے طور پر جیسے: زاہدہ حنا، آغا بابر، غلام الثقلین نقوی، آغا سہیل، نجم الحسن رضوی...... اس طرح دیکھا جائے تو مرزا حامد بیگ اور آصف فرخی کے عہد سے بھی کئی نام اس انتخاب میں شامل کیے جاسکتے تھے۔ مثلاً، ناصر بغدادی، مشرف حسین تارڑ، سائرہ ہاشمی، احمد جاوید وغیرہ۔ صرف یہ کہہ دینے بھر سے، یہ کوئی نمائندہ انتخاب نہیں ہے، بات نہیں بنتی ہے۔ زاہدہ حنا جیسی اہم مصنفہ کا شامل نہ ہونا مصلحت آمیز لگتا ہے۔ تمہید کے تحت اپنے انتظار بھائی نے کئی بہت ہی 'دلچسپ' باتیں اپنے قارئین کے سامنے رکھی ہیں۔ مثلاً...... پاکستان بننے کے تھوڑے عرصے بعد ہی ہمارے ادب میں یہ سوال کھڑا ہوگیا تھا کہ پاکستانی ادب کی اپنی پہچان کیا ہے؟

ممکن ہے، منٹو والی غلط فہمی بھی اسی پاکستانی ادب کی پہچان سے جنمی ہو...... کیوں کہ شناخت کی یہ وہی پھیلائی گئی غلط گو باتیں تھیں۔ جس کا شکار خود منٹو کا کردار ٹوبہ ٹیک سنگھ ہوا تھا۔ پاگل کہے جانے والے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی فکر بھی یہی تھی۔ ہندوستانی کون اور پاکستانی کون؟ شاید یہی فکر منٹو کی بھی رہی ہو۔ نتیجے کے طور پر ٹوبہ ٹیک سنگھ نے جس جگہ اپنی جان دہ کی، وہ جگہ نہ ہندوستان کی تھی، نہ پاکستان کی...... وہ نومینس لینڈ تھی۔ منٹو کا آخری وقت میں چلا جانا بدقسمتی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہی منٹو تھا جو زندگی بھر بٹوارے کے خلاف میں لکھتا رہا۔

پاکستانی ادب کی پہچان کا معاملہ دلچسپ ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے منٹو کا کردار ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ تقسیم سے پہلے تک تو سارے ہندوستانی تھے۔ پھر پاکستانی ادب کا فرق کیسے سمجھا جائے۔

انتظار بھائی آگے لکھتے ہیں...... ''ایک تقاضہ یہ بھی تھا، جب ایک ملک بن گیا ہے اور ہم ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں تو ہمارے ادب کو بھی ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی الگ شناخت ہو۔''

لیکن یہیں پر انتظار بھائی مار کھا گئے۔ تقسیم کے عہد یا دوقومی نظریئے کی بات چھوڑ دیجیے تو ۵۴ برسوں کے بعد بھی آپ اس شناخت کے سوال پر بٹوارے کی لکیریں نہیں کھینچ سکتے۔ اندازِ فکر کی سطح پر بھی ادب کا بٹوارہ نہیں ہوسکا۔

لیکن ایک ''دلچسپ'' بات کا جاننا ضروری ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سے ہی علیحدہ پاکستانی ادب، کی مانگ نے بھی سر اٹھانا شروع کیا تھا۔ آصف فرخی کے نانا یعنی حسن عسکری نے سب سے پہلے اس الگ پاکستانی ادب کی وکالت کی اور 'منٹو' جیسے عوامی مصنف کو 'نئے اسلامی جمہوریہ کی نئی تمہید میں دیکھتے ہوئے پاکستانی قرار دے دیا۔ منٹو بیچارہ جو ۴۷ کی تقسیم کے بعد ۴۸

میں پاکستان گیا وہ بھی اپنی بیوی کے زور دینے پر اور ۵۵ میں منٹو کی موت بھی ہوگئی۔ مگر عسکری اُسے ہر سطح پر پاکستانی قرار دینے میں لگے رہے۔ ایک وقت میں جا تک اور پنچ تنتر کہانیوں کے تخلیق کار انتظار حسین بھی پاکستان اور اسلامی ادب سے گزرتے ادب کی مانگ لے کر سامنے آئے تھے۔ شاید اسی لیے پاکستانی کہانی کو ایک دم الگ آنکھ سے دیکھنے کی کارروائی زور پکڑ چکی تھی۔

''پاکستانی اگر الگ قوم ہے تو اِس کی قومی اور تہذیبی شناخت کیا ہے اس کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور اس کی جڑیں کہاں ہیں؟''

ہم یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستان سے نکلے پاکستان کی تہذیبی شناخت کی جڑیں ہمیشہ سے ہندوستان میں ہی گڑی تھیں اور گڑی ہیں۔ ان کی تاریخ بھی ہندوستان سے ہی شروع ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے الگ قومی اور تہذیبی شناخت ڈھونڈنے کی کارروائی اُنہیں بار بار زخمی کرتی رہی ہیں۔ سیاسی اکھاڑے سے ادب کے اسٹیج تک کا بھٹکاؤ اسی کنفیوژن کی دین ہے۔ یہ سب لکھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ منٹو پر جو صرف 'آخر ایام' کے سات سال تک، پاکستان رہا۔ آپ پاکستانی ہونے کی مہر نہیں لگا سکتے۔

انتخاب کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے آصف فرخی نے لکھا ہے کہ انتخاب میں کچھ ایسی بے حد مشہور کہانیوں سے بچا گیا ہے، جو پاکستانی کہانیوں کا خیال کرتے ہی ذہن میں آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر خالدہ حسین کی 'سواری' اشفاق احمد کی 'گڑیا' وغیرہ۔ اشفاق احمد کی گڑیا کوئی کہانی نہیں ہے۔ سب سے مشہور کہانی گدڑیا ہے۔ تصحیح کے کالم میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ انتخاب کرنے والوں نے پاکستان بننے کے بعد کی کہانیوں کو فوقیت دی ہے۔ یعنی وہ کہانیاں نئے پاکستان کے مسائل کو اٹھا سکتی ہوں۔ لیکن اس انتخاب میں کچھ کہانیاں جیسے 'گملے میں اُگا شہر' کو چھوڑ دیا جائے تو نئے پاکستان کے منظ نامے کی کمی ملتی ہے۔ انتخاب کرنے والوں کو اگر کم مشہور کہانیوں کا ہی انتخاب کرنا تھا، تو منٹو کی 'کھول دو' یا ممتاز مفتی کی 'سے کا بندھن' کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ جہاں تک نئے 'پاکستانی منظر نامے' کی بات ہے، تو عرض ہے غلام عباس کی 'فینسی ہیئر کٹنگ سیلون' کی جگہ کتبہ کا انتخاب ہونا چاہیے تھا۔ جہاں ایک آدمی اپنے گھر میں لگائے جانے والے نیم پلیٹ کی آس لیے مر جاتا ہے اور یہ نیم پلیٹ اس کے 'کتبے' کے طور پر کام آتا ہے۔ نئے پاکستانی منظر نامہ میں یہ کہانی پوری طرح ٹھیک بیٹھتی ہے۔ اس طرح میرے خیال سے احمد ندیم قاسمی کی کہانی 'قتل' کی جگہ 'بین'، انور سجاد کی سنڈریلا کی جگہ 'گائے' خالدہ حسین کی 'ہزار پایا' کی جگہ 'پرندہ'، محمد منشایاد کی پانی سے گھرا

پانی، کی جگہ راستے بند ہیں، شامل کی جانی چاہیے تھی۔ آخر میں کچھ اور افسانہ نگاروں کا اس انتخاب میں شامل ہونا انتخاب کو سوالیہ نشان میں کھڑا کرتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی 'یا خدا' اور 'ماں جی'، جمیلہ ہاشمی کی 'بن باس' اختر حسین رائے پوری کی ''مجھے جانے دو'' ابوالفضل صدیقی کی 'جوالا مکھی' احمد علی 'ہماری گلی' مرزا ادیب کی 'دل ناتواں' اور ناقد محمد حسن عسکری کی 'چائے کی پیالی' کو بھی شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ، ابوالفضل صدیقی اور عزیز احمد کو چھوڑنے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آئی۔

دراصل اس انتخاب کی سب سے بڑی غلطی تھی، دو الگ الگ پیڑھیوں کے افسانہ نگار کا انتخاب...... چناؤ...... نوجوان آصف فرخی اور انتظار صاحب کے بیچ خیالوں اور اصولوں کی لمبی دیوار کھڑی ہے۔ ممکن ہے کہانیوں کے انتخاب کے درمیان بھی خیالات کا یہ ٹکراؤ سامنے آیا ہو۔

ایسے نازک ترجمے میں مترجم کی تمہید سب سے اہم ہو جاتی ہے۔ گیان پیٹھ ہو، نیشنل بک ٹرسٹ یا ساہتیہ اکادمی، میری سب سے ہی گزارش ہے ایسی ادبی تخلیق کے ترجمہ کے وقت مترجم کا اپنا صفحہ ضرور ہونا چاہیے۔ جہاں وہ اپنی سطح پر کوئی حتمی رائے دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔
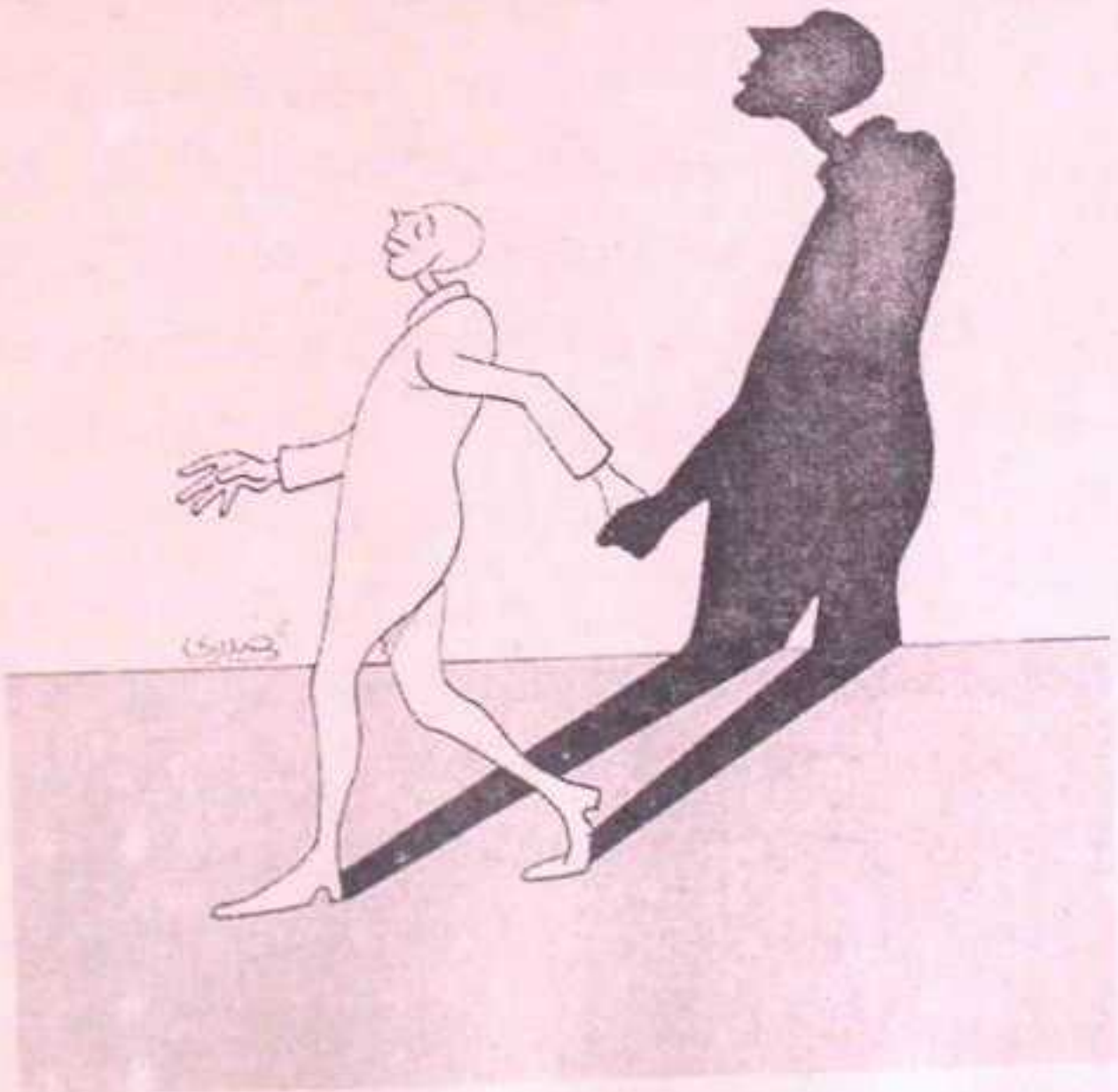
کھیم چند
ترجمہ: نبی احمد

منٹو پاکستانی نہیں تو کیا ہندوستانی تھے؟

ساہتیہ اکادمی، دہلی سے شائع شدہ کتاب ''پاکستانی کہانیاں'' میں شریک منٹو کی کہانی 'کھول دو' کو لے کر یہ سوال ذہن میں اُٹھنا لازمی ہے کہ منٹو کو پاکستانی یا پاکستانی افسانہ نویس کہنا کتنا درست یا کتنا غلط ہے۔

جناب مشرّف عالم ذوقی صاحب نے کتاب کے مدیر جناب انتظار حسین سے ٹھیک ہی پوچھا ہے کہ منٹو کو آپ نے پاکستانی کیوں بنا دیا؟ مگر بہت دور تک تفصیل میں جانے کے دوران ذوقی صاحب کے ذہن میں یہ کیوں نہیں آتا کہ یہی سوال پلٹ کر پوچھے گا کہ اگر منٹو پاکستانی نہیں ہیں تو پھر ہندوستانی کیسے ہوسکتے ہیں؟ ذوقی صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ قابلِ غور ہے، بہت اہم ہے اور اُس پر توجہ ضروری ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس پر ہندی رسالے کے لیے ردِّعمل دیونا گری میں لکھ کر بھیجنا، وہ بھی 'ہنس' جیسے رسالہ میں، جہاں جناب ابھینو اوجھا صاحب اپنی تیز نگاہ کے ساتھ نقطہ نقطہ جانچنے کے لیے خوبصورت لٹھ لے کر تعینات ہیں، بہت خطرناک معاملہ ہے۔ میرا حال بھی منٹو جیسا ہے...... نہ یہاں کے، نہ وہاں کے...... بہرحال، ذوقی صاحب نے منٹو کو ہندوستانی مانتے ہوئے جو کچھ کہا ہے۔ اُس کے مطابق نیچے لکھا خاکہ بنتا ہے۔

۱۔ منٹو زندگی بھر ملک تقسیم کی خلاف لکھتا رہا۔

۲۔ منٹو اپنی بیوی کے زور دینے پر ۱۹۴۸ء میں پاکستان گیا...... جہاں ۱۹۵۵ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔

۳۔ ہندوستان سے 'نکلے' پاکستان کی تہذیبی شناخت کی جڑیں ہمیشہ سے بھارت میں ہی گڑی ہیں۔ ان کا اتہاس ہی ہندوستان سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے منٹو ہندوستانی ہیں۔

نتیجتاً وہ منٹو کو ہندوستانی بھی نہیں، بلکہ 'بھارتیہ' بتا رہے ہیں۔ یہاں آ کر وہ قریب قریب ''گرو سے کہو، ہم بھارتیہ ہیں'' کے اُس قومی ذہن کی طرف داری کرنے لگتے ہیں جو آج تک ہمیں

دکھاوٹی اور بناوٹی لگتا رہا ہے۔ میں غلط بھی ثابت ہوسکتا ہوں۔ اس میں دیر ہی کیا لگے گی؟ میں کبھی اکثریت میں نہیں رہا۔ قوم پرستی کا ہمارا یہ جذبہ ذاتی بھی ہوسکتا ہے۔ مگر منٹو جیسے بغاوتی ادیب کو یہ کیسے زیب دے سکتا ہے؟ علامہ اقبال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' لکھنے کے باوجود نہرو کو انگوٹھا دکھا کر، ڈنکے کی چوٹ پر پاکستان چلے گئے تھے۔ کیا ہم انہیں ہندوستانی ثابت کر سکتے ہیں؟ اُن کی مرضی کے خلاف؟ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ اندر سے خوش نہیں تھے...... خوش تھا ہی کون؟

لیکن کیا ہم چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے، کیا وہ تب سے لے کر اب تک یہاں کے دلتوں کی طرح بے بیزاری یا دہشت میں نہیں جی رہے ہیں؟ آپ قوم کی بات کر رہے ہیں۔ کیا قوم کے نام ہی اُنہیں اس ملک میں رہتے دیش نکالا نہیں ملا ہوا ہے؟ اُنہوں نے پاکستان دیکھا بھی نہیں ہے اور پاکستانی سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کا پاکستان یہیں بنا دیا گیا ہے...... تاکہ جب رام کی مرضی ہو، اُنہیں ستایا یا زبردستی فیصلہ سنایا جاسکے۔ باقی لوگ بھلے ہی ملک بیچ کر راجدھانی میں موج اُڑائیں...... مسلمان آہ بھی کریں گے تو اُن پر شک کیا جائے گا۔ ہم تو ذات کے کوڑھ میں ہی جیتے چلے جائیں گے، وہ چار اینٹوں کا مذہب بھی نہیں نبھا سکتے۔ دونوں طرف کے سیاسی غنڈوں کی حرکتوں کی سزا عام مسلمانوں کو اپنا سب کچھ لٹا کر دینا پڑتا پڑتی ہے۔ اُن کی ذراسی غلطی پر ان کے ایک ایک عیب کے قصے دوہرائے جانے لگتے ہیں۔ صدیوں سے جمع ہمارا نامرد گھمنڈ اُن کی لڑکیوں کی عصمت اور پیٹ میں پل رہے بچوں تک پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اُن کی حسرتوں اور عبادت گھروں پر بلڈوزر پھر جاتے ہیں۔ جب تک ہماری اپنی ہی سانس نہ پھول جائے۔ منٹو ہوتے تو کیا اس کند ذہن 'ہندستانیت' سے تہذیب سیکھ رہے ہوتے؟ پاکستان اُن کے لیے جہنم تھا...... اس سے یہ ثابت کیسے ہوجاتا ہے کہ ہندوستان اُن کے لیے جنت تھا یا ہو یا؟ دونوں طرف لکھی گئی اُن کی کہانیاں دونوں طرف کے دوزخ کے افسانے بیان کرتی رہیں۔

معاف کیجیے، ذوقی صاحب، آپ کی ہندوستانیت پر میں شک نہیں کر رہا۔ وہ نیک اور صاف ستھری ہی ہوگی۔ منٹو کے بہانے میں کسی بے شعوری بحث کا آغاز بھی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ کوئی بھی سچا ادیب قوم پرست نہیں ہوسکتا؟ منٹو جیسا ادیب تو کبھی نہیں...... لال کرشن اڈوانی، ٹھاکرے، سنگھل، کٹیار اور سدرشن جیسوں کے لیے اِن لیبلوں کو چھوڑ دیجیے...... قوم ایک بھیڑ ہے اور اُسے بھیڑ پسند نمائندے چاہیے۔ ادیب کے لیے اور بہت بہتر اور موزوں لفظ

موجود ہیں۔ بہت ساری کتابوں کے مصنف...... ہندوستان کے ایک صدر، ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن نے اپنی ایک کتاب میں کہا ہے: ''قومیت زہر سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔'' وویکانند نے کہا ہے، ''حقیقت میں ہندوستان نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ میں نے بھارت کے لیے کیا ہے۔ وہاں تو مجھے روٹی کے ٹکڑے کے لیے ڈلیا بھری گالیاں ملی ہیں۔ ساری دنیا میرا دیس ہے۔ فرض تو ایک فضول بکواس چیز ہے۔ یہ جسم کہیں بھی رہے یا نہیں رہے، اس کی مجھے کیا پرواہ!'' (سوامی وویکانند ساہتیہ سنچین، ۸ واں ایڈیشن، رام کرشن مٹھ، دھنتولی، ناگ پور) ان لوگوں نے ایسی ''راشٹر مخالف'' باتیں کیوں کہی ہیں؟ کیا آپ تک ہمیں اس سوال کا کوئی ٹھیک سے جواب نہیں پالینا چاہیے تھا؟ جتنی دیر کریں گے، قوم کے نام پر اُتنی بار بے موت مریں گے۔

منٹو جیسا آدمی تو یوں بھی ہر ملک میں اچھوت ہے...... اور اُسے جب جہاں اُمید نظر آتی ہے، وہ وہیں نکل پڑتا ہے۔ منٹو کسی 'پاکستان' نہیں گیا تھا اور نہ ہی اپنے پیارے ہندوستان سے گیا تھا۔ یہ تو ایک پاگل خانے سے دوسرے پاگل خانے جا پہنچا تھا...... ۱۹۴۷ء کو اس نے ہندوستان میں خوب بھگت لیا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے بجائے اُسے کچھ اور دن کی زندگی اُسے پاکستان میں نظر آئی ہوگی۔ کیوں کہ کسی بھی طرح سے قوم پرست مسلمان نہ ہونے پر بھی وہ وہاں قدرتی موت یا اپنی چنی ہوئی وحشت سے مر سکتا تھا۔ چنی ہوئی 'زندگیاں' اس کی بھی تھیں۔ مگر وہ انہیں اپنے قلم کے ذریعے خوب بلواتا تھا۔ قومی جنون کی وحشت سے نکلی دہشت سے، اُسے اپنی ذاتی وحشت زیادہ عزیز تھی۔ گجرات میں جن عورتوں اور بچوں پر گروہ کے وحشیوں نے من مانے وقت تک قہر برپائے۔ اُن کے ماں باپ نے اگر دہشت کے وقت یہ سوچا ہو کہ کیوں نہیں وہ پاکستان چلے گئے تو کیا غلط سوچا؟ جو ہندو اپنی آسانی کے لیے دنیا بھر کے امیر ملکوں میں جا کر بس جاتے ہیں۔ اُن سے کیا کوئی ہندوستانی حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ مانگتا ہے؟ منٹو جیسے بہت سے لوگ جس دہشت کے تحت پاکستان گئے تھے وہ دہشت حال ہی میں ''قوم'' کے نئے گھنونے پن سے بڑھ گئی ہے۔ ہم اور آپ احتیاطاً کچھ بھی کہہ لکھ لیں۔ جن پر گزرتی ہے۔ اُن کے لیے ملک کیا، جہان کیا! اُن کے لیے کائنات بھی بے مطلب ہو جاتی ہے اور جو افورڈ کر سکتے ہیں وہ شان سے سوئٹزرلینڈ میں بھی ہندوستانی ہو کر جی سکتے ہیں اور زکام کا علاج کرانے نیویارک، پیرس یا فرانس جا سکتے ہیں۔ یا ہمارے وزیراعظم کی طرح اپنے منالی والے گاؤں کے شاہی بنگلے میں جنت کے مزے لوٹ سکتے ہیں۔ (اتفاق سے مایاوتی اور کانشی رام بھی اُسی گاؤں کے ایک ہوٹل میں ۱۰ اپریل ۲۰۰۲ء کو نجی

پرواز پر پہنچے تھے) لیکن جو زیادہ تر لوگ تھوڑے میں ہی اپنی کام چلاؤ زندگی جینے کو راضی ہیں۔ وہ اپنے ہی ملک میں ہمیشہ دہشت زدہ ہیں۔

آپ کہتے ہیں کہ منٹو بیوی کے زور دینے پر پاکستان گیا۔ ٹھیک! تو کیا اس کے زور دینے پر بیوی نہ مان جاتی؟ اگر نہیں مانی، تو کیوں؟ یوں کہ دنگوں کو جتنا اقلیتوں کی عورتیں جانتی ہیں، مرد نہیں جانتے۔ اکثریت کے مرد تو اور بھی نہیں۔ قومی اخباروں میں بکواس جتنی مرضی کرلیں۔ منٹو جس ملک کا تھا اور اُس کی ''تہذیبی اور قومی شناخت'' کیا ہے۔ اسے جاننے کے لیے اُس کے حال چال کو کیوں نہ دیکھ لیا جائے!

۱۹۴۰ء میں، جب نہرو کا ہندوستان بھی نہیں تھا۔ منٹو اور کرشن چندر نے مل کر ایک افسانہ لکھا تھا...... 'بنجارا'...... خانہ بدوش جب مل بیٹھیں گے تو 'بنجارا' ہی تو لکھیں گے! منٹو نے اس کے علاوہ اور کوئی کہانی کسی کے ساتھ مل کر نہیں لکھی۔ دونوں کے پاس ان دنوں پہننے لائق کپڑے نہیں تھے۔ فلم بنانے کے لیے، پرتولنے والے ایک نوسیکھیے کو، انہوں نے یہ کہانی پانچ سو روپے میں بیچی...... اور بڑھیا کپڑا خرید کر کشمیری گیٹ کے عبدالغنی ٹیلر ماسٹر کے پاس اپنے آپ کو نپوا لیا...... جب تک سلے ہوئے سوٹ لینے جاتے، باقی کے روپے اڑا لیے۔ اُدھاری کر کے سوٹ لے آئے۔ مگر اُدھار چکا نہیں سکے۔ ایک عن عبدالغنی نے سرے عام منٹو کا گریبان پکڑ لیا۔ دونوں بہادر انقلاب ڈر گئے۔ مگر عبدالغنی نے منٹو سے پوچھا...... ''یہ 'ہتک' تم نے لکھی ہے؟'' ''ہاں...... تو؟'' منٹو نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ عبدالغنی نے اُس کا گریبان چھوڑ کر کہا۔ ''جاؤ، اُدھار کے پیسے معاف کیے''...... منٹو کو یہ بات بہت چُبھ گئی اور اُس نے پائی پائی چکا دینے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن نہ تو وہ چکا پایا، نہ کرشن چندر...... منٹو بغیر گالی دیئے کسی بھی دوست سے نہیں بھاتا تھا۔ کرشن چندر سے بھی اس کی دوستی ویسی ہی تھی جیسے ڈیسنٹ کمار کی شانی سے تھی۔ نہ نگلتے بنتی نہ اُگلتے۔ کسی بھی پبلشر سے بغیر لڑائی کے نہیں رہا۔ بہت تلخ بولتا تھا۔ لیکن اندر سے کتنا رنگیلا تھا۔ اُسے 'کھرچنے' والے ہی جانتے تھے اور اس کے لیے روتے تھے۔ ترقی پسند بھی...... اور غیر ترقی پسند بھی لیکن وہ دونوں سے ہی ہمیشہ ناراض رہا۔ اُس کی نفرتوں کے اندر ہمیشہ محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ جیسا کہ ہوتا ہے۔ سچ لکھنے والے دوسرے مصنفوں کی طرح اس پر بھی مقدمے چلے۔

کچھ ایسا تھا اُس کا حال چال......

اپنی بیالیس برس کی زندگی کے سات سال اُس نے پاکستان میں کاٹے۔ جب وہ مرا تھا تو

ریڈیو پاکستان نے کہا تھا کہ وہ دل کی دھڑکن بند ہونے سے مرگیا۔ جب کہ وہ لمبے عرصے سے مر ہی رہا تھا اور کسی ریڈیو سے اس کی خبر نہیں آتی تھی۔ ہندوستان کے ادیبوں کو پاکستان کے کچھ دوستوں کے خطوط سے پتہ چلتا تھا کہ کبھی وہ پاگل خانے میں ہے۔ کبھی زیادہ شراب پی لینے پر اسپتال میں ہے۔ کبھی بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں...... نزدیکی دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہے وغیرہ، مگر اس کے ہندوستانی دوستوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس دوران بھی ان کی کہانیاں برابر چھپتی رہیں۔ کہانیاں بھی کیسی! جنھیں پڑھ کر، اس کے چاہنے والوں کے مطابق ''منٹو کا منہ نوچ لینے کو جی چاہتا تھا اور اتنی اچھی کہانیاں بھی، جنھیں پڑھ کر اُس کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا تھا''...... اُس کے پرانے دوست دعا مانگتے تھے، ''اے خدا، اُس کے قلم میں زہر بھر دے!'' (چاہے اگلی صدی کے راجیندر یادو والے کوٹے میں سینندھ لگا دے!) ایسا زہر، جو قوم کے نام پر ہندو اور مسلمان کو لڑنے والی درندگی کی دھجیاں اڑا ڈالے۔

اور جب تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ تہذیب سے رہنا نہیں سیکھتے۔ تب تک کیسا ہندوستان، کہاں کا پاکستان اور کیسی قومی اور تہذیبی شناخت! اور ایک ساتھ رہنا سیکھ لینے کے بعد تو ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں بچے گی۔ یہ غلط وقت میں ہی شور مچاتی ہیں اور غلط لوگوں کے کام آتی ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں منٹو جیسے اُن افسانہ نویسوں کی قومی اور تہذیبی جڑیں تلاش کرنے والے، جنھیں اُن کے ہی ملک میں سچ کہنے کی ہمیشہ ممانعت ہے۔ ہاں، نائے پال جیسے لوگ اپنے جڑ میں تلاش کر رہے ہوں، تو اُن کی مدد کرنے میں نقصان نہیں ہے، حالاں کہ ساری ریسرچ کے بعد جو ہاتھ لگے گا، وہ کچھ اور ہی ہوگا۔ تلاش کرنے والے تو ابھی تک کبیر کی جڑیں کھو دے جا رہے ہیں، عادت لگ جاتی ہے۔ لیکن جب کبیر کہتے ہیں کہ ''رہنا نہیں دیس برانا ہے'' تو اُنھیں اس سیدھی صاف بات میں مسٹی سزم نظر آتا ہے۔ کبیر کو آدمی کا بنایا کوئی بھی دیش اگر پسند آیا تو وہ اُسے بیگانہ کیوں بتاتے؟ بہت گہری تڑپ سے اُٹھتے ہیں یہ اعلان!

دہلی میں مرزا غالب فلم چل رہی تھی، اُسی دوران منٹو کا انتقال ہوا۔ اِس فلم کی کہانی انسانیت کی ٹھیکیداری کرنے والے اِسی شہر کے موری گیٹ میں بیٹھ کر منٹو نے ہی لکھی تھی۔ مگر کہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے افسانوں کو سینکڑوں مرتبہ براڈ کاسٹ کرنے والے آل انڈیا ریڈیو کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ اُردو بازار کھلا رہا۔ کہیں کوئی قومی پرچم نہیں جھکا۔ منٹو کی تنگ حالی میں بھی اس کے پیسوں کو شراب پی چکے لوگ کہیں ایک ساتھ نہیں بیٹھے۔ کسی نے منٹو کی کہانیوں کی کتابوں،

اسکرپٹوں اور براڈ کاسٹوں سے بزنس کرنے والوں سے تھوڑا بہت پیسہ وصول کر کے اس کے تنگ حال بیوی بچوں کو بھیجنے کی بات نہیں سوچی۔ کسے فرصت تھی؟

کرشن چندر نے اُس روز بہت درد سے لکھا تھا کہ جس منٹو نے سماج کی نچلی تہوں میں گھس کر پسے ہوئے، کچلے ہوئے اور سماج کی ٹھوکروں سے بگڑے ہوئے کرداروں کو اٹھا کر عزت بخشی، اس پر ہم نے مقدمے چلائے...... اُسے بھوکا مارا...... پاگل خانے پہنچایا، اسپتالوں میں سڑایا اور اتنا مجبور کر دیا کہ وہ انسان کی بجائے شراب کی بوتل کو اپنا دوست سمجھنے لگا۔ شاید اس لیے کی وہ کہیں کا بھی مشرف (معزز) باشندہ نہیں تھا۔ اُس کی تہذیبی اور قومی شناخت بھلا کیسے ہوتی؟ لہٰذا، اُسے تہذیب اور قوم سے دور ہی مرنا تھا۔

یاد کیجیے گا، ذوقی صاحب، آپ نے خود بھی کہا ہے منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ نہ تو ہندوستان میں مرتا ہے اور نہ ہی پاکستان میں۔ جہاں وہ مرتا ہے وہاں کوئی ملک نہیں ہوتا۔ آپ ماہر فن ہیں اور سنجیدہ مزاج ہیں، جیسا کہ آپ کے نام کا بھی مطلب نکلتا ہے...... اس لیے مجھ ناچیز نے آپ کی توجہ جس بات کی طرف چاہی ہے، اُسے آپ نہیں جانتے ہوں گے، ایسا میں نہیں مان سکتا۔ پتا نہیں؟ آپ کیسے اس بات کو چوک گئے؟ چوں کہ آپ کے مضمون کا مقصد پاکستانی کہانیوں کا تبصرہ کرنا تھا، جس کے بیچ آپ نے منٹو کو پاکستانی بتانے پر اعتراض کیا اور ٹھیک ہی کیا ہے۔ اس بہانے مجھے اس موضوع پر اور سکّے کے دوسرے پہلو پر کچھ زیادہ کہنے کا موقع ہاتھ لگ گیا، جس کے لیے میں آپ کو اور مدیر کا شکر گزار ہوں۔ اگر میرا یہ مضمون قابل اشاعت نہیں سمجھا گیا تو اُمید ہے، اسے آپ کو بھیج دیا جائے گا اور آپ مجھے دو چار لائنیں ضرور لکھ بھیجیں گے۔

آصف فرخی

منٹو اور تنقید کی اوپر دی گڑگڑ

"پچاس برس پرانی اس تہذیب کا اصل عالم اور مؤرخ صرف منٹو ہی ہے۔ ایک ایسی تہذیب جس نے لہو کی دیواریں اور آنسو کی ندیاں ایجاد کی تھیں۔ منٹو کو۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ جانتا ہے۔ اگر تم نہیں جانتے تو بدنصیب ہو۔ ہمارے تمہارے درمیان یہ کہانی تو چلتی ہی رہتی ہے۔"

"آزادی مبارک" کملیشور

وہ جو ایک شعلۂ مستعجل جس کا نام تھا سعادت حسن اور ایک عالم میں منٹو کے نام سے مشہور ہوا، وہ کون تھا اور کیا تھا؟ یہ کون بتائے؟ منٹو کیا ہے، اس سوال سے کہیں زیادہ دل چسپی ہمارے نقادوں کو اس بات سے رہی ہے کہ منٹو کیا نہیں ہے۔ ایک ادبی مظہر کے طور پر منٹو کیا تھا اور سماجی وقوعے کی حیثیت کیا تھی، اس نے اردو افسانے میں انسانی تجربے کی جس نوعیت کو موضوع بنایا اور اس کیفیت کے لیے جو انداز بیان اختراع کیا، اس کی تفہیم و تحسین کے بجائے وہ اپنا زور قلم اس بات پر زیادہ صرف کرتے رہے ہیں کہ منٹو جو نہیں ہے، اس کو ثابت کیا جا سکے کہ منٹو وہ نہیں ہے ...... منٹو ترقی پسند نہیں ہے، منٹو رجعت پرست نہیں ہے، منٹو سماج دشمن نہیں ہے، منٹو مصلح نہیں ہے، منٹو جدید نہیں ہے، منٹو فرقہ پرست نہیں ہے، منٹو سیکولر نہیں ہے، بالکل نہیں ہے ..... اور اب یہ نئی نفی اثبات کہ منٹو پاکستانی نہیں ہے۔ یہ اعتراض ہندوستان کے افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی نے، جو ہم عصر سماجی تضادات کے حوالے سے تیز قلم کہانیاں لکھنے کی شہرت رکھتے ہیں، عائد کیا ہے۔ انتظار حسین اور ناچیز کے مرتب کردہ پاکستانی افسانوں کے ایک انتخاب میں منٹو کی شمولیت پر انگشت نمائی کرتے ہوئے انہوں نے الزام لگایا ہے کہ منٹو کو گویا زبردستی پاکستانی بنا دیا گیا۔

میں اس اعتراض کو پڑھ کر پہلے پہل حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے بھی زیادہ اٹل، ہماری تنقید نے کوئی لکشمن ریکھا قائم کر رکھی ہے جہاں منٹو کسی کھوئے ہوئے بچّے کی طرح گم سم کھڑا ہے (فاضل مضمون نگار یاد کریں "پرمیشر سنگھ") اور ہم نے، ذوقی صاحب کے بقول "آن کی

آن میں'' منٹو کو لکیر کے اس طرف کھینچ کر پاکستانی کے زمرے میں شامل کرلیا۔ جو انتخاب یا فیصلہ منٹو نے خود شعوری طور پر کرلیا تھا، فاضل نقاد نے اس کو درخور اعتنا سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ محض اس لیے کہ یہ دلیل اٹھائی جا سکے کہ منٹو پاکستانی نہیں ہے۔

نہیں کیسے ہے؟ اس سوال کی طرف آنے سے پہلے نامناسب نہ ہوگا کہ تھوڑا سا ذکر اس کتاب کا ہو جائے جس کی وجہ سے منٹو کے بارے میں انکشاف اور ہم پر عتاب نازل ہوا ہے۔ انتخاب افسانوں کا ہو یا شعروں کا، رسوائی کا معاملہ ہے تاہم اس انتخاب میں جو نقائص رہ گئے یا اس میں جو افسانے شامل کیے گئے ان کے جواز یا جواب دہی کا یہ موقع نہیں۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں کہ عذر گناہ بدتر از......

پاکستان میں تخلیق کیے جانے والے سینکڑوں، ہزاروں افسانوں میں سے محض چند ایک پر مشتمل یہ انتخاب بھی، ایسے کسی بھی دوسرے انتخاب کی طرح، ادھورا ہے اور اپنے مرتبین کی صواب دید کا پابند۔ کہانیوں کے ایک مجموعے کے طور پر پڑھا جائے تب تو ٹھیک ہے، مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ذوقی صاحب اور ان کے جیسے لوگ، اس انتخاب سے اپنی پسند اور ضرورت کے کام لینے لگیں۔ برسبیل تذکرہ، اس انتخاب کے ساتھ ایک زیادتی (اور وہ بھی اجتماعی) تو یہ ہوئی کہ ہندوستان میں جشن آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ابتدائی و تعارفی انداز میں تیار کیے جانے والے اس انتخاب کو پاکستان میں جوں کا توں شائع کر دیا گیا اور اس کو نمائندہ بنانے کے لیے توسیع و اضافہ شدہ صورت میں تیار کرنے کا مرتبین کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ''یہ یوں ہی چھپے گا ورنہ پھر کوئی اسے priate کردے گا! ناشر نے ہمیں یقین دلایا۔'' قازق سے بچ گئے تو پھر شب خون کا سامنا تھا۔ نہ جانے کس کرم فرما نے اسے نصاب میں داخل کروادیا۔ مرتبین سے اجازت لینا یا چیتاؤنی دینا تو درکنار، ہمیں اطلاع ہی تب ہوئی جب اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ تاویلیں دیتے دیتے میں تنگ آ گیا کہ صاحبو اور بی بیو، مجھے اس کی خبر نہیں۔۔۔ یہ تالیف درسی و نصابی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ترتیب نہیں دی گئی، ہم مجبور ہیں، گناہ گار ہیں، افسانے جمع کرنے کا ارتکاب ضرور کیا تھا۔ اس کے بعد کیا خبر تھی کہ میل کا بیل بن جائے گا۔

کراچی کے اسکولوں کی استانیوں کا ایک غضب ناک ٹولہ بار بار آن کر مجھ سے مطالبہ کرتا رہا کہ آپ اس سے دست بردار ہو جائیے یا پھر یہ بتائیے کہ آخر ایسا کیوں لکھا ہے۔ جواب دہی کا سب سے زیادہ عذاب جس افسانے پر نازل ہوا، وہ خالدہ حسین کا ''سواری'' تھا کہ آپ یہ بتائیے

مصنفہ نے ایسا کیوں لکھا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ میں کہاں تک اور کیا جواب دیتا؟ مطلب بھی ہوا خبط۔ مجھ پر اس پورے معاملے میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ فاضل اساتذہ..... میں ان کو قصوروار ہرگز نہیں ٹھہراتا کہ وہ اپنے درس کے تئیں ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کررہے تھے..... یہ محاورہ ہی نہیں رکھتے کہ جدید و معاصر ادب، خصوصاً افسانہ، کیسے پڑھا (اور بعد ازاں پڑھایا) جائے، اس کی تفہیم کے طریقے (methods) اور آلات (tools) کیا ہوں گے اور طالب علم کے اپنے ماحول سے اس کی کیا یگانگت ہے۔

ٹوٹے پھوٹے افسانہ نگار کے طور پر میں یہ کام تو کرنے سے رہا۔ شعر مرا بمدرسہ کے برد، پڑھتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ تا آن کہ اس انتخاب نے ایک نئے نزاع کو جنم دیا، اور وہ بھی منٹو کے حوالے سے، جس کی شمولیت اور جن کے افسانے کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ دو الگ الگ آراء نہیں ہوسکتیں۔ شاید عافیت اسی میں تھی کہ خبر ہمیں دیر سے پہنچی۔

اگر منٹو نہیں تو پھر کون؟ منٹو کو شامل نہ کیا جائے تو پاکستان میں افسانے کی بنیاد ہی اٹھتی نظر نہیں آسکے گی۔ فلم ایکٹر شیام کے خاکے میں اپنی مخصوص قطعیت کے ساتھ منٹو نے لکھ دیا ہے کہ وہ کس طرح ''باجو کی گلی'' سے پاکستان آیا۔ وہ حالات کیا تھے اور پاکستان آنے کے بعد اس کی حالت کیا ہوئی..... ''تین مہینے میرے دماغ کی عجیب وغریب حالت رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں.....'' یہ سب خود منٹو نے قلم بند کردیا ہے کہ اپنا موضوع آپ بننے کی ان میں غیر معمولی فطری صلاحیت تھی اور ان کی یہی نفی یا کیٹس کے الفاظ میں ''منفی صلاحیت'' ان کی سب سے زیادہ مثبت قوت تھی۔ مگر منٹو کو کسی ایک خانے میں ٹھونس دینے والے ناقدین بھلا اس قوت کی داد کیا دیں گے۔

پاکستان آنے کے بعد منٹو کی یہ بے چینی بہت تخلیقی اہمیت کی حامل تھی۔ انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے، آوارہ گردی کی، مہاجروں کی بحالیات کے مطابق کاروبار جمانے کی کوشش کی، اور سوچتے رہے۔ ایک نوزائیدہ مملکت کے ذہنی ہی نہیں طبیعی انتشار کا بڑا جان دار مرقع ان کا مضمون ''زحمتِ مہر درخشاں'' میں موجود ہے اور منٹو نے ان سوالات کو درج کردیا ہے جو ان کے ذہن میں بار بار گونج رہے تھے، الجھن پیدا کررہے تھے:

''کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا؟ اگر ہوگا تو کیسے ہوگا؟ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا ہے اس کا مالک کون ہے؟ کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا؟ کیا ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں؟ کیا اُدھر، اردو بالکل ناپید ہوجائے گی؟ یہاں پاکستان میں اردو

کیا شکل اختیار کرے گی؟ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے؟ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی؟ آزاد ہوکر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے؟"

منٹو نے وہ بنیادی سوالات اٹھائے جو پاکستان میں ادب اور ادیب کے کردار کے بارے میں تمام نظریاتی و غیر نظریاتی قیاس آرائیوں کا تانا بانا فراہم کرتے ہیں، اور جن کے جواب تلاش کرنے کی الجھن ہم تک آن پہنچی ہے۔ اس الجھن سے نمٹنا، منٹو کی ادبی میراث کا اتنا اہم جزو ہے کہ اسے ہم صرف اسی صورت میں صرفِ نظر کر سکتے ہیں کہ کسی نظریاتی کمیں گاہ کی پناہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ تب ہم پر، اپنے ادبی تجربے کے مضمرات کا سامنا کرنے کی وہ دلیرانہ سعی و تلاش بھی واجب نہ رہے گی جو منٹو کا بہت بڑا کارنامہ تھا، نوزائیدہ مملکت پاکستان کا پہلا بڑا ادبی کارنامہ۔ "ٹھنڈا گوشت" اور "کھول دو" سے لے کر منٹو نے ایک کے بعد ایک جو تند و تیز افسانے لکھے، ان پر حکومت وقت کی پابندی کا سامنا جس استقامت سے کیا، وہ منٹو کی سوانح ہی نہیں، پاکستان میں افسانہ نگاری کا انتہائی روشن باب ہیں۔ مصلحت آمیزی اور سوقیانہ پن کی یلغار کے سامنے معدودے چند روشن مثالوں میں سے ایک۔ ان افسانوں کی اہمیت یا ان کی "پاکستانیت" ۔۔۔ کہ یہ پاکستان کے حالات اور تجربات پر منٹو کا تخلیقی response تھے..... سے انکار، پاکستان کے افسانے کی اساس سے غداری کے مترادف ہوگا، اس سے کم نہیں۔

ذوقی صاحب نے ایک پوری فہرست گنوا دی ہے کہ فلاں کو شامل ہونا چاہیے تھا اور فلاں کا فلاں نہیں ڈھکاں افسانہ..... وہ ابوالفضل صدیقی اور عزیز احمد کی شمولیت کی سفارش بھی کرتے ہیں اور ناصر بغدادی و سائرہ ہاشمی کی بھی۔ گویا سب ایک جیسے ہیں، سب اچھے ہیں۔ پھر وہ اُلٹی زقند لگا کر یہ تجویز بھی پیش کر دیتے ہیں کہ احمد علی کے "ہماری گلی" اور محمد حسن عسکری کے "چائے کی پیالی" کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔ یہ افسانے قیام پاکستان سے پہلے لکھے گئے تھے اور اگر ان کو پاکستانی افسانوں کے انتخاب کا حصہ قرار دے دیا جائے تو پھر فاضل نقاد کی یہ تخصیص کہ منٹو پاکستانی نہیں ٹھہرائے جا سکتے، مزید بے معنی ہو جاتی ہے۔ یوں بھی میں "پاکستانی" کو ویسا دائرہ بنتے نہیں دیکھنا چاہتا کہ جس سے لوگوں کو خارج ہی کیا جاتا ہے۔ یہاں منٹو کا پاکستانی ہونا محض ایک شہری یا سیاسی ہی نہیں، ایک ادبی وقوعہ بھی ہے اور مجھے فی الوقت اس کے ادبی معنی ہی سے سروکار ہے۔ یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ "پاکستانیت" ہمارے دور کی ایک بہت مطعون اصطلاح بن گئی

ہے۔ ''کھول دو'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' جیسے افسانوں کی ادبی قدر و قیمت اور معنویت اس ملک کے حوالے سے جہاں تک متعین ہوتی ہے، وہ بذاتِ خود بہت اہم ہے اور وہی منٹو کی پاکستانیت کی اساس ہے۔ پاکستان کے ادب کا دائرہ inclusive ہونا چاہیئے، exclusive نہیں۔ ہم تو میر و غالب، وارث شاہ اور شاہ عبداللطیف کو بھی غیر پاکستانی ادیب سمجھنے کے حق میں نہیں جو پاکستان کی مملکت کے قیام سے پہلے ہی اپنی زندگی کی مدت پوری کر چکے تھے۔

ذرا سوچیئے، پاکستان میں ادب کا تصور اقبال کے بغیر کس قدر ادھورا ہے۔ مرے کو ماریں شاہ مدار، ذوقی صاحب سے بھی دو گز آگے ان کے جوابی مضمون نگار کھیم چند ہیں جو یہ لکھتے ہیں کہ اقبال ''نہرو کو انگوٹھا دکھا کر، ڈنکے کی چوٹ پر پاکستان چلے گئے۔'' فاضل مضمون نگار بھٹک کر افسانہ نگاری پر اُتر آئے اور پھر انہیں جوش ملیح آبادی اور علامہ اقبال میں خلطِ مبحث ہو رہا ہے تو سخن فہمی عالم بالا معلوم شد!

ہندوستان، پاکستان کی تقسیم کے بارے میں منٹو کے حوالے سے کسی بھی بیان کا غیر ذمہ دارانہ ہونا نہیں برداشت کیا جا سکتا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے، اتنا تو بشن سنگھ نے بھی پتہ چلا لیا تھا۔ فاضل مضمون نگار کو اس بنیادی معلومات کے حصول میں اتنی دیر کیوں لگی؟ بشن سنگھ المعروف بہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سراپا احتجاج بن گیا تھا۔ اہمال سے بھرا ہوا اور یکسر بے اثر مگر جان لیوا۔

پاکستان میں رہتے ہوئے اور پاکستان کے حالات کے تحت لکھے جانے والے افسانوں کے باوصف، منٹو پاکستان کے افسانے کا روشن بلکہ آدرش وادی باب ہے۔ اس کو غیر ضروری یا اضافی قرار دینا، جس طرح ذوقی صاحب نے کیا ہے، کسی طرح قابل قبول نہیں۔ ذوقی صاحب نے جس طرح کے اعتراض کیے ہیں، وہ منٹو کے وجودیاتی مظہر، اس کے افسانوں میں موج زن انسانی تجربے اور دردمند بیانیے کی نادرہ کاری کے بجائے محض نظریاتی اور سیاسی وفاداریوں سے استوار ہیں۔

فیض اور قرۃ العین حیدر کی طرح، منٹو اتنا ہی ہندوستانی ہے جتنا کہ پاکستانی۔ اس کی ایک حیثیت سے یکسر انکار کر کے محض ایک پر زور دینا اس کے ساتھ اسی طرح کی زیادتی ہے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ساتھ ہوئی تھی۔ ذوقی صاحب جیسے نقادوں سے کہیں زیادہ بامعنی تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے الفاظ ہیں: ''اوپر دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ!''

ظفر اقبال

انتقالِ افعال سے لفظ کی آزادی تک

"انتقالِ افعال" (مطبوعہ دنیا زاد نمبر ۱۲) میرے جیسوں کا ماتھ ٹھنکانے کے لیے بہت کافی ہے جس میں پیرس سے چھپنے والی ایک ایسی کتاب کی بشارت دی گئی ہے جس میں کوئی فعل استعمال نہیں کیا گیا جبکہ افعال کی تدفین کے لیے ایک باقاعدہ تقریب کا بھی اہتمام کیا گیا ہے جہاں ماتمی لباس اور ماتمی گلدستوں کے ساتھ منتظمین بھی موجود ہوں گے۔ کتاب کی رسمِ افتتاح فعل کی تدفین کے اسی عمل سے ہوگی کیوں کہ بقول مصنف یہ ہمارے ادب کا حملہ آور، آمر اور زبردستی کا قابض ہے۔

"کہیں سے نہ آنے والی ریل" نامی ۲۴۳ صفحات پر مشتمل، فکشن کی یہ کتاب دراصل اس شکنجے کے خلاف ایک ردعمل ہے جو صرف ونحو کی صورت میں زبان کو جکڑے ہوئے ہے اور اس کے کھل کھیلنے کی ساری راہیں مسدود کیے بیٹھا ہے۔ اس شکنجے کی گرفت جوں جوں ڈھیلی یا کمزور ہوگی، زبان ٹوں ٹوں بولنا شروع کردے گی۔ تخلیق کار کی، یا لکھنے کی آزادی کے سلسلے میں اب تک جو جدوجہد ہوئی ہے، اور، ہو رہی ہے وہ اپنی جگہ پر غایت درجے قابلِ قدر ہے، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ زبان اور لفظ کی آزادی کے لیے بھی باقاعدہ آواز اُٹھائی جائے، اور اسے اس قید سے چھڑانے کا اہتمام کیا جائے اور مذکورہ بالا ایسی کوششوں کو ہنسی مذاق میں نہ اُڑا دیا جائے۔ اس طرح کی بڑ چند سال پہلے میں نے بھی ہانکی تھی:

آزاد ہو کے سلسلۂ صرف و نحو سے
اب لفظ آپ اپنے معانی بنائے گا

بلکہ، اس سے بھی بہت پہلے:

لفظ گونگے ہو چکے ہیں، مان لینا چاہیے
ورنہ کیا ہم پر کوئی اہلِ کتاب آیا نہیں
(سرِعام)

یا پھر

معانی کے ملبے سے نکلا تو میں
گرامر کی دلدل میں دھنستا رہا

اور

پنج پائی پرانی پنکچوایشن
چنچ چندن اسیدھ افکارنے کا
(گلافتاب)

لفظ و معنی کی آزادی پر سب سے پہلا حملہ اعراب اور نام نہاد ''پنکچوایشن'' نے کیا، جس کا احساس کرتے ہوئے میں نے ''گلافتاب'' میں سے ''پنکچوایشن'' یکسر اُڑادی تھی کہ معانی کو محدود کرتی ہے، جب کہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ معانی کو محدود کرنے کے علاوہ یہ الفاظ کے باہمی رشتوں میں بھی مزاحم ہوتی ہے، جہاں معانی بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور الفاظ کو اپنا جادو الگ سے جگانے کا موقع میسر آتا ہے۔

ایجاز و اختصار کے حوالے سے الفاظ کی منہائی کا جو تصور ٹیلی گرافک لینگویج نے دیا تھا اُس کی بہ دولت شعر و ادب میں فالتو الفاظ سے گلوخلاصی میں مدد ضرور ملی جس سے جیمز جوائس، برٹرینڈ رسل، میلکم، مگرج، ژاک دریداوغیرہ سے لے کر افتخار جالب اور اس خاکسار تک نے بھی کام لیا، تاہم انتقالِ افعال بہرحال ایک الگ اور خاصے کی چیز نظر آتی ہے جو بے شک نئی نہ بھی ہو، کیوں کہ ادب میں بالعموم کوئی چیز بھی سراسر نئی نہیں ہُوا کرتی، لیکن اس سے ابرو اُٹھنے کی ایک کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ شعر و ادب میں اساسی اہمیت زُبان کو حاصل ہے جبکہ لفظ اس کے لیے ایک ایسی بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر زُبان کی ساری عمارت کھڑی نظر آتی ہے، بظاہر جس کی مدد کے لیے گرامر (صرف و نحو) ایجاد اور رائج کیے گئے، تاہم اس ڈسپلن کو توڑنے کی ضرورت بھی بارہا پیش آتی رہی اور یہ کام زیادہ تر شاعری ہی میں ہُوا، اور جاری و ساری ہے، یعنی صرف و نحو کو اگر ضرورت کے تحت عائد اور نافذ کیا گیا تو ضرورت کے پیشِ نظر اس جکڑ بند کو توڑا بھی گیا۔

عسکری صاحب نے اُردو ادب میں افعال کی کمی کا جو شکوہ کیا، وہ اپنی جگہ پر، اور اپنے وقت میں ضرور اہمیت کا حامل ہوگا، اور، اب بھی ہوسکتا ہے، لیکن نقدِ ادب میں ایسی چیزیں حتمی بھی نہیں ہُوا کرتیں، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اندازِ نظر تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے، کیوں کہ خود مذاقِ سخن ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا، نیز کچھ اور پُرانا ہوکر نئے کے لیے جگہ خالی بھی کرتا رہتا ہے حتیٰ

کہ یہ نیا بھی کبھی پُرانا ہو جاتا ہے، اور متروک شدہ پُرانا پھر سے نیا ہو کر آن وارد ہوتا ہے!
اس ضمن میں قارئین کی دلچسپی کے لیے افعال کی منہائی کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

اجل خواب آئنہ آغاز عکس اندازم دریاواں
چنچل چتر آرزو طوفان عبث انجام دریاواں
سبز گر سامنا مت موج زرد او جھلِ چشم چلمن
اگھڑواں نقش جھلمل جھاڑ جھرمٹ فام دریاواں
مکھوں مجبورنا بربر سکھوں سیندورنا جل تھل
تمنا تہ بہ تہ تنہا ہوس ہنگام دریاواں
ظفر عریاں ازل افتور دُکھ دستور دستاویز
بدن بسرام صحرا واں نظر نیلام دریاواں

☆

دیوار درز دو بدو ارژنگ اثرواں
سربز بکھر سطح انیرنگ نظرواں
شب شور تماشوں عطر امکان سراسر
پل چھن تہ و بالا عجب آہنگ عصرواں
رت رات ستاروں افق اندوہ کناروں
من موج ہوا دوش انورنگ نشرواں
پت پیرہنوں پردہ پری پیکروں پیاس
چت چشمہ چلک چاند اُس رنگ ابھرواں

☆

تن طغیانی تہ بہ تہ نیند نواچپ چانگی
لہر اُتر کناروں در دیوار الانگی
تھک تھم تھئی تھل تھرتھرک تھال تھپک تھن تھوتھنا
تھور تھرک تھم تھامنی تھپ تھک تھانگی
لکھ لٹ لاٹ لٹاکسی چکھ چٹ چاٹ چٹاکسی

ست سنجوگ سہاولانٹ نٹ کھت رٹ جٹ جانگی
موج مہورت سو بہ سو فوج فتورت کو بکو
زوج ضرورت مو بہ مو بانجھ بدن ظفر انگی

(گلافتاب)

قدیم بجر، پُرانے وقتوں کا، جب زمین وزماں کی وحدت تھی، کائناتی شعور زندہ تھا، نوعِ انسان کا، جب من وتو کے لختِ شیرازہ بند ذہنی فشار سے ناشنا سا تھی، استعارہ شدید بھرپور ہے۔ مگر واپسی نہیں۔ یہیں کہیں، وقت کی حدوں میں (نظم: یہی ہے میرا الحن: افتخار جالب)

اُئی وآٹ چھُو وئے وٹل لے وٹے بل لُو بلون کھٹ یاری اُچی ماڑی دروازے رہن کر کروٹ کروڑ اُونٹ یا دتیل تر ونکا تلواڑی کڑ کا لو پوڑا پوڑی پھوڑی پوری کی پوری معدہ پانی چھلک چھلکارے محلول طبع آزمائی تلوار کشش کشیدن گندن بے تابیِ استخراجی بے موسمی صفراوی ماری متلی زدہ ہاگئے ہاٹو اوبڑا وجڑ اوجڑی فیتہ بندش فلیتہ جھڑجھڑی کیمپ پھل جھڑی انبارِ جابجا لٹا جواہر وطلا جنجال جھنجھنا جھنجھوٹی کتنی موٹی بلیون ڈالر قولِ تقویٰ کا کڑکا کانگڑی، شہتوت بنگ توجُل سی جُلبجلیاں سلام فرشی فراش دھروہ چونچلوں بیچ آبادی دادا بھتیجے شٹرنگ بیچ بنک بنگ ڈھیری دھانسودھانس تتیا چڑھت چھکڑ چھیکڑے دائیں بائیں سائیں درویش لاشہ دسترخوان (تماشائے لبِ بام: طلسمِ دہشت (افسانوی مجموعہ) سمیع آہو جا۔

واضح رہے کہ گلافتاب کی غزلوں ''چمک چمکارنے شب شیرنے کے'' اور ''دلدر درمیاں دلدارنے کا'' وغیرہ میں جو افعال قوافی کے طور پر آئے ہیں، اوّل تو وہ مصنوعی، یعنی بنائے گئے قوافی یا افعال ہیں، علاوہ ازیں وہ اپنے طور پر افعال کی پیروڈی بھی ہیں جنھیں افعال کے لیے جذبۂ خیر سگالی ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ کو زیادہ سے زیادہ آزاد ہونا چاہیے، اور ڈسپلن وغیرہ کے نام پر اس پر جو پابندیاں لگائی گئی ہیں ان کی تقلیل بہ ہر حال ضروری ہے تاکہ زبان آزادی سے بول سکے۔ اور ظاہر ہے کہ ان پابندیوں کا جالا خود تخلیق کار ہی جس حد تک توڑ سکتے ہوں، توڑیں گے تو بات بنے گی، آزمایش شرط ہے!

امجد طفیل

نقاد کی کمی

جب میں نے مندرجہ بالا عنوان تحریر کیا تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ لاہور جیسے شہر میں رہتے ہوئے جہاں ہر ہفتے تین چار کتابوں کی تقاریب رونمائیاں منعقد ہوتی ہیں۔ اور ہر تقریب میں سات آٹھ نام اظہار خیال کرنے والوں کے تحریر ہوتے ہیں، میں نقاد کی کمی کی بات کر رہا ہوں۔ اور پھر کیا میں نے اردو رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں کا مطالعہ ترک تو نہیں کر دیا۔ ہر رسالے میں تنقیدی مضمون، کتابوں پر تبصرے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ تنقید نہیں؟ معاف کیجئے گا، کتابوں کی تعارفی تقاریب میں جو مضامین پڑھے جاتے ہیں وہ بارات کے موقع پر دولہا کے لیے لکھے جانے والے سہرے تو ہو سکتے ہیں، تنقید ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا کسی تحریر کے ایک دو نقائص بیان کرنے کی جسارت کر لے تو اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو بارات والے کسی ایک فرد کے ساتھ کرتے ہیں جو دولہا کو ''کانا'' کہنے کی ناپاک جسارت کے مرتکب فرد کے ساتھ کیا جاتا ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اکثر دولہوں کی طرح کتابوں میں بھی کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کی نشاندہی سے بچنا چاہتے ہیں تو کیا تنقید کا کام عیب جوئی ہے اور ہمیشہ نقائص تلاش کرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ تنقید ایک ایسا عمل ہے جس میں فنی، جمالیاتی، فکری اور لسانی پہلوؤں سے تخلیق کو پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ بھی بجا کہ ادبی تنقید میں وہ معروضیت ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو خالص سائنسی مضامین کی تحقیق میں مل جاتی ہے۔ ہر نقاد ایک مخصوص زمان و مکاں، تہذیب، ادبی و فکری فضا اور شخصی اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ یہ سب عناصر کسی نقاد کے ذوق اور معیار نقد کا تعین کرتے ہیں اور ظاہر ہے سب نقاد اس حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اچھی تخلیق کی طرح اچھی تنقید بھی اپنی ایک مخصوص خوشبو رکھتی ہے۔

کسی بھی فن پارے کو پرکھتے ہوئے نقاد اگر تجزیاتی انداز اپناتا ہے اور فن پارے کی خوبیوں اور خامیاں بیان کرتا ہے تو یہ اچھی تنقید کی ذیل میں آئے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے گھر بچہ پیدا ہو تو سب جاننے والے مبارک باد دیتے ہیں لیکن کیا آپ نے کبھی کسی کے ہاں مردہ بچہ پیدا

ہونے پر مبارک باد کا غلغلہ دیکھا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو آپ اسے دشمن تصور کریں گے، دوست نہیں اور بہت رعایت کی تو اس کی دماغی حالت میں شبہ کریں گے۔ اب ایسے لوگوں کو کہاں لے جائیں جو مردہ تخلیقات پر مبارک باد کے ڈونگرے برساتے نہیں تھکتے۔

آپ نے اکثر تقاریب میں مختلف مقررین سے یہ جملہ سنا ہوگا کہ "صاحب میں نقاد تو نہیں مگر اس کتاب پر بات کرنے ....." اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ نقاد نہیں تو نقاد کی نقالی کیوں کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ رویہ اس لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ نقاد کی ذمہ داریاں سے بچا جا سکے اور تنقید سے "فائدہ" اٹھایا جا سکے۔ مگر عصر حاضر کی تنقید میں جس بات کی کمی سب سے زیادہ نظر آتی ہے وہ احساس ذمہ داری کا فقدان ہے۔ کتابوں پر جو دیباچے اور فلیپ لکھے جاتے ہیں ان میں سے ۹۹ فیصد اس غیر ذمہ داری کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ ہم الفاظ کے غیر ضروری اور غیر محتاط استعمال کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ جس کتاب پر دو جملے کافی ہو سکتے ہیں اس پر دس صفحات تحریر کر دیتے ہیں۔

تنقید کے حوالے سے ہمیں ایک اور بات نے بہت خراب کیا ہے اور وہ ہے حمایت اور مخالفت۔ دیکھیں اچھی تنقید نہ تو کسی کی حمایت میں ہوتی ہے اور نہ کسی کی مخالفت میں۔ اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ وہ اچھی تخلیق کو اپنی تنقید سے ختم کر دے گا تو وہ بلاشبہ شدید مغالطے کا شکار ہے۔ تنقید اچھی تخلیق کو ختم کر سکتی ہے نہ بُری تخلیق کو اچھی بنا سکتی ہے۔ تنقید کا کام اس سے آگے کا ہے۔ وہ اچھی تخلیق کے لیے معیارات مقرر کرتی ہے۔ وہ اچھے فن پاروں کی نشاندہی کر کے اچھی اور بری تخلیق میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ تنقید صرف موجودہ تخلیق کا تجزیہ ہی نہیں کرتی وہ مستقبل کے لیے نئی نئی راہیں بھی کھولتی ہے۔ کیا اردو میں حالی کی تنقید، ترقی پسند، تنقید اور لسانی تشکیلات نے یہ فرائض سرانجام نہیں دیے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ادب پر بات ہو سکتی ہے تنقید کے اچھے برے اثرات پر بحث ہو سکتی ہے لیکن تنقید کی اہمیت سے جیسا انکار ہمارے عہد میں دیکھنے کو مل رہا ہے وہ ادب کی تخلیق کے لیے نیک فال ہرگز نہیں۔

اردو ادب میں تنقید ہمیشہ نئی نئی فکری بحثیں پیدا ارہی ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ سماجی علوم اور فلسفہ میں تخلیقی کام نہیں ہوتا اس لیے ہماری تنقید ایک سطح پر ادب میں نئے نئے فکری سوالات بھی اٹھاتی رہی ہے۔ اب ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے ہاں فکری سوالات پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں خاص طور پر پچھلے پندرہ بیس سالوں میں جو نئے ادبی نظریات ہمارے ہاں متعارف کروانے کی کوشش کی

گئی ہے، انھوں نے ادب کو اس کے پس منظر سے کاٹ کر پڑھنے کی طرز کو رواج دیا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ہاں تنقید کو نئے سوال اٹھانا چاہیے۔ بے شک یہ سوال آپ کو بے وقت کی راگنی ہی کیوں نہ محسوس ہوں لیکن نئے سوالات ہی نئے مباحث کو پیدا کرتے ہیں جس سے ادب میں نئی جان پڑتی ہے۔

میں جب معاصر تنقید پر غور کرتا ہوں تو مجھے یا تو وہ نقاد نظر آتے ہیں جو پچھلے چالیس پچاس سالوں سے لکھ رہے ہیں جیسے ڈاکٹر وزیر آغا، فتح محمد ملک، محمد علی صدیقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ یا پھر گزشتہ دس سالوں میں دو تین نئے نام سامنے آئے ہیں۔ ان کے درمیان کم و بیش تیس سال کا دورانیہ ہمیں کسی بھی اہم نقاد کی نشاندہی کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ جو ہمیں اردو ادب میں ٹھہراؤ کی کیفیت کا گمان گزرتا ہے تو اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ ہماری تنقید نے تخلیق کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔ اور آج ہمیں اپنے اردگرد ایک بھی ایسا نقاد نظر نہیں آتا جو اس دور کا تجزیہ کر کے آج کی ادبی صورت حال کو ہمارے سامنے لائے۔

گزشتہ دس پندرہ سالوں میں اردو تنقید میں جو نئے نام سامنے آئے ہیں ان کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت دکھائی دیتا ہے کہ ان لوگوں کے جو مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ نقاد ابھی اپنی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہیں۔ ان میں ذوق و شوق، جستجو وغیرہ تو ملتی ہے لیکن انھوں نے ابھی کوئی تنقیدی کارنامہ سرانجام نہیں دیا، ہمیں موجودہ ادبی صورت حال میں تنقید اور نقاد کی سخت ضرورت ہے ورگرنہ ہماری تخلیق بھی پوری پروان نہیں چڑھ سکے گی۔

محمد سلیم الرحمٰن

نیرودا کے لیے نظم

آ کہ تیرے منتظر ہیں، آ، سمندر،
کتنے چقماقی کراڑے۔
چاندنی میں جن کی ہلسائی چمک
گم راہ کرتی ہے اکیلی کشتیوں کو۔
تیری ان سر پھوڑتی موجوں کا غوغا
رات کو جیسے وہی رکھتا ہو زندہ۔
جال بنتے ہیں یہاں ان مچھلیوں کے واسطے ہم
جو تری گہرائیوں میں گیت گاتی ہیں
کسی اپنی ہی لے میں،
یا تری کھاری ہوا کے
ذائقے میں مست من موجی پرندے،
رات میں کھلتے ہوئے آزاد پرچم۔

ہم بھی تیرے منتظر ہیں، اے سمندر،
اے سراسیمہ سمندر۔
کتنی آوازیں ہیں تیری،
کتنی تحریریں تموج در تموج
تیری ان لفاظیوں سے،
تیری ان فیاضیوں سے،
زندگی جاگی پرانی پانی پانی

نیند سے اٹی نئی
جیسے کسی بچے کی آنکھیں

مُنھ اندھیرے کی ہوا میں
نیم خوابیدہ ٹھنکتی گھنٹیوں کی کپکپاہٹ
صبح کے آوے سے نکلا چاہتا ہے
اک نیا دن
اپنی سونی نیلگونی میں رچا
اور کورا کورا

اے جہاں پیما سمندر،
آج کالے پانیوں میں گھول دے
ایسے سویرے کی کوئی رنگین پُڑیا
جس سے ہو جائے مرا جی بھی گلابی
اور پیراہن بھی آبی۔
ہاں، سمندر۔

پابلو نیرودا
ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

سمندر

اپنا روپ آپ، اس کے باوجود خون سے تہی۔
صرف ایک ماس: مرگ یا گلاب۔
بحر کا ورود، جوڑتا چلا
میری زندگی، تیری زندگی۔
اپنے آپ ہی تاخت پر تُلا۔
گارہا ہے گیت، ہر طرف رواں، پھیلتا ہوا،
رات دن میں بھی ''آدمی میں بھی'' زندہ شے میں بھی۔
اس کا وصف خاص.......آگ اور یخ، چلا چلی۔

اسلا نیگرا میں رات

اک پرانی رات اور بپھرا ہوا کھارا بہاؤ،
میرے باسے کے درودیوار سے سر پھوڑتے ہیں۔
ایک سائے میں ڈھلا جاتا ہے سب کچھ۔
آسماں بھی تو دھڑکتا ہے
سمندر سے لپٹ کر۔
آسماں اور سایہ ہیں آپے سے باہر۔
آ کے ٹکراتے ہیں ارائے سے باہم۔
رات بھر جاری ہی رہتی ہے یہ ان کی ریلا پیلی۔
جو اجالا الکسائے پھل کی صورت

دھیرے دھیرے رکتے رکتے کھل رہا ہے،
نام سے اس کے نہیں کوئی شناسا۔
کھدبداتے اور ابلتے سائے سے
ساحل پہ اک سنگیں سویرا
جلوہ کرتا ہے، جسے کھارا بہاؤ
کاٹتا ہے اور کترتا جا رہا ہے،
رات کے بھاری لداؤ سے جو دھل کے
صاف ستھرا،
اپنے ساگر بھر کٹورے میں لہولہان پورا۔

اسلانگیرا: کالا جزیرہ۔

شیر شاہ سیّد

لاچس کولا

''یہ الورتینا کی تصویر ہے،'' اس نے خوبصورت فریم کی ہوئی ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الورتینا یقیناً خوبصورت تھی۔ ایک خاص کشش تھی اس کے چہرے پر اور چبھتی ہوئی آنکھیں جیسے دور تک دیکھ رہی ہوں۔ میں ٹھٹک کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

لاچس کولا میں الورتینا کی تصویر کیوں تھی، میں سوچنے لگا۔ لاچس کولا اس گھر کا نام تھا۔ گھر ایک جہاز کی مانند تھا۔ ایک چھوٹا سا بحری جہاز، خشکی پر ٹھہرا ہوا۔

یہ سب کچھ چلی کے شہر سانتیاگو میں ہو رہا ہے۔

اسی چلی میں جس کا نام پہلی دفعہ میں نے اس وقت سنا جب میں میڈیکل کالج میں دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے بس کے رکتے ہی نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بورڈ پہ نظر پڑی جہاں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا کہ امریکہ کی حمایت سے چلی کے صدر ایلندے کا قتل کر دیا گیا ہے۔ ایلندے جو جمہوریت کا منتخب کردہ وزیراعظم تھا فوجی بوٹوں کے تلے روندا گیا۔

پھر سانتیاگو کا نام اس وقت سامنے آیا جب میں نے لندن میں جیک لیمن کی فلم مسنگ (MISSING) دیکھی جس میں جیک لیمن ایک ایسے امریکی باپ کا کردار ادا کرتا ہے۔ جس کا صحافی بیٹا سانتیاگو میں قتل ہونے کے بعد گما دیا جاتا ہے۔ جیک لیمن کا کردار بڑی ہوشیاری اور بے حد دردمندی کے ساتھ انسانی حقوق کی پامالی کی روداد بیان کرتا ہے۔ اس وقت سے میرے دل میں خواہش تھی کہ چلی دیکھوں اور سانتیاگو وہ میدان دیکھوں جہاں نا جانے کتنے کمیونسٹوں کو حق و انصاف کی آواز بلند کرنے کے جرم میں پنوشے کے دورِ اقتدار میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس ملک چلی کے اسی شہر سانتیاگو میں قسمت ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لے آئی تھی۔

سانتیا گو شہر کے بازاروں، گلیوں میں گھومتے ہوئے چائے خانوں، کافی ہاؤسوں میں محظوظ ہوتے ہوئے شراب خانوں اور ریستورانوں میں چکر لگانے کے بعد ہمارا گروپ لاچس کولا پہنچا تھا......

''یہ میری نانی ہے'' میرے گائڈ گونسالوایشورا نے میرے چہرے پر اُبھرے ہوئے سوالوں کو بھانپ کر جیسے جواب دیا۔

اس جواب نے میرے دماغ میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ لاچس کولا........ سنتیاگو شہر کے بیچوں بیچ جہاز نما پابلو نیرودا کا گھر۔ پابلو کے گھر میں خوبصورت عورت الورتینا کی تصویر جو ہمارے گائڈ گونسالو ایستورا کی نانی تھی۔ میں نے سوچا کہ گائڈ نے ویسے ہی تصویر لگا دی ہوگی۔ خوبصورت عورتوں کو تو سجایا بھی جاسکتا ہے۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے امریکی لہجے والی انگریزی میں آہستہ آہستہ رُک رُک کر کہا کہ الورتینا پابلو کی معشوقہ تھی۔ ایک طویل مدت تک اس کی محبوب رہی۔ یہ تصویر اور اس کے برابر میں رکھے ہوئے سارے خطوط پابلو نے گاہے بگاہے الورتینا کو لکھے تھے۔ وہ سارے خطوط بڑے احتیاط سے تصویر کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ تاریخ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے دن۔ ان ہفتے مہینوں اور سالوں کو پھلانگتے ہوئے الورتینا کے پاس رک گئے تھے۔

پابلو کی پہلی کتاب میں الورتینا کے لیے بے شمار نظمیں ہیں۔ وہ تمام محبت بھری ننگی نظمیں ان انسانی جذبات سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جو زندگیوں میں خوشی، لگن، جذبہ اور مقصد بھر دیتے ہیں۔ گونسالو نے بڑے رومانی انداز میں تقریر کی تھی۔

ہم سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پابلو نے صرف عشق کیا اور تمام زندگی عشق میں گزار دی۔ سمندر سے عشق، عورت سے عشق، علم اور کتابوں سے عشق، ساؤتھ امریکہ، افریقہ اور ہندوستان سے عشق اور پھر جمہوریت۔ شخصی آزادی اور آزادی کے دیوانوں سے عشق۔ اور اس کا عشق، اس کی محبت کہیں چھپی ہوئی ہے کہیں علی الاعلان اشتہار بنی ہوئی ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ وہ کہیں تو بالکل سامنے ہے اور کبھی کبھی مکمل طور پر پراسرار۔

میرے دل میں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ کیا وہ اپنی نانی الورتینا کے بارے میں صحیح کہہ رہا ہے۔ ابھی یہ سوال میرے ذہن میں کلبلا ہی رہا تھا کہ اس نے کہا کہ اب اس جہاز نما مکان کو ہی دیکھ لیں۔ یہ مکان بھی پابلو کی طرح پراسرار ہے۔ پابلو کی طرح عاشق ہے اور پابلو کی طرح بے باک بھی۔

گونسالو نے کسی اچھے گائڈ کی طرح ہم لوگوں کو مسحور کرلیا تھا۔ اس گھر کو پنوشے کے فوجیوں نے تباہ کردیا۔ پابلو نے یہ گھر بڑی محبت سے متلڈا کے لیے بنایا تھا۔ وہ سامنے تصویر ہے متلڈا کی۔ متلڈا سے اس نے شادی نہیں کی مگر متلڈا اس کے محبتوں کا آخیر دم تک مرکز بنی رہی۔ ہم سب نے دیوار پر لگی ہوئی عورت کی تصویر کو دیکھا۔ بھرے بھرے ہونٹ، ابھری ہوئی چہرے کی ہڈیاں۔ چمکتی ہوئی آنکھیں اور سر پر ڈھیر سارے سیاہ بالوں کا بڑا سا الجھا ہوا دائروں میں بنا ہوا گھونسلہ۔

''یہ تصویر پابلو کے ایک بہت اچھے دوست نے بنائی ہے۔ اسے غور سے دیکھیں۔ اس تصویر میں صرف اس متلڈا نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے،'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

ہم سب بڑے غور سے خوبصورت متلڈا کی تصویر دیکھ رہے تھے اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''لاچس کولا'' اس نے زور سے کہا۔ ''لاچس کولا'' کا مطلب ہے گھنے بالوں والی عورت۔ متلڈا گھنے بالوں والی عورت تھی۔ لاچس کولا اس کے لیے بنوایا تھا پابلو نے اور اسی کی اس صفت پر نام رکھ دیا تھا اس کا۔ ''اس تصویر میں فنکار نے ایک اور شرارت کی ہے'' اس نے پھر مسکرا کر کہا۔ پابلو نے متلڈا سے کبھی شادی نہیں کی مگر ہمیشہ متلڈا کے پیچھے کہیں چھپا رہا۔ یہ کہہ کر گونسالو آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گتے کے کارڈ سے متلڈا کا چہرہ اور پیشانی چھپادی۔

ہم سب حیران رہ گئے۔ متلڈا کے گھنے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں پابلو مسکرا رہا تھا۔ وہی چہرہ، وہی پیشانی، وہی گال، وہی تھوڑی اور وہی پتلے نیلے مسکراتے ہوئے ہونٹ، پچکی ہوئی ناک کے نیچے۔

وہ متلڈا کے گھنے بالوں میں، لاچس کولا میں چھپا رہا۔ لکھتا رہا، سرخ اور سیاہ انگور کی شراب اس کمرے کے دوسری جانب بنے ہوئے چھوٹے سے میخانے میں پیتا رہا۔ کمرے کی دیواروں میں بنی ہوئی جہازی کھڑکیوں سے دیوار چھوتی ہوئی مصنوعی سمندر کی لہروں کو گنتا رہا اور لکھتا رہا اپنی محبتوں کے بارے میں، ان فوجیوں کے بارے میں جو غاصب بھی تھے اور غدار بھی۔ ان سیاسی کارکنوں کے بارے میں جن کی لاشیں کسنگر، نکسن اور فوجی حکمرانوں کی مرضی سے راتوں کو ہیلی کاپٹروں میں بھر کر بیچ سمندر میں شارک مچھلیوں کی خوراک بنادی گئیں۔ وہ محبتوں کے دوران اور عشق کے کربناک لمحوں میں بھی ان مزدوروں، صحافیوں اور اُن باضمیر انسانوں کا درد لے کر فوجی جنتا کے جسم و روح پر بوجھ بن گیا۔

ہم اب لاچس کولا کے دوسرے کمرے میں پابلو کے چھوٹے سے میخانے میں اور اس کے ساتھ ہی بنے ہوئے باورچی خانے میں وائن کی پرانی بوتلوں ،مختلف انداز و اطوار کے جام اور ہندوستان اور افریقہ سے لائے ہوئے برتنوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی پابلو کی خواب گاہ تھی، پرانے زمانے کا اونچے ستونوں والا پلنگ جسے جہاز کے کسی کیبن میں رکھا ہوا تھا۔ ''پابلو نے دوخواب گاہیں بنائی تھیں ایک یہ، اور ایک اوپر کتابوں کے کمرے کے ساتھ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں وہ کتابوں کا کمرہ نہیں دکھاسکوں گا مگر اس خواب گاہ کی ایک خاص بات ضرور بتانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر گونسالو نے دیوار سے لگی ہوئی الماری کا دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک سادہ سی الماری تھی۔ اس نے بیچ کا دروازہ بھی کھول کر دکھایا۔ یہ بھی ایک سادہ سی الماری تھی۔ جس میں ہینگر لٹکانے کے لئے راڈ لگی ہوئی تھی جہاں پابلو اپنے کپڑے لٹکاتا ہوگا۔ الماری کے تیسرے دروازے کو کھولا گیا تو وہ بھی ایک سادہ سی الماری ہی تھی مگر اوپر سے نیچے تک کسی بھی ہینگر کی جگہ نہیں تھی اس میں۔ درحقیقت غور سے دیکھنے پر پتہ لگا کہ الماری کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ اس دروازے کا ہینڈل ایک طرح سے چھپا ہوا تھا۔ گونسالو نے آہستہ سے ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھل گیا تھا۔ ہم سب الماری کے اس دروازے سے پابلو کے گھر سے باہر آچکے تھے۔ کوئی بھی آج تک نہیں سمجھ سکا ہے کہ پابلو کو اس خفیہ دروازے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ جاننے والوں سے چھپتا رہا۔ شاید فوجی جاسوسوں کو دھوکہ دینے کے لیے بنایا تھا۔ خواتین وحضرات میں گونسالو ایتورا، الورتینا کا نواسہ جو پابلو کی محبوبہ تھی، پابلو کے اس راز سے پردہ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔

مجھے پتہ ہے آپ لوگ پابلو کی لائبریری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان بیش قیمت پینٹنگ کو دیکھنا چاہتے ہیں جو پکاسو نے خود بنا کر پابلو کو دی تھیں۔ چلیے میں آپ کو لے چلتا ہوں، مگر افسوس کہ آپ انہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا ہم کچھ نا سمجھتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کے قدموں کے نشان پر چل رہے تھے۔

''یہ سارا مکان لوٹ لیا گیا۔ ایک رات پنوشے کے فوجیوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ بے شمار کتابیں، بیش قیمت پینٹنگز اور پابلو کے جمع کیے ہوئے مختلف نوادرات فوجی اٹھا کر لے گئے۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کتابیں، وہ فن کے نادر نمونے کہاں چلے گئے۔'' فوجیوں نے جہاں لوٹ مار کی وہاں لاچس کولا کو بھی تباہ و برباد کردیا۔ جہازی مکان کی کھڑکیاں، کھڑکیوں کے باہر کھڑا ہوا

پانی کا نظام جسے پابلو سمندر کی طرح دیکھا کرتا تھا۔ سب کچھ ختم کر دیا ان لوگوں نے ۔ میں نے سوچا فوج کہیں کی ہو کسی زمانے کی ہو صرف فوج ہوتی ہے ۔ حالت امن میں بھی لوٹ اور حالت جنگ میں بھی لوٹ ۔ شاید لوٹ ہی فوجی تربیت کا بنیادی جز ہے۔

لائبریری کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں پابلو اپنے مہمانوں کی دلداری کرتا ہوگا۔ کمرہ ابھی بھی کچھ بچی ہوئی چیزوں سے سجا ہوا ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ پابلو ہندوستان میں سفارت کاری بھی کرتا رہا تھا اور افریقہ میں بھی گھومتا رہا تھا۔ راجستھان، یوپی ، حیدرآباد اور کیرالا سے جمع کی ہوئی چھوٹی چھوٹی خوبصورت چیزیں فوجیوں کی دستبرد سے محفوظ رہی تھیں۔ وہ تمام چیزیں ابھی بھی پابلو کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ پابلو کو گلاس جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملک ملک کے گلاس، طرح طرح کے پیالے گھر میں موجود الماریوں میں ابھی بھی سجی ہوئی تھیں۔

لوگ انہماک سے پابلو کے جمع کیے ہوئے نوادرات کو دیکھ رہے تھے۔ میں گونسالو کے قریب کھڑا ہوگیا، پھر دھیرے سے ہمت کر کے پوچھ بیٹھا تھا کہ مجھے اپنی نانی الورتینا کے بارے میں بتاؤ۔

وہ ہنس دیا تھا۔ تم سارے لوگ جو ہندوستان سے آتے ہو ایسے ہی سوال کرتے ہو۔ تمہارا گلا سوال یہ ہوگا کہ میں اس کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہوں اور اس کے آگے کے سوال بھی مجھے پتہ ہیں لہذا میں سارے سوالوں کا ایک ساتھ جواب دے دیتا ہوں۔

گونسالو دبلا پتلا اٹھائیس تیس سال کا لڑکا سا آدمی تھا۔ اس کے گہرے سیاہ بال تھے جو بہت بڑھے ہوئے تھے جس کو اس نے پونی ٹیل کی طرح باندھا ہوا تھا۔ اس کی وسیع پیشانی سے بال کھینچ کر پونی ٹیل میں بندھ گئے تھے، اس کی بھنویں گھنی تھیں اور نمایاں ناک کے ساتھ پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ وہ خود بھی ایک خوبصورت آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی نانی بھی بہت خوبصورت عورت رہی ہوگی۔

”نہیں ہمیں کوئی پشیمانی نہیں ہے اس بات پہ کہ ہماری نانی الورتینا پابلو کی محبوبہ تھی۔ درحقیقت یہ بات تو شاید کبھی بھی منظر عام پہ نہیں آتی، شاید ہمیشہ ایک راز رہتی۔ دراصل پابلو کی محبت ایک راز ہی تھی۔ پابلو نے خود بھی کہا ہے کہ میں اس زمانے میں دوغلا تھا۔ الورتینا سے محبت کرتا تھا مگر اس کا برسر عام اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت چلی سانتیا گو روایتوں اور مذہبی انتہا پسندوں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔

وہ پابلو کا ابتدائی دور تھا۔ وہ ڈرتا رہا، شاعری کرتا رہا، محبت کے نغمے گنگناتا رہا، چھپ چھپ کر الورتینا سے ملتا رہا۔ وہ بھی محبت کے خاموش طوفان میں چھپتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اس کے اور پابلو کے تعلقات کو قانونی شکل مل جائے۔ مگر سماج کا نیٹ ورک زیادہ مضبوط تھا۔ وہ دونوں نہ شادی کر کے نہ ساتھ رہ سکے اور الورتینا کی شادی میرے نانا سے ہوگئی۔

میں نے پابلو کو اپنی نانی سے سمجھا ہے، پڑھا ہے، دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، شاید اس دنیا میں پابلو سے سب سے زیادہ شدید محبت اسی نے کی ہے۔

میرے نانا کے مرنے کے کئی سالوں کے بعد جب پابلو بھی مر چکا تھا۔ میری ماں کو جوتے کے دوڈبوں میں چھپائے ہوئے پابلو کے خطوط مل گئے تھے۔ پہلی دفعہ میری نانی نے اقرار کیا تھا کہ وہ پابلو کی محبوبہ رہی ہے۔ وہ پابلو کی محبوبہ ہے۔

شروع میں ہمارے خاندان کے لیے یہ بڑے شرم کی بات تھی مگر میری ماں نے میری نانی کو پابلو سمیت قبول کرلیا تھا۔ وہ ہمارے گھر میں بہت اطمینان سے اپنے بچوں کے درمیان پابلو کی تحریروں، نظموں کو دہراتی ہوئی ایک دن شاید اس کے پاس چلی گئی۔''

گونسالو واقعات کو کسی نظم کی طرح بیان کرر ہا تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم اپنے لمبے بالوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے زور زور سے ہلتا تھا۔ ''مجھے تو تم بھی شاعر لگتے ہو''، میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں میں بھی شاعر ہوں اور شاعری کرتا ہوں۔ رومانی شاعری، سیاسی شاعری، امریکا کے خلاف، ظلم و غربت کے خلاف، انصاف اور امن کے لیے، علم و آگہی کے لیے ایک ایسے سماج کے لیے جہاں ظلم نہ ہو، انصاف ہو۔''

''تمہاری انگلش بہت اچھی ہے چلی میں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔ ہر کوئی ہسپانوی بولتا ہے کوئی انگلش سمجھتا ہی نہیں ہے''، میں نے سوال کیا۔

''میں امریکا میں پڑھا ہوں اور میری بیوی بھی امریکن ہے اس وجہ سے میری انگلش بھی امریکن ہے۔''

''تو تم امریکا واپس چلے جاؤ گے اپنی بیوی کے ساتھ۔''

نہیں کبھی نہیں۔ امریکا میں کیا ہے۔ نہ تاریخ نہ زبان نہ کلچر صرف دوسرے اقوام کو محکوم بنانے کی خواہش۔ اگر مجھے چلی چھوڑنا پڑا تو میں یوروپ جاؤں گا اسپین، فرانس یا اٹلی۔''

''سنتیاگو کی یہ خاص بات ہے بے شمار ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے بیرے، ٹیکسیاں چلاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور، ہزاروں کی تعداد میں نظر آنے والے وہ فنکار جو سڑکوں اور چھوٹے موٹے تھیٹروں میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں معاشی خوشحالی نہ ہونے کے باوجود امریکا نہیں جانا چاہتے ہیں، بلکہ یوروپ جانا بڑے فخر وغرور کی بات مانی جاتی ہے'' میں نے اس سے ایک طویل سوال کر ڈالا۔

''ارے یہ تو بہت سادہ سی بات ہے پورے جنوبی امریکا میں زیادہ تر لوگ اپنے آپ کو یوروپ کی ان انقلابی تحریکوں سے وابستہ کرنے میں اور اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں جن کا مقصد جمہوریت کا حصول، شخصی آزادی کی بالادستی اور انسانی حقوق کی بحالی ہے امریکہ میں یہ سب کچھ نہیں ہے، ان کے اصول مختلف ہیں، پیمانہ جدا۔ وہ امریکا میں امریکیوں کے لیے جو چاہتے ہیں وہ سب کچھ دنیا کے عوام کو دینا پسند نہیں کرتے ہیں۔ پابلو جیسے شاعروں کا یہی کمال ہے انہوں نے جنوبی امریکا کے عوام کو نوجوانوں کو شناخت دی ہے، ان میں ان بلند انسانی اقدار کی روح پھونکی جس نے انہیں دنیا سے تھوڑا مختلف کر دیا ہے۔''

''پابلو نے مٹلڈا سے شادی کیوں نہیں کی''، میں نے سوال کیا۔

وہ لاچس کولا میں چھپا رہا۔ مٹلڈا کے گھنے بالوں میں اپنے آپ کو چھپا کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا مگر اس نے مٹلڈا سے بھی شادی نہیں کی۔ شاید وہ شادی کے ادارے کو ہی نہیں مانتا تھا۔ وہ چلی کے اشرافیہ کے اس دوغلے پن سے شدید نفرت کرتا تھا جہاں وہ ایک بیوی اور خاندان کے ساتھ خوش وخرم رہنے کی نمائش کرتے تھے اور ہر ایک نے داشتائیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ اس کی زندگی کی کے بھید نہیں بلکہ مکمل طور پر اعلان تھا کہ وہ کس قسم کے سماج پر یقین رکھتا تھا۔ اگر اس کی شادی میری نانی سے ہوجاتی تو شاید اس کی زندگی کچھ اور ہوتی مگر بہت سارے شاید ہیں اور بے شمار سوالات جن کے جواب نہ مل سکے ہیں نہ ہی ملیں گے۔''

گروپ کے دوسرے لوگ لاچس کولا کے سامنے والے دروازے پر پہنچ چکے تھے جو روڈ پر کھلتا تھا جس پر حکومت کی جانب سے پابلو کی یادگار کی تعمیر کی گئی تھی۔ ہم لوگوں نے ان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تصویر کھنچوائی تھی اور پابلو کے پسندیدہ ریسٹوراں میں دوپہر کا کھانا کھانے چل پڑے تھے۔

اسد محمد خاں

اشفاق احمد

اشفاق احمد گزر گئے۔ اِس خبر کا زمانہ ماضی ہے۔

اشفاق صاحب اردو افسانے کی تاریخ کا حصّہ ہیں اور رہیں گے۔ اِن خبروں کا زمانہ حال اور مستقبل ہے۔

یہ صورتِ حال اب اسی طرح رہے گی۔ اشفاق صاحب کا نام اور کام اور کتنے ہی زندہ لفظ لکھنے والوں کی لکھت اور ان کے من موہنے نام حال اور مستقبل میں اسی طرح نافذ اور جاری رہیں گے۔

خواتین و حضرات! آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ اچھے لکھنے والے کا، وہ چاہے نثر لکھتا ہو کہ شعر کہتا ہو، معاملہ اسی طرح ہوتا ہے۔ وہ اپنے شعر اور اپنی کہانی کی لکھت میں پڑھنے والے کے اندر تیر سکتا اور نافذ ہوسکتا ہے، اُس کے اندرون سے، اُس کی روح سے سرگوشی کرسکتا ہے۔۔۔ ایسے نقش چھوڑ سکتا ہے جو پڑھنے والے کے ساتھ رہ جائیں، اُسے کبھی اکیلا نہ چھوڑیں۔

اشفاق صاحب بھی، خدا ان کے درجات بلند کرے، ایسے نقش دے کر گئے ہیں جو اردو پڑھنے اور سننے والوں کی یادداشت کا، ان کی سرشاریوں کا حصّہ ہیں اور رہیں گے۔

وہ زمانہ، جسے ہم آسانی سے افسانے کے موسمِ بہار کا نام دے سکتے ہیں۔۔۔ اردو کہانی کی بسنت کہہ سکتے ہیں۔۔۔ ہم نے، اور آپ نے، برسوں کے پھیلاؤ میں، جگمگاتے صفحوں پر وہ زمانہ خوب دیکھا ہے۔

منٹو، بیدی، عزیز احمد اور کرشن۔ عصمت اور خواجہ احمد عباس اور خدیجہ مستور اور عمرش دراز۔۔۔ ہاجرہ مسرور، قاسمی اور قرۃ العین۔ پھر غلام عباس اور ابوالفضل صدیقی اور اشفاق احمد۔ سبھی زندہ لفظ لکھنے والے۔ بس یوں سمجھیے کہ اُن دنوں جیسے ہولی کا سماں تھا۔۔۔ کتنے ہی رنگ کھیلنے والے رنگ کھیل رہے تھے۔ اردو کہانی اپنے طے شدہ فارم میں اظہار کی ایک معتبر صنف بن چکی تھی۔ اردو کہانی کا وہ سنسنی خیز دور۔۔۔ دورِ تشکیک یا ارتداد کہہ لیجیے۔۔۔ یعنی "علامتی" دور، جس

ہیں بہت سوں کو شامل ہونا تھا، ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ بھی اپنے ساتھ بہت سے باکمال دوستوں کو لانے والا تھا۔ یعنی انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، احمد داؤد وغیرہ۔

تو اس گزر چکے موسمِ بہار۔۔۔ اُس بسنت کے جاتے جاتے اشفاق صاحب اپنی کہانی ''گڈریا'' کے ساتھ آئے تھے۔

ایک روایتی Caesar کی طرح وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور تسخیر کیا۔

وہ میری طالب علمی کا دور تھا۔ میں ہمہ وقت کتنے ہی کرداروں کی سنگت میں رہتا تھا۔۔۔ ہملٹ اور زرّیں تاج اور کاسیکس اور نام دیومالی۔۔۔ ممد بھائی اور چابڑے اور بابو گوپی ناتھ۔ آنندی اور پرمیشر سنگھ اور کہانی ''زرد کتا'' کا protagonist جس کا دروزہ دن دن بڑھتا جاتا تھا۔۔۔ اور یہ 'گڈریا'۔

نہال کر دینے والے ''زندہ'' لوگوں کی ایک سنگت تھی جس میں سب دن گزرتے تھے۔

تو عرض ہے کہ میں نے بھی لاکھوں پڑھنے والوں کی طرح اشفاق صاحب کو اور ان کی کہانیوں کو کسی دوست کی طرح عزیز رکھا ہے۔ اور میں اُن سے بس ایک بار ملا ہوں۔

لاکھوں پڑھنے والے تو ان سے ایک بار بھی نہ مل پائے ہوں گے۔ آپ جانتے ہیں یونہی ہوتا ہے۔

تاہم اشفاق صاحب کا چند گھنٹوں کا وہ ساتھ مجھے اُسی طرح دولت مند کر گیا جیسے اُن کی کہانیاں مجھے آسودہ کرتی آئی ہیں۔

اسلام آباد میں، ایک سرکاری گاڑی میں ہم کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے۔ مجھے اور اشفاق صاحب کو ایک ہی سیٹ پر بیٹھنا ملا تھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو خوش ہوئے۔ میں افسانوں کا اپنا ایک مجموعہ پیش کیا تو لینے سے پہلے انہوں نے کتاب کو ہاتھ لگایا اور اپنا ہاتھ چوم لیا، کہنے لگے: ''لکھنا خیر کا کام ہے۔۔۔ جیتے رہیے۔''

اہلِ کمال کی اس مجلس میں جو آج اشفاق صاحب کی یاد میں برپا ہوئی ہے، میں ان کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے اُسے دُہراتا ہوں کہ لکھنا خیر کا کام ہے۔۔۔ اور پھر میں اپنے اُس باکمال پیش رو سے عرض کرتا ہوں: ''اشفاق صاحب! جیتے رہیے!''

انتظار حسین

اشفاق احمد

اشفاق احمد کے ذکر سے پہلے ایک بات اپنے متعلق بتاتا چلوں۔ پچھلے تھوڑے دنوں سے مجھے مولانا صلاح الدین احمد بہت یاد آرہے ہیں۔ جب کسی بزرگ ادیب کا انتقال ہوتا تو مولانا چھڑی ٹیکتے تعزیتی اجلاس میں پہنچتے۔ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ایک ایک کرکے اپنے ان سارے ہمعصروں کے نام گناتے جو پچھلے برسوں میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ پھر بیان کرتے کہ تقسیم سے پہلے جب ہم لاہور سے دلّی جایا کرتے تھے تو اسٹیشن گزرتے چلے جاتے اور ہم مطمئن بیٹھے رہتے۔ مگر جب بھٹنڈہ کا اسٹیشن آکر گزر جاتا تو ڈبے میں ایک کھلبلی مچ جاتی۔ لوگ اپنا اپنا بوریا بستر سمیٹنے لگتے کہ بس اب دلّی کا اسٹیشن آیا چاہتا ہے۔ پھر اداس لہجے میں کہتے کہ ہمارے سارے ہمسفر گزر گئے۔ اور اب ہماری گاڑی بھی بھٹنڈہ اسٹیشن سے آگے نکل گئی ہے۔ اور ہم نے اپنا بستر بوریا باندھ لیا ہے۔ دلّی کا اسٹیشن آیا چاہتا ہے۔

میرا جی چاہا کہ غم کے اس موقع پر میں بھی یہی انداز اختیار کروں۔ آخر میرے بھی تو کتنے ہمعصر اور عزیز دوست ایک ایک کرکے گزر گئے ہیں اور میری گاڑی بھی بھٹنڈہ اسٹیشن سے آگے نکل گئی ہے۔ مگر پھر میں نے اپنے آپ کو جھوٹا سہی، اطمینان دلایا کہ ہنوز دلّی دور است۔ اور یہ انداز بیان تو مولانا سے خاص تھا۔ تم اس کی ریس کرتے بھلے نہیں لگو گے۔ تو پھر کیا کروں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہوں کہ اُردو میں موت پر جو اتنے شعر کہے گئے ہیں ان میں سے کوئی شعر پڑھوں اور اُداس ہو جاؤں۔ مگر عجب بات ہے مجھے جو شعر یاد آیا اس کا میرے شعری مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لڑکپن میں اپنی بستی کے قبرستان میں ایک قبر ہے یہ شعر لوح پر لکھا دیکھا تھا۔ اسی وقت سے حافظہ کی لوح پر اتر آیا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اب بتائیے کہ اشفاق احمد کی موت سے بڑھ کر اور کس موت پر اس شعر کا اطلاق ہوسکتا

ہے۔ داستان طراز وہ شخص غضب کا تھا۔ سامعین بھی ایسے غضب ملے تھے کہ جس نے بات کو سمجھا اس نے بھی سر دُھنا، جس نے نہ سمجھا اس نے بھی سر دُھنا۔ بات کرنے کا انداز ہی اس نے ایسا نکالا تھا۔ عالمانہ یا دانشورانہ طرز کلام کو چھوڑ کر گھریلو سے انداز میں کوئی قصہ سنا دیا، کسی بابے سے اپنی ملاقات کا ذکر کر دیا۔ کوئی حکایت بیان کر دی، کوئی اپنا ذاتی مشاہدہ اور پھر آمدم بر سر مطلب۔ اور ایسا دل نشیں پیرایہ کہ بات فوراً ہی دل میں اُتر جاتی تھی اور بیان ایسا شگفتہ کہ جو بات کہی جا رہی ہے۔ اس سے بے شک آپ کو اختلاف ہو اور مجھے تو اکثر ہوتا تھا، مگر بیان پھر بھی لطف دیتا تھا۔ مجھے ایک جلسہ یاد آ رہا ہے۔ اشفاق نے بات کچھ اس طرح شروع کی کہ یارو، یہ ملاّ تمہارا کیا لگتا ہے۔ یہ نہ انٹلکچوئل ہے نہ ادیب ہے۔ بیچارہ ایک کونے میں پڑا اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ کسی کا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے۔ حمایت اور دفاع کا اشفاق کا یہ اپنا خاص انداز تھا۔ میں دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا اور جیسے اشفاق کو پتہ چل گیا ہو کہ داد دیتے مجمع کے بیچ کچھ ایسے لوگ ہیں جنہیں یہ بات پسند نہیں آ رہی ہے۔ اس نے بیان کو ذرا دوسرا رُخ دیا اور پھر اچانک ایک فقرہ آیا۔ ''مرغی بس انڈے دے سکتی ہے۔ بے چاری کو آملیٹ بنانا نہیں آتا۔'' لیجیے میری ساری کوفت دور ہو گئی۔ میں نے اور قریب میں بیٹھے جو دوست ابھی تک کُڑھ رہے تھے، انہوں نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔

بات کہنے کا ہنر اشفاق پر ختم تھا۔ آپ اس کی بات سے بے شک اتفاق نہ کریں اس کے بیان کے سحر میں اگر ایک مرتبہ آ گئے تو پھر اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔ تو وہ ہمعصر جن کی مار صرف ادب تک تھی، وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے کہ جل بھن کر کہیں کہ اشفاق کہانی کہنے سے تو گیا۔ بس چٹکلوں اور لطیفوں پر گزارہ ہے۔

کہانی کی دنیا میں تو اشفاق احمد کی آمد بس ہوا کا جھونکا تھا کہ ادھر آیا ادھر گیا۔ تقسیم کے فوراً بعد یہ نام اُردو افسانے کے اُفق پر نمودار ہوا۔ فوراً ہی اس نے قارئین کو اور نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پانچویں دہائی میں چند برسوں کے وقفے سے آگے پیچھے دو مجموعے آئے۔ 'ایک محبت سو افسانے' اور 'اجلے پھول'۔ اس کے بعد یہ جا وہ جا۔ اصل میں ایک تو وہ ادیب ہوتے ہیں جو بس ادیب ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار ہیں تو بس افسانہ نگار ہیں۔ شاعر ہیں تو صرف اور محض شاعر ہیں۔ مگر اشفاق کی ذات میں کئی ہنر اکٹھے ہو گئے تھے اور ہر ہنر اپنی نمود چاہتا تھا۔ منجملہ اور ہنروں کے اس کے پاس ایک ہنر افسانہ نگاری کا بھی تھا اور اس ہنر نے کچھ زیادہ ہی تیزی سے اپنا مظاہرہ کیا۔ مثلاً شاعر ہوں یا افسانہ نگار مختلف مراحل طے کرتے ہوئے رفتہ رفتہ وہ اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں انہیں

اپنے فن کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔ اشفاق نے پہلے ہی ہلّے میں ''گڈریا'' جیسی کہانی لکھ ڈالی جہاں اس کے فن کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔ پھر کہانی کی دنیا میں اس کے کرنے کے لیے کیا رہ گیا۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ میڈیا میں اس نے اپنے لیے ایک نیا جہان دریافت کیا۔ پہلے ریڈیو سے تلقین شاہ کا پروگرام لکھ کر وہ مقبولیت اور شہرت حاصل کی کہ افسانہ نگار والی شہرت مقبولیت اس کے سامنے گرد ہوگئی۔ پھر جب ٹی وی کا آغاز ہوا تو اس سے بڑھ کر ایک جہان نظر آیا جہاں جا کر اشفاق کی شہرت و مقبولیت کو چار چاند لگ گئے۔

اس دوران میں اشفاق احمد کو افکار و تصورات سے بھی شغف ہوگیا۔ کچھ تصوف سے بھی لگائی ہوگیا۔ قوم و ملک کے بارے میں بھی ایک فکر نے جنم لے لیا۔ یوں ایک اچھا خاصا فلسفہ وضع ہوگیا جس میں عام آدمی سے لے کر ضیاء الحق تک سب کے لیے ایک کشش تھی۔ تو اب اشفاق کو ایک اور سطح پر اظہار کا موقع مل گیا اور افسانہ نگار اور میڈیا رائٹر سے بڑھ کر ایک مقام حاصل ہوگیا۔ اور افسانہ تو اب بہت ہی پیچھے رہ گیا تھا۔

مگر اسی دوران میں ایک ایسا موقع آیا جب اشفاق کو ایک مرتبہ پھر افسانے کی یاد آئی۔ یہ وہ موقع تھا جب ضیاء الحق کے رخصت ہوجانے کے بعد پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی تھی اور ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ پاکستان میں جب حکومت بدلتی ہے تو میڈیا کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ تو پیپلز پارٹی کے جلو میں دانشوروں کی ایک نئی خلقت میڈیا میں داخل ہوئی، ریڈیو میں، ٹی وی میں، اور ٹرسٹ کے اخباروں میں، اور سب جگہ چھا گئی۔ اس زمانے کی ایک شام جو اشفاق کے ساتھ منائی گئی تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اشفاق نے افسانے سے اپنی غفلت کا اعتراف کیا اور اپنی افسانے والی جون میں واپس آنے کا اعلان کیا۔ ہم خوش ہوئے کہ صبح کا بھولا شام کو واپس آ گیا۔

مگر یہ خوشی چند روزہ نکلی۔ حکومت تو پھر بدل گئی۔ میڈیا کا پچھلا نقشہ واپس آ گیا۔ میڈیا میں اشفاق صاحب کی مصروفیات پھر بہت بڑھ گئیں۔ مگر اشفاق نے اپنے وعدے کو یکسر فراموش نہیں کیا۔ افسانہ انہوں نے بہرحال لکھا اگرچہ تواتر اور پچھلے والے شغف کے ساتھ نہیں۔ اب جو شخص افسانے لکھ رہا تھا، یہ وہ پانچویں دہائی والا اشفاق احمد نہیں تھا جس نے ''گڈریا'' لکھا تھا۔

'گڈریا' کا حوالہ آ ہی گیا ہے تو اس کے بارے میں ایک ڈیڑھ بات ہوجائے۔ واقعہ یوں ہے کہ یہ ایک اکیلا افسانہ اُردو افسانے کی تاریخ میں اشفاق احمد کے بقا کی ضمانت ہے۔ سچی بات ہے میں تو اسی زمانے میں یہ افسانہ پڑھ کر بھول چکا تھا۔ مگر میں کیا، خود اشفاق اس افسانے کو

برسوں ہوئے بھول چکا تھا۔ اشفاق کے انتقال کے بعد میں نے سوچا کہ میں اشفاق کی روح کو اسی طرح ثواب پہنچا سکتا ہوں کہ اس کے افسانے دوبارہ جتنے پڑھ سکتا ہوں، پڑھ ڈالوں۔ بس اس تقریب سے یہ افسانہ اب میں نے دوبارہ پڑھا اور سخت حیران ہوا کہ اب جس اشفاق احمد سے ہم ملا کرتے تھے یہ کون سا اشفاق احمد تھا اور جس نے ''گڈریا''، لکھا تھا وہ کون سا اشفاق احمد تھا۔

کہانی کا مرکزی کردار داؤ جی، یہ کس قسم کی مخلوق ہے۔ کوئی کبیر پنتھی ہے یا کسی چشتی صوفی کا ہندو مرید ہے۔ شاید یہ کردار تصوّف کی روایت اور بھگتی تحریک کے گھال میل سے برآمد ہوا ہے۔ روشن خیالی کی یہ روایت جو ہند مسلم تہذیب کے ہزاروں برسوں میں پروان چڑھی تھی بیسویں صدی میں آ کر کس آشوب سے دوچار ہوئی۔ ۴۷ء کے فسادات میں داؤ جی پر کیا گزری اور اس روایت کا کیسے انت ہوا۔

مگر یہ باتیں ہیں تب کی کہ آتش جواں تھا، جب ابھی اشفاق کی نظریاتی کایا کلپ نہیں ہوئی تھی۔ بظاہر تو یہی بات ہے۔ مگر مجھے یہ افسانہ پڑھنے کے بعد اشفاق کو جو بابے کی تلاش رہا کرتی تھی، اس میں ایک معنی نظر آنے لگے۔ کیا وہ داؤ جی کو جو ۴۷ء کے فسادات میں کھویا گیا تھا، تلاش کرتا پھرتا تھا۔ لیکن اگر یہ بات تھی تو اس کے یہاں ملاّ کیا کر رہا تھا۔ یہ کیسا تضاد تھا۔ مگر کیا ضرور ہے کہ یہ تضاد اس کا اپنا ہو۔ یہ جدی پشتی بھی تو ہو سکتا ہے۔

اصل میں مسلمانوں کی تہذیب میں شروع ہی میں، جب وہ ابھی تشکیل کے عمل میں تھی، دو ایسے کردار نمودار ہو گئے جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ صوفی اور ملاّ۔ ہند اسلامی تہذیب میں آ کر ان کرداروں کی آویزش کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ اس کے اثرات آج کے پاکستان میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ اس زمانے میں آ کر صوفی غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ لبرل آ گیا ہے جو صوفی کے مقابلے میں بودی مخلوق ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ لبرل اس طرح اپنی تہذیب سے پیوست نہیں ہیں جیسے صوفیا تھے۔ خیر ذکر تو اشفاق کا ہو رہا تھا۔ تو کیا یوں ہوا کہ اپنی تہذیب کے اثر میں آ کر خود اشفاق کا باطن صوفی و ملاّ کی رزم گاہ بن گیا۔ اگر یہ رزمگاہ کسی مصلحت سے بالاتر ہو کر اس کے افسانے میں منتقل ہو جاتی تو پھر ''گڈریا'' اشفاق کے افسانوں میں اکیلا افسانہ نہ رہتا۔ مگر یہ کیسے ہوتا۔ اشفاق کی افسانے کی طرف واپسی مکمل طور پر ہوئی کہاں۔ کیسے ہوتی۔ واپسی تو داؤ جی کی واپسی کے ساتھ مشروط ہو گئی تھی۔ اور داؤ جی اشفاق کو ایک جھلک دکھا کر ایسا اوجھل ہوا کہ بابے تو ملتے رہے، داؤ جی کا سراغ نہیں ملا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

"برصریرِ دل شاہم"

(ڈاکٹر فہیم اعظمی کی یاد میں)

شہرت کا حال بھی خوشبو جیسا ہے۔ بعض خوشبوئیں ہلکی، بھینی اور مدّھم ہوتی ہیں۔ بعض تیز، بعض بہت تیز اور اعصاب شکن۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی کے مستقل طور پر کراچی آنے اور اُن سے ملاقات ہونے سے پہلے ان کی جو خوشبو مجھ تک پہنچی تھی، وہ قدرے اعصاب شکن تھی۔ ایک ادبی بوجھ بجھکّڑ نے جو اُن سے ذاتی شناسائی کے دعوے دار تھے، مجھے بڑے راز دارانہ انداز میں بتایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب جدیدیت کے مارے ہوئے ہیں اور اکثر بڑی تمکنت کے ساتھ کہا کرتے ہیں کہ "I am a modern writer" "موڈرن اپنے اپنے طور پر سبھی ہوتے ہیں لیکن اس شدّت پسندی کے ساتھ کوئی اپنے آپ کو موڈرن نہیں کہتا۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریروں میں بھی اسی انداز کی ہلکی سی جھلک نظر آئی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ "ادبی افواہ طراز" نے ان کے بارے میں غیر ضروری مبالغے سے کام لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب، نئے ذہن، روشن خیالی اور جدید اندازِ فکر کے حامل ضرور ہیں لیکن "اب اس قدر بھی نے چاہو کہ دم نکل جائے" والی بات نہیں ہے۔ انہوں نے جدید لسانی تشکیلات کے فلسفیانہ اسلوب، ادب، ادیب اور قاری کے نئے رشتے اور ساختیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسی فکر ونظر کی ترجمانی کو اپنا حوالے اور شناخت قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے ایک اور پہلو کا شہرا بھی سُنا تھا جس کی تصدیق بعد میں ہوئی اور میرے لئے خوش گوار حیرت کا سبب بنی۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جو اطلاعیں ملی تھیں ان کی بنا پر ذہن میں ایک مبہم اور کسی قدر منفی تصور ضرور تھا۔ جب وہ مستقل طور پر کراچی آ گئے تو میں نے ان سے ملاقات کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کا "شنیدہ اندازِ تمکنت" سرِ راہ تھا۔ لیکن ایک دن مڈ بھیڑ ہو ہی گئی۔

جب ملاقات ہوئی تو مجھے تمکنت کے بجائے خاکساری اور انکسار کا احساس ہوا۔ میں نے انہیں بڑے غور سے دیکھا۔ مناسب قد، دُہرے جسم، گول چہرے کے حامل ڈاکٹر فہیم اعظمی اگرچہ سانولے رنگ کے آدمی تھے لیکن اُن کی شخصیت میں خیر اور دوسروں کی امداد و اعانت کی سفیدی

واضح طور پر نمایاں تھی۔ یہ ایک مہربان اور شفیق انسان کا چہرا تھا، سنجیدہ اور متین انسان کا چہرا۔ روشن پیشانی، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز جس سے مزاج کی احتیاط کا اندازہ ہوتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں بڑی محبت سے ملے۔ بڑی دیر تک گفتگو رہی۔ ''صریر'' کی اشاعت کا مسئلہ آیا۔ وہ ''صریر'' کے اجرا کے سلسلے میں بہت سنجیدہ تھے۔ اس کے لئے ایک لائحہ عمل اور اشاعتی پروگرام مرتب کر چکے تھے۔ ملاقات میں یہ اندازہ بھی ہوا کہ اُنہیں فلسفے، نفسیات، لسانیات، قدیم تاریخ اور اساطیر سے غیر معمولی دل چسپی ہے۔ عہد عتیق کے آثار پر اُن کی نظر بہت گہری ہے اور یہ کہ وہ ادب وشعر میں اپنا راستہ الگ نکالنا چاہتے ہیں۔ میں اُن سے باتیں کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑے قاعدے قرینے اور ضابطے کے آدمی ہیں۔ خوش لباس بھی ہیں اور خوش گفتار بھی ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے میں بھی حُسنِ ادا کا پہلو نمایاں تھا۔ جب میں نے کہا کہ آپ کی شہرت آپ سے پہلے کراچی پہنچ چکی ہے اور آپ نے بے وسیلہ ادیبوں کی کتابوں کے لیے مالی امداد فراہم کی ہے تو وہ خاموش ہوگئے پھر کہنے لگے، ''کہنے والے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ ان پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔'' اس پر میں نے کہا، ''کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے بعض ایسے لوگوں کی بھی مدد کی ہے جنھوں نے پلٹ کر آپ ہی کو نقصان پہنچایا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کچھ سوچ کر بولے، ''ایسی باتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ ان سے کیا حاصل، ہر شخص اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کے اس جواب سے مجھے احساس ہوا کہ

''بر صریرِ دل شاہم شوکتِ گدا ایں است'' (سعدی)

اور یہ کہ اُن کے یہاں تحمل، بُردباری اور عفو و درگزر کی صفت بھی موجود ہے۔ حوصلہ مند نقصان اور بُرائی کو حوصلے اور صبر سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے اس موضوع پر پھر کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ اس موضوع سے ہمیشہ گریز کرتے رہے لیکن مجھے یہ معلوم ہوتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب کا عمل خیر مسلسل جاری ہے۔

کراچی کے ادبی حلقوں میں ایک بزرگ ادیب کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ جلسے بھی ہوئے، تقریبیں بھی ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور شہر میں ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور علمی تجر کا چرچا ہوگیا۔ میں نے اُنہیں انجمن ترقی اردو کی تقریبوں میں مدعو کیا تو وہ بے تکلفی سے آئے اور گفتگو میں شریک ہوئے۔ ان کے خیالات توجہ اور احترام سے سُنے جاتے تھے، گاہے گاہے وہ مختلف حوالوں کی تلاش میں بھی انجمن آتے۔ کتب خانے میں

بیٹھتے اور پھر میرے کمرے میں آ کر ان حوالوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے۔ ان کے یہاں علمی جستجو اور دید و دریافت میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ نہ کوئی انا نہ کوئی تبختر۔ لیکن ہر بات کو بے چوں و چرا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ جب مطمئن ہو جاتے تو پھر کوئی تامّل نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ''صریر'' کی اشاعت شروع کی۔ جدّت یہ تھی کہ ''زر سالانہ یا بدل اشتراک'' کے بجائے ''سہام'' کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ تعزیت کے لیے ''النعی'' کی اصلاح تھی اور سرورق پر قدیم اساطیر میں سے کسی اسطور کے حوالے سے ایک نقش تھا جس کی وضاحت اندر کے پہلے صفحے پر تھی۔ یہ تو ''جدّت پسندی'' کا اظہار ظاہر تھا۔ مندرجات میں بھی ایک خاص انداز اور طرحِ نو کی نمود تھی۔ آہستہ آہستہ ''صریر'' نے اپنا مقام بنالیا۔ ادبی تنقید، فنّی نکات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور ساختیات کی بحثیں ''صریر'' کا طرّہ امتیاز بن گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو انہیں موضوعات سے خصوصی دل چسپی تھی چنانچہ انہوں نے ''صریر'' سے انہیں سلسلوں کو فروغ دیا اور ''صریر'' جدیدیت کا ترجمان بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس بحث کے حوالے سے جو بھی مضمون شائع کرتے اُسے بڑے غور سے پڑھتے اور اگر اُس مضمون کی کسی شق سے اختلاف ہوتا تو حاشیے میں اپنا اختلاف درج کر دیتے۔ اس طرح قاری کو مضمون نگار اور مدیر دونوں کے خیالات سے آگاہی ہو جاتی اور مثبت و منفی دونوں پہلو سامنے آ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس محنت اور دیدہ وری نے ''صریر'' کو علمی اور فنّی اعتبار سے بہت اہم بنا دیا تھا۔

میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ''صریر'' میں شایع ہونے والا ہر لفظ بڑی توجہ سے پڑھتے تھے۔ کتابت کی تصحیح وہ خود کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے میرے کسی مضمون کی اشاعت سے قبل دریافت کیا، ''ارے بھائی ڈاکٹر صاحب۔ یہ لفظ جو آپ نے لکھا ہے۔ پڑھا نہیں جا رہا ہے۔ یہ کیا لفظ ہے؟'' جب لفظ کی نشان دہی کر دی گئی تو کہنے لگے؟ ''آپ الفاظ کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔'' کبھی کبھی پوچھتے، ''یہ شعر صحیح ہے۔ یہ مصرع درست ہے؟ مجھے کچھ سُقم محسوس ہوتا ہے، ذرا تقطیع کر کے دیکھ لیجیے۔'' ایک دفعہ مجھ سے فون پر پوچھا، ''یہ تقابل ردیفین'' کیا ہوتا ہے؟'' جب اصطلاح کی وضاحت کی گئی تو کہنے لگے، ''اس کی کوئی سند بھی ہے؟'' میں نے کہا، ''معنی بیان کی کوئی کتاب دیکھ لیجیے۔'' پوچھا، ''نام بتائیے۔'' میں نے کہا، ''بہتر ہے کہ آپ نجم الغنی خاں کی بحر الفصاحت دیکھ لیجیے۔'' پھر وہ ایک دن ''بحر الفصاحت'' دیکھنے آئے۔ کتاب دیکھی تو بڑے متحیر ہوئے۔ کہنے لگے، ''ہمارے بزرگوں نے بھی کیسے کیسے زبردست کام کیے ہیں۔ یہ تو معنی بیان کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ افسوس کہ ہم اپنے علمی سرمائے سے کتنے غافل ہو گئے ہیں۔''

الفاظ اور اشعار کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب اکثر فون کرتے رہتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت اچھا، حافظہ قوی اور جدید تنقید پر دسترس ماہرانہ تھی۔ اس کا بھرپور اظہار ان کی کتاب ''آرا'' میں ہوا ہے لیکن وہ ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بعض دفعہ اختلاف رائے بھی ہوتا تھا۔ اس اختلاف رائے میں کوئی تلخی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنا نقطہ نظر واضح کرتے۔ میں اپنی بات کہتا۔ اس کے بعد دونوں خاموش ہوجاتے اور پھر اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ میں غور کرتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اختلاف میں بھی نرمی اور شرافت برتتے تھے۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آپ نے ذرا اختلاف کیا اور آستینیں چڑھ گئیں۔ گلے کی رگیں پھول گئیں اور آپ نے رفعِ شر کے خیال سے خاموش ہوجانے میں عافیت سمجھی۔ ڈاکٹر صاحب کے اختلاف میں وقار تھا۔ تحکم اور طنطنہ نہیں تھا۔

''صریر'' کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے خود کو اسی کے لیے وقف کردیا تھا۔ بڑی محنت کی۔ شروع شروع میں اس کا دفتر شہر میں تھا۔ میں نے ایک دن پوچھا کہ ''آپ نے دفتر گھر سے اتنی دور کیوں بنایا ہے۔ آپ وہاں جاتے بھی کم ہیں۔'' کہنے لگے، ''ایک ٹھکانا تلاش کرلیا ہے۔ کاموں میں آسانی ہوتی ہے لیکن خود مجھے مشکل ہوتی ہے۔'' پھر انہوں نے اپنے مکان ہی سے ''صریر'' کی اشاعت کا انتظام کیا۔ انہوں نے ''صریر'' میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو خاص موضوع قرار دیا اور ساختیات کے حوالے سے اسے ایک موقر ادبی اور علمی رسالے کی حیثیت دی۔ لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ بنایا۔ فن شعر اور عروض پر بھی توجہ دی۔ بڑے معیاری مضامین شائع کیے۔ آہستہ آہستہ ''صریر'' نئے خیالات اور نئی فکر کا ترجمان بن گیا۔ انہوں نے کچھ نئے افسانہ نگاروں کو بھی دریافت کیا لیکن حصّہ نظم کی طرف ان کی توجہ کم رہی۔ ''صریر'' کا شعری حصہ کوئی انفرادیت پیدا نہیں کرسکا۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب بذات خود منظومات پر بڑی محنت کرتے تھے۔ ایک ایک مصرع پڑھتے۔ الفاظ پر غور کرتے اور شعرا کا کلام بہت سوچ سمجھ کر شائع کرتے لیکن بعض مرتبہ ان کی ملنساہٹ ادارتی اصولوں پر غالب آجاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ''صریر'' کے سالنامے کے لیے بڑی محنت کرتے تھے۔ مہینوں پہلے سے اس کا اہتمام شروع کردیتے۔ اپنے تمام لکھنے والوں کو خط لکھتے، یاددہانی کرتے رہتے۔ مجھے وہ فون پر اطلاع دیتے کہ سالنامے کی تیاری شروع ہوگئی ہے۔ آپ کا خاکہ جلد پہنچ جانا چاہیے۔ پھر یاددہانی کے فون آتے رہتے۔ جب خاکہ انہیں پہنچ جاتا تو خوش ہوکر فون کرتے۔ ''صریر'' کے متعدد

سالناموں میں میرے لکھے ہوئے خاکے شایع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کا تذکرہ بڑی ممنونیت کے ساتھ کرتے لیکن کبھی کبھی دبے لفظوں میں یہ بھی کہتے کہ آپ De construction کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں نے یہ بات اپنے ایک خاکے میں ان کے حوالے سے لکھ بھی دی اور انہوں نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ ''دبستان نظام'' شایع ہوئی تو میں نے اس کا ایک نسخہ اُنہیں بھیجا۔'' ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو بڑے غور سے پڑھا۔ ایک سہو کی نشان دہی کی اور پھر صریر میں اس پر تبصرہ شایع کیا۔ ''صریر'' میں کسی کتاب پر تبصرہ شایع کرنا غالباً اُن کے اصول کے خلاف تھا لیکن دبستان نظام کے حوالے سے انہوں نے اصول کی پروا نہیں کی۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ایک ہفتہ وار پروگرام ''ادبی ڈائری'' نشر ہوتا تھا۔ یہ خاصی پُرانی بات ہے۔ عزیزی اقبال فریدی اس پروگرام کے نگران تھے۔ میں ہفتے بھر کی ادبی سرگرمیوں کی روداد پیش کرتا یا کسی ادبی مسئلے پر اظہار خیال کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اقبال سے کہا، ''مجھے یہ پروگرام کرتے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں اب کسی اور کی باری آنا چاہیے۔'' اقبال نے دریافت کیا، ''کس کی؟ آپ نام بتایئے۔'' میں نے ڈاکٹر صاحب کا نام لیا۔ اقبال نے کہا، ''اُنہیں راضی کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔'' چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ پہلے تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے۔ پھر بمشکل راضی ہوئے اور پروگرام کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ انہوں نے مجھے فون کیا اور کہا، ''آپ کا پروگرام آپ کو مبارک۔ میرے بس کا نہیں ہے۔ اس کی تیاری میں میرا بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔'' میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ تیار نہیں ہوئے اور اقبال فریدی کے تبادلے تک یہ پروگرا م میرے ذمے ہی رہا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب ایک خاص مزاج کے انسان تھے۔ جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ادبی محفلوں میں بھی جاتے تھے مگر کم کم۔ رات کو دیر تک مطالعہ کرنا ان کا معمول تھا۔ صبح دیر سے سوکر اُٹھتے تھے۔ صبح نو دس بجے جب بھی میں نے فون کیا تو معلوم ہوا سو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رات کو دیر تک جاگتے اور مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو دعوتیں کرنے کا شوق تھا۔ شہر میں جب کوئی ادیب شاعر باہر سے آتا تو ڈاکٹر صاحب کے یہاں کھانے اور گفتگو کا ایک سیشن ہوتا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ آئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا آئے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند آئے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں بڑی اچھی تقریب ہوئی۔ پہلے مہمان خصوصی نے گفتگو کی۔ کچھ سوال جواب کا سلسلہ رہا۔ پھر کھانا ہوا۔ کھانے میں پورا اہتمام، میزیں لگی ہوئی، عمدہ اور لذیذ کھانا، افراط سے، ڈاکٹر صاحب خود کم کھاتے۔ مہمانوں کی تواضع زیادہ

ہوتی۔ شہر کے اکثر ادیب شاعر موجود ہوتے۔ بڑی یادگار تقریبیں ہوئیں۔ ان کی بیماری کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ ایک دفعہ بیمار ہوئے تو ہسپتال میں داخل رہے۔ جب صحت یاب ہوکر گھر آگئے تو ایک شام میں ملنے گیا۔ گلدستہ اُنہیں پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں رکھ دیا۔ عمر خیام کی رباعیوں کا ایک مصور ایرانی ایڈیشن بھی لے گیا تھا، وہ بھی نذر کیا۔ بڑی دیر تک دیکھتے رہے۔ میں نے کہا: ''یہ اس لیے ہے کہ آپ خیام کی شاعری کے مطالعے اور ایرانی مصوری کے مشاہدے سے علالت کی کوفت کو بھول جائیں۔'' ڈاکٹر صاحب یہ سُن کر مسکرانے اور کہنے لگے، ''آپ کا خیال صحیح ہے۔ ان دنوں خیام ہی کے مطالعے سے فرحت حاصل ہوگی۔''

ڈاکٹر صاحب اس علالت سے ٹھیک تو ہوگئے تھے مگر خاصے کمزور ہوگئے تھے۔ وہ اگلی سی توانائی برقرار نہیں رہی تھی۔ ملتے جلتے تھے۔ آتے جاتے بھی تھے۔ بعض تقریبوں میں اُن سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بہت دُبلے ہوگئے ہیں۔ دوسری بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ ہسپتال سے گھر آگئے تھے۔ میں جانے کا ارادہ ہی کرتا رہا لیکن وہ پہلے چلے گئے۔ اُنہیں جلدی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں ندرت اور اُپج تھی۔ کسی تقریب میں مضمون پڑھتے تو ان کا انداز منفرد اور سب سے الگ ہوتا۔ میں نے اُن سے انجمن ترقی اردو کے بعض تنقیدی اجلاسوں میں مضمون پڑھنے کی فرمائشیں کی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے مضمون میں ایک نادر نقطہ نظر پیش کیا۔ وہ سکہ بند اور پیش پا افتادہ مضامین کی تکرار سے گھبراتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جو کچھ پیش کیا جائے وہ ان کی انفرادیت کا صحیح مظہر ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید تنقیدی مباحث پر بہت کام کیا ہے۔ چونکہ وہ مشرق و مغرب دونوں کے مزاج داں تھے اور دونوں کے جدید تقاضوں سے واقف تھے اس لیے انہوں نے اپنے اور ''صریر'' کے قاری کو اعتماد میں لے کر علمی بصیرت، سنجیدہ اور متوازن انداز فکر اور حقیقت پسندی کو فروغ بخشا ہے۔

''صریر'' سے وابستگی کو انہوں نے مرتے دم تک نبھایا۔ ''صریر'' کا آخری اداریہ نہیں لکھ سکے۔ بیٹے نے اُن سے اداریے پر دست خط لے کر اس یادگار کو محفوظ کرلیا۔ آخری سالنامے کے قاری کے لیے یہ ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ''صریر'' کے لیے اشتہارات حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں۔ خسارہ وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ ہمدرد کا اشتہار ''صریر'' میں ضرور شائع ہوتا تھا مدتوں یہ اکلوتا اشتہار صریر کی زینت رہا مگر

اوسوں سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے ہی کو ناپسند رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اصول اور خیالات میں بہت پختہ تھے۔ کھری بات کہنے میں بیباک تھے۔ انہوں نے بہت سے مفروضوں کی نفی کی۔ بہت سے بُت پاش پاش کیے۔ ان کا انداز نظر دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ جھوٹی شہرت سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی کی بے جا تعریف کرتے تھے۔ ان کی اصول پسندی اور صرف حق کہنے کی روش سے بعض لوگ انہیں پسند نہیں کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے اس روش پر چلنے والوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ ان کا مسلک حق جوئی تھا۔ جو صحیح سمجھتے تھے وہی برملا کہتے تھے۔ زبان خلق سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔

زمانے کی عام روش یہ ہے کہ کچھ مفروضے تراش لیے جاتے ہیں۔ انہیں پختہ تر بنایا جاتا ہے اور پھر یہ حقایق کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو زبان و ادب، اردو تحریک، قومی زبان کے نفاذ اور ترویج و ترقی سے متعلق بعض ایسے ہی مفروضے حقایق کا روپ دھار چکے ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہنا یہ لکھنا یا حقیقت حال کو نمایاں کرنا جان جوکھوں کا کام ہے مگر ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اس جان جوکھوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا۔ ''صریر'' کے اداریوں میں انہوں نے اپنے موقف کا واشگاف الفاظ میں اظہار کیا اور مفروضوں یا کلیشوں کو حقایق کا درجہ دینے پر اپنی ناپسندگی بھی ظاہر کی۔ سمجھ دار لوگوں نے ان کے موقف کو سراہا۔ مفروضوں کو ہوا دینے والوں نے برہمی کا اظہار کیا لیکن ڈاکٹر صاحب ہمیشہ آزاد خیالی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی عام زندگی میں شایستہ اور منکسر المزاج تھے لیکن جب اصول کی بات آن پڑتی تھی تو پھر ان کا رویہ بدل جاتا تھا۔ شایستگی اور انکسار برقرار رہتا لیکن موقف کا اظہار پوری قوت سے ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کا خاندانی مزاج تھا کیونکہ یہ وصف ان کے بھائی سجاد باقر رضوی میں بھی تھا۔ وہ بھی اصول کے سامنے کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ''طرح نو فگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم'' کے قایل تھے۔ نئی فکر اور نئے رجحانات کا خیر مقدم کرتے تھے۔ انہوں نے ''صریر'' کے ایک اداریے میں کھلے دل اور نیک تمناؤں کے ساتھ اکیسویں صدی کا استقبال کیا تھا۔ پرانا معاشرہ اور پرانے رویے بدل گئے ہیں۔ پرانی فکر اور خیالات بدل رہے ہیں لیکن نیا معاشرہ پوری طرح ظہور پذیر نہیں ہوا۔ نئے رویے خطرناک بھی ہیں اور مبہم بھی۔ ڈاکٹر صاحب نئی ادبی فکر اور نئے خیالات کو فلسفے، تاریخ اور لسانیات کے حوالے سے فروغ دینے کی بڑی بھرپور کوشش کی تھی۔ مسلسل کام کرتے رہتے تھے۔ ادیبوں، شاعروں اور قارئین

سب کو نئے علمی اور سائنسی تقاضوں سے آشنا کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس وقت جبکہ ہر شخص اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے ہمیں ان جیسے بالغ نظر نقاد اور ادبی مفکر کی بڑی ضرورت تھی مگر وہ چلے گئے۔ اُنہیں شاید جلدی تھی لیکن اردو ادب میں نئی فکر اور نئے رجحانات کی روایات کو مستحکم کر گئے۔

انسان عام طور پر اپنے لباس، وضع قطع، حلیے، ذہنی رویّوں اور ملنے جُلنے کے سلیقے سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خوش لباس تھے۔ کپڑے سلیقے سے پہنتے تھے۔ گرمیوں میں بالعموم سفاری سوٹ، جاڑوں میں سوٹ پہنتے تھے۔ ایک آدھ بار میں نے اُنہیں شلوار قمیص میں بھی دیکھا۔ عُمدہ سلے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ وضع قطع اور حلیے سے نرم خو صلح کل اور ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ ملنے جُلنےمیں گرم جوشی برتتے تھے، ملاقات ہوتی تو خوش دلی سے خوش آمدید کہتے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ سعودی عرب میں بھی رہے۔ فضائیہ میں بھی اعلیٰ منصب پر مامور تھے مگر ان میں کسی قسم کا افسرانہ تبختر یا اکڑ فوں نہیں تھی۔ سیدھے سادے شریف آدمی تھے۔ میرے علم کے مطابق وہ شفیق باپ اور اچھے شوہر تھے۔ ان کے ملنے جُلنے والے ان کے حق میں ہمیشہ کلمہ خیر کہتے تھے۔ بشری کمزوریوں سے کون محفوظ رہا ہے۔ نہ کوئی محفوظ رہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں بھی بشری کمزوریاں ضرور ہوں گی مگر میں ان سے واقف نہیں۔ میرے نزدیک اچھا وہی ہے جسے سب اچھا کہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی مذمّت میں نے کسی سے نہیں سُنی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ وہ بذات خود کسی کی مذمّت نہیں کرتے تھے۔ تعلقات پُرانے ہوجائیں تو کبھی کبھار کوئی نہ کوئی جملہ، تفنّنِ طبع کے طور پر ہی سہی ایسا ضرور سرزد ہوجاتا ہے جس میں کسی نہ کسی کی مذمّت کا کوئی پہلو ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے اس قسم کا کوئی جملہ کبھی نہیں سُنا۔ وہ اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ ان میں دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ تھا مگر انہوں نے کبھی اس کی تشہیر نہیں کی۔ ان کی دُنیا میں اس نمایش کی گنجایش نہیں تھی۔

شیخ سعدی کی ایک غزل کا مطلع مجھے بار بار یاد آرہا ہے ع ''برصریرِ دل شاہم شوکتِ گدا ایں است'' مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فہیم اعظمی بھی ''صریرِ دل'' کے شاہ تھے۔ اسی وجہ سے وہ ساری زندگی اہل سخن کی آزمایش کرتے رہے۔

نیّر مسعود

عرفان صدیقی

۱۵اپریل ۲۰۰۴ءکوعرفان صدیقی کی وفات ہوگئی۔ انہوں نے کہا تھا:

میرے بغیر لکھنؤ دشت غزال کے بغیر
اور اب اسی دشت بے غزال میں رہنا ہے

۱۹۷۸ء میں عرفان صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ ''کینوس'' شائع ہوا۔ اس وقت تک میرا ان سے تعارف نہیں تھا بلکہ میں ان کے کلام سے بھی زیادہ آشنا نہ تھا۔ کچھ عرصے بعد شہنشاہ مرزا جو لکھنؤ کی ادبی دنیا کے قطب کی حیثیت رکھتے تھے، اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ میرے یہاں آئے۔ ان دوستوں میں عرفان صدیقی بھی تھے۔ شہنشاہ مرزا کا خیال تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہیں لہٰذا انہوں نے باضابطہ تعارف کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ عرفان صدیقی اس دن تقریباً خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک تھی۔ سگریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے۔ آواز سبک لیکن گہری تھی اور کم بولنے کی وجہ سے مجھے ان کی شخصیت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں محسوس ہوئی۔ سب کے چلے جانے کے بعد مجھے یہ معلوم کر کے شرمندگی ہوئی کہ اس دن جو لوگ میرے یہاں آئے تھے ان میں عرفان صدیقی بھی تھے۔ کچھ دن بعد میں نے شہنشاہ مرزا سے کہا کہ کسی دن عرفان صدیقی کو لائیں۔ اس وقت تک میں نے ''کینوس'' پڑھ لیا تھا اور اس مجموعے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب جب شہنشاہ مرزا کے ساتھ عرفان صدیقی آئے تو ان سے دیر تک گفتگو رہی اور ان کا کلام بھی سنا گیا۔ اس ملاقات میں مجھے محسوس ہوا کہ عرفان صدیقی کی شخصیت میں ایک بے نام کشش ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کے بعد ان سے ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب جا کر ختم ہوا ہے۔ ان ملاقاتوں میں دنیا بھر کی باتیں ہوتی تھیں۔ ادبی دنیا کی ابتری سے وہ بھی بہت بددل تھے اور جب بھی اس سلسلے کا کوئی تازہ واقعہ پیش آتا تو اس کا ذکر کرتے اور بدمزہ ہوتے تھے۔

شروع میں مجھے عرفان صدیقی اور قائم چاند پوری کا معاملہ یکساں معلوم ہوتا تھا کہ قائم کی طرح ان کی شاعری بھی لوگوں کو متاثر کرتی تھی لیکن اپنی شاعری کے بہ قدر ان کی شہرت نہیں تھی۔ انہیں اپنی شہرت کی فکر بھی نہیں تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کے کلام نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے یہ بات محسوس کی گئی کہ ان کے یہاں کربلا کا حوالہ ایک پُرقوت علامت کے طور پر آتا ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری کے دوسرے اسرار کھلنا شروع ہوئے، اور اب ان کا شمار اردو کے بہترین غزل گویوں میں ہوتا تھا، ان کے فن میں تھکن کے آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے اور جب ان کی یہ غزل ''شب خون'' میں شائع ہوئی:

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا   تو نے کہا تھا، تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

تو ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ ''شب خون'' کے دفتر میں بہت مراسلے کی تعریف میں آئے۔ نثار احمد فاروقی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے مراسلے شائع بھی ہوئے۔ نثار احمد فاروقی نے لکھا:

''بھائی، یہ عرفان صدیقی کیا قہر ڈھا رہے ہیں..... خدا چشم زخم سے محفوظ رکھے۔'' (''شب خون'' ۲۴۷، نومبر ۲۰۰۰ء) لیکن عرفان صدیقی چشم زخم سے محفوظ نہیں رہے۔ اس غزل کی اشاعت کے بعد ہی ان کا مرضِ موت شروع ہوگیا۔

O

مولوی گنج کے حیدر مرزا روڈ والے مکان میں عرفان صدیقی بہت دن تک کرایہ دار رہے۔ یہ چھوٹا اور بے تکا بنا ہوا مکان تھا۔ نیچے صرف ڈرائنگ روم اور ڈیوڑھی میں غسل خانہ تھا۔ ڈرائنگ روم کی بہار عرفان صدیقی سے تھی۔ یہیں لکھنؤ کے شاعر اور ادیب، اور ہندوستان پاکستان کے اہل قلم ان سے ملنے آتے۔ ان میں شہریار، زبیر رضوی، عُمر انصاری، حسن واصف عثمانی، انجم ملیح آبادی وغیرہ سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ ان کے خاندان میں بیگم، چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ دو بیٹیوں کی شادی ہوگئی تھی۔ بیٹا ملازمت پر باہر چلا گیا تھا (اب یہیں آیا ہوا ہے)۔ ٹیلی فون عموماً پہلے کوئی بیٹی یا بیگم اٹھاتی تھیں اور ان میں ہر ایک کا لب ولہجہ ایسا مہذّب اور شائستہ ہوتا تھا جیسا آج کل کم سننے میں آتا ہے۔ آخر میں انہوں نے ایک مکان خرید کر اسے درست کیا اور اس کا نام ''قندیل'' رکھا۔

عرفان صدیقی کا وطن بدایوں تھا، جو ظاہر ہے ان کے خیالوں میں بسا ہوا تھا، لیکن اس سے ان کا تعلق ٹوٹا ہوا تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کا تبادلہ دہلی ہوتا رہتا تھا اور دہلی سے بھی ان کو تعلق خاطر تھا، لیکن لکھنؤ ان کا وطن ثانی ہوگیا تھا۔ ان کا تبادلہ ہوجاتا تو بھی گھر والے لکھنؤ ہی میں

رہتے۔ عرفان صدیقی ان کی اور لکھنؤ کی یاد میں مضطرب رہتے اور لکھنؤ تبادلے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک بار دہلی میں انہوں نے حضرت علیؑ کی شان میں ایک منقبت کہی اور مجھ کو اپنی خوب صورت تحریر میں لکھ کر بھیجی۔ اس وقت میری چھوٹی بیٹی ثمرہ بہت بیمار تھی۔ عرفان صدیقی کا خط پہنچا تو میری بیوی ثمرہ کو گود میں لیے پریشان بیٹھی تھیں اور بچّی نیم غشی کی حالت میں تھی۔ میں نے اس کے سرہانے یہ منقبت پڑھی کہ شاید اس کی برکت سے بچّی کو افاقہ ہو۔ اور واقعی منقبت پڑھنے کے بعد ہی بچی کی حالت سنبھل گئی اور وہ دو تین دن میں بالکل ٹھیک ہوگئی۔ میں نے عرفان صدیقی کو خط میں یہ حال لکھا۔ جب کچھ دن بعد وہ لکھنؤ آئے تو ثمرہ کو انہوں نے بیٹی بنالیا۔ ثمرہ بھی ان سے بہت مانوس ہوگئی اور ان کے گھر والوں سے بھی۔ جب کبھی اپنے گھر کی لڑکیوں سے خفا ہوتی تو کہتی ''ابھی ہم ''اخوان چچا'' کی لڑکیوں کو بلالیں گے۔'' عرفان صدیقی اس کو اسکول میں پاس ہونے پر انعام اور عید بقرعید میں عیدی دیتے تھے۔ جب بھی میرے یہاں آتے ثمرہ کو بلواتے اور کچھ کچھ دن بعد اس سے شکایت کرتے:

''بھئی ثمرہ، تم بھی لبنیٰ کی طرح بڑی ہوتی جارہی ہو۔''

لبنیٰ ان کی چھوٹی بیٹی کا نام ہے۔

منقبت کے ذکر پر یاد آیا۔ ایک بار وہ لکھنؤ تبادلے کے لیے بہت کوشش کررہے تھے لیکن افسرانِ بالا اور وزارت کی ہٹ دھرمیوں نے ہر کوشش کو ناکام بنادیا۔ کچھ دن کے لیے لکھنؤ آئے تو مایوس اور دل برداشتہ تھے۔ محکمے کی زیادتیوں کا شکوہ کرتے رہے۔ آخر میں کہا:

''اب میں نے سارا معاملہ مولا مشکل کشا پر چھوڑ دیا ہے۔''

اور جیب سے ایک منقبت نکال کر سنائی جس میں حضرت علیؑ سے استغاثہ کیا گیا تھا۔

کچھ دن بعد دہلی واپس چلے گئے۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد لکھنؤ میں انہیں دیکھا کہ فوجی وردی پہنے سرکاری جیپ پر سوار کینٹونمنٹ کی طرف جارہے ہیں۔ بتانے لگے کہ معلوم نہیں کس طرح ایسا ہوا کہ تبادلے کے لے ان کے جتنے مہرے پٹ پڑے تھے سب ایک ایک کرکے سیدھے ہوگئے۔ مخالفوں کی بساط الٹ گئی اور ان کا تبادلہ فوری طور پر لکھنؤ میں فوج کے صیغۂ اطلاعات میں کردیا گیا ہے۔ اسے وہ اسی شعر کا اثر بتاتے تھے۔ فوج میں ان کا کچھ عہدہ بھی تھا، کیپٹن یا میجر یا کچھ اور۔ اس عہدے پر کچھ دن کام کرنے کے بعد وہ اپنے شہری دفتر میں آگئے۔

عرفان صدیقی نے نعت، منقبت، سلام بہت کہے، اس شاعری میں بھی ان کی انفرادیت

بہت نمایاں ہے۔ ان کا مجموعہ ''ہوائے دشتِ ماریہ'' کے نام سے پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کلام کی وجہ سے ان کی مقبولیت مذہبی حلقوں میں بھی بہت بڑھ گئی۔

عرفان صدیقی کی شخصیت کچھ بند بند سی تھی۔ عام طور پر وہ کم آمیز اور دیر آشنا تھے، لیکن اپنے گھر پر اور دوستوں کی صحبت میں بہت عمدہ اور نپی تلی گفتگو کرتے تھے۔ ان گفتگوؤں میں بھی اس کا اندازہ کم ہو پاتا تھا کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے اور تجربات اور مشاہدات کتنے متنوع اور گہرے ہیں۔ اپنے شعروں میں وہ کچھ کھل کر سامنے آئے ہیں لیکن ان میں بھی انہوں نے شدتِ اظہار سے بہت گریز کیا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی صورتِ حال پر انہوں نے بہت شعر کہے، کہیں مایوسی ظاہر کی، کبھی امید کی روشنی دیکھی، کبھی گزرے دنوں کو یاد کیا، لیکن سب کا اظہار مدھم لہجے میں کیا۔ البتہ بابری مسجد کے سانحے کے بعد انہوں نے ہندی میں ایک نظم کہی جس میں ان کے شدید غصے اور نفرت کا بہت شدید اظہار ہوا ہے۔ یہ نظم انہوں نے زیادہ لوگوں کو نہیں سنائی اور غالباً کہیں چھپوائی بھی نہیں۔

O

جس زمانے میں انوار احمد خان لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اردو پروگرام کرتے تھے، انہوں نے مختلف شاعروں کی تفہیم کے مسائل پر گفتگوؤں کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں سوداؔ، میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور میراجیؔ کی تفہیم پر بات چیت ہوئی۔ ہم تین آدمی، شمس الرحمان فاروقی، عرفان صدیقی اور میں مل کر گفتگو کرتے تھے۔ اردو پروگرام بیس منٹ کا ہوتا تھا لیکن اقبالؔ، انیسؔ اور میرؔ پر گفتگو بیس بیس منٹ میں نہیں سمائی تو انوار احمد نے ان گفتگوؤں کی تین تین قسطیں تیار کیں۔ ان میں سے کچھ گفتگوئیں چھپی بھی ہیں اور ان کو پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان موضوعات پر عرفان صدیقی کی گرفت کتنی مضبوط تھی اور ان کے ذہن میں کیسے کیسے نادر نکتے آتے تھے، اور گفتگو کو صحیح خطوط پر چلانے میں ان کو کیسا کمال حاصل تھا۔

شمس الرحمان فاروقی اور اسلم محمود، عرفان صدیقی کے بہت اچھے دوست تھے اور ان کی صحبت ہی وہ ہر قسم کی گفتگو بے تکلفی سے کرتے تھے۔ انہیں صحبتوں میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ عرفان صدیقی کچھ عشقیہ غزلیں کہیں اس لیے کہ نئی شاعری سے عشق کا عنصر غائب ہوتا جا رہا ہے۔ عرفان صدیقی نے یہ غزلیں کہنا شروع کیں۔ اس زمانے میں ان کی طبیعت بہت آمد پر تھی اور غزل پر غزل ہوتی جا رہی تھی۔ یہ سب غزلیں ان کے آخری مجموعے میں شائع ہیں جس کا نام انہیں غزلوں

کی مناسبت سے ''عشق نامہ'' رکھا گیا۔ ''سوغات'' کے مدیر محمود ایاز، عرفان صدیقی کے بڑے قدرداں تھے۔ اُن کو ان میں سے کچھ غزلیں بھیجی گئیں تو انہیں یقین ہوگیا کہ عرفان صدیقی کہیں دل لگا بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کئی بار مجھ کو لکھا کہ فی الحال اس معاملے کو زیادہ کریدا نہ جائے اور عرفان صدیقی کو پورا موقع دیا جائے کہ وہ اس وارداتِ عشق کو نظم کرتے رہیں۔ عرفان صدیقی سے اس کا ذکر آتا تو خوب ہنستے تھے کہ

بھلا یہ عمر کوئی کاروبارِ شوق کی ہے　　　بس ایک تلافیِ مافات کرتا رہتا ہوں

لکھنؤ کے روزنامہ ''صحافت'' کے مالک امان عباس، عرفان صدیقی کے دل دادہ تھے۔ ان کے اصرار پر عرفان صدیقی نے ''صحافت'' کی ادارت قبول کرلی۔ وہ اس کے اداریے لکھتے تھے لیکن ان اداریوں اور عرفان صدیقی کی شخصیت کا یہ اثر تھا کہ دیکھتے دیکھتے ''صحافت'' کا معیار بلند ہوگیا اور اس اخبار کا اپنا ایک مزاج بن گیا۔ لیکن ان اداریوں کی خاطر عرفان صدیقی کو ہندوستان کی پست سیاست کا بہ غور مطالعہ کرنا پڑتا تھا جس کا اثر ان پر برا ہوا۔ وہ اس عرصے میں کوئی اور قابلِ ذکر نثری تحریر نہیں پیش کرسکے۔ ان کا کالی داس کا ترجمہ ''مالویکا اگنی متر'' دیکھ کر یہ احساس اور شدید ہوجاتا ہے کہ وہ بہت عمدہ نثر بھی لکھ سکتے تھے۔

مشاعروں کے سلسلے میں عرفان صدیقی ہندوستان کے شہروں اور باہر کے ملکوں میں بھی گئے۔ جب واپس آتے تو میں ان سے مشاعرے کی روداد پوچھتا۔ وہ پورے مشاعرے کی کیفیت بہت تفصیل سے بیان کرتے لیکن اپنے پڑھنے کا ذکر اس قدر سرسری طور پر کرتے تھے کہ خیال ہوتا ان کے کلام کی زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی، البتہ دوسرے ذریعوں سے معلوم ہوتا تھا کہ مشاعرہ لوٹ کر اور چھتیں اڑا کر آئے ہیں۔

لکھنؤ میں مستقل قیام اور ملازمت سے سبک دوشی کے بعد عرفان صدیقی سے ملاقاتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور ان کی شخصیت کی دل پذیری کا نقش گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ صحبتیں آخر ہونے کو ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ان پر مرض کا حملہ ہوا اور وہ اسپتال میں داخل ہوگئے۔ اس وقت تشویش ہوئی تھی، لیکن جب وہ تندرست ہوکر گھر آگئے اور پہلے سے زیادہ گفتگو کرنے لگے تو اطمینان ہوگیا، لیکن کینسر کا شبہ آس پاس منڈلا رہا تھا۔ ۲۳ جنوری کو وہ میری بھتیجی کی شادی میں شریک ہوئے اور شادی کے بعد امان عباس اور ان کے بھائی طاہر عباس کے ساتھ میرے پاس آئے۔ ثمرہ کو بلوایا اور شکایت کی کہ تم لمبی ہوتی جارہی ہو۔

۱۶ فروری کو وہ آخری بار میرے گھر آئے۔ جب ان کی طبیعت دوبارہ خراب ہوئی تو میں ۲/ اپریل کو پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر انیس اشفاق اور شمس الرحمان فاروقی کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ وہ بہ مشکل بول پا رہے تھے لیکن انہوں نے کئی بار اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئے۔ حالت ان کی اچھی نہیں تھی پھر بھی یہ خیال نہیں تھا کہ ان کو آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

O

کسی عزیز دوست کے مرنے کے بعد اس کے بارے میں جلدی کچھ لکھنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے اور عرفان صدیقی کے بارے تو ابھی یقین بھی نہیں آ رہا ہے کہ اب ان کو نہیں دیکھ سکوں گا اور اپنے محبوب ترین دوست سے محروم ہو چکا ہوں۔ یہ منتشر تحریر اپنے ایک اور محبوب ترین دوست (خدا ان کو سلامت رکھے) ڈاکٹر اسلم پرویز کے حکم پر لکھ دی ہے۔

شاہ محمد پیرزادہ

پیرانی کا دوست چلا گیا

(جمال ابڑو کے لیے ایک نظم)

پیرانی کا جس وقت سودا ہورہا تھا
اور اس کے رُندھے ہوئے گلے سے
''اماں'' اور ''بابا'' کی آوازیں
کانٹوں کی طرح پھنس پھنس کر نکل رہی تھیں،
اور اس کی سہمی ہوئی آنکھوں سے
سندھ کی خوش حالی سرزمین کا خواب
محو ہورہا تھا،
اور اس کا وجود ناپید ہورہا تھا
تو اس کا ایک دوست
اپنے ہاتھوں میں سندھ کی سہمی ہوئی محبت لیے
اس کو ایک کہانی میں امر کررہا تھا
پیرانی کی طرح کئی کمسن لڑکیوں کے بیوپار پر
اور اس کے بعد
پیرانی کی ایک اور ہم جولی کو ''کاری'' کرنے پر
اس نے ایف آئی آر بھی لکھی
اور اپنا فیصلہ بھی سنایا۔
اور ہمارے لیے ایک خوب صورت مسکراہٹ چھوڑ کر
ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

''پیرانی'' جمال ابڑو کی ایک سندھی کہانی کا نام ہے

انور سن رائے

معنی کے بعد متن کے التوا کے معنی

ژاک دریدا (۲۰۰۴-۱۹۳۰ء) کے انتقال کی خبر سنتے ہی مجھے افتخار جالب یاد آئے اور ضمیر بھائی یعنی ضمیر علی بدایونی، اور یہ بھی اتفاق ہے کہ امریکا سے ڈاکٹر منظور اعجاز کا فون آیا تو انہوں نے بھی باتوں باتوں میں افتخار جالب ہی کا ذکر چھیڑا۔

ضمیر علی صاحب سے میرا تعلق ایک خورد کا تھا اور جالب صاحب سے خاموشی کو مکالمے میں تبدیل کرنے کا۔ جس قدر طویل خاموشی ہوتی اسی قدر گہرا مکالمہ اور پھر ایک ساتھ: اچھا اگر ایسا ہی ہے تو یہ...... اور اگر یہ یوں ہے تو وہ......!

یہ دونوں حضرات اُردو ادب کے انتہائی اہم، انتہائی سنجیدہ اور انتہائی غیر مقبول نام ہیں، نہ تو وہ فیض ہیں اور نہ حبیب جالب اور نہ ہی ان کا گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف سے کوئی علاقہ۔ اور یہ اس نوع کی خرابی ہے جو ایک اُردو سے مخصوص نہیں ہے شاید اس کا اطلاق دنیا کی ہر زبان اور اس کے ادیبوں پر ہوتا ہے۔ اگرچہ اِدھر کچھ یورپی اور لاطینی امریکی زبانوں نے اس خلا کو کم کیا ہے جو ہر طرح کا گرما گرم اور مقبول ترین لکھنے اور فروخت ہونے والوں اور حقیقی ادب لکھنے والوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود پالو کوئیلو کی الکیمسٹ کو جیمس جوائس کی یولیسس کے مثال قرار دینے والے بھی اس پڑھے لکھے مغرب میں موجود ہیں۔ دوسری مثال ادب کے حوالے سے سرکاری عہدوں کے حصول کی جدوجہد اور سیاست کرنے والوں کی ہے۔

ابھی ادھر پچھلے دنوں فرانسیسی فکشن رائٹر فرانسواز ساگاں کا انتقال ہوا ہے۔ ان کی مشہوری کی اوّلین وجہ وہ کتاب تھی جو انہوں نے چڑھتی جوانی میں اور اس کی اُداسی و تنہائی کے بارے میں لکھی اور یہ کتاب لاکھوں کی تعداد میں پچاس سال پہلے کے زمانے میں فرانس ہی میں فروخت ہوئی۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد کا وہ زمانہ تھا جب فرانس پر سارتر کی وجودیت اور جاز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

ساگاں نے اس کتاب کے بعد چالیس سے زائد ناول ڈرامے وغیرہ لکھے لیکن اس نوع کی

مقبولیت نہ تو ان کے کسی کام کو حاصل ہوئی اور نہ ہی سارتر کو یا ان کی کسی کتاب کو۔
اس کے باوجود آپ ساگاں کو سارتر کے مقابلے میں فرانس کی پہچان قرار نہیں دے سکتے۔
اسی سے اگلا مقام ہیڈیگر اور دریدا کے تقابل کا ہے۔ مقام کی ترتیب میں دریدا کا نام بعد میں آئے گا حالاں کہ دریدا، ہیڈیگر کے برخلاف کہیں زیادہ مقبول اور معروف ہے۔

افتخار جالب نے ۶۰ء کے لگ بھگ لسانی تشکیلات کا تصور پیش کیا اور اس پر اُردو میں اتنی لے دے ہوئی جتنی کہ دریدا کے ردِ ساختیات یا ڈی کنسٹرکشن کے معاملے پر برطانوی مدرّسوں نے دکھائی۔ ہر تخلیقی اور غیر روایتی تصور کی آمد مدرسوں اور مدرّسانہ ذہن رکھنے والوں میں اسی نوع کا ردِعمل پیدا کرتی ہے، لیکن اس کا کیا جائے کہ وسیع تر رسائی کے وسائل پر ان چھٹ بھیّوں کو ہی بالادستی اور اجارہ داری حاصل ہوتی ہے اور افتخار جالب کا سا تخلیقی باطن اور ضمیر علی جیسی فکری و معنیاتی رسائی رکھنے والے اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔ افتخار جالب کا تصورِ لسانی تشکیلات اسی ماورائے متن کا استعارہ ہے جو ساختیات اور ردِ ساختیات کی جدلیات میں ماورائے متن معنی کو دریافت کرنے اور پھر اس کے مسلسل آگے سے آگے جانے پر اصرار کرتا ہے۔

دریدا انہیں معنوں میں ہمارے عہد کا ایک مشکل لسانی مفکّر تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کے تصور محض پیچیدہ ادبی مباحث اور تعبیر کے تصادم کا معاملہ نہیں بلکہ بقول ضمیر علی 'وہ متن میں معنی کے ہونے کا قائل نہیں ہے' گویا ابھی آپ ایک معنی کے انکشاف ہی میں ہوتے ہیں کہ ایک اور معنی کا امکان سامنے آتا اور جھلک دکھاتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ گویا متن از خود اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اپنے دیکھنے والے کے اندر کے معنی خوابیدہ تہوں کو متحرک کرتا ہے اور اس طرح معنی متن کے وجود کے لیے ایک چیلنج بن جاتے ہیں۔

دریدا ان معنوں میں جب متن کو ملتوی کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس متن کا خالق بھی ملتوی ہو جاتا ہے، گویا اب معنی متن اور اپنے خالق سے بالا ہیں۔ اگر متن اور اسے شکل دینے والے میں خالق و مخلوق کا رشتہ ہے تو معنی کو کیا نام دیا جائے گا؟ روح؟ اور اگر معنی روح ہیں اور عمومی تصور میں

بھی تعبیر کیے جاتے ہیں تو معنی، متن اور اپنے پڑھنے، دیکھنے اور سننے والے کے اتصال سے ہر لمحے نیا اور قائم بالذات وجود اختیار والا نطفہ ہیں اور یہ نطفہ متن کی کوکھ میں نہیں اتصال کے شریک ثانی میں نمو پاتا ہے۔ اس طرح متن مسلسل ایک کے بعد ایک نئے معنی کو قیام دینے کا عمل جاری رکھتا ہے اس کے لیے غالباً بہتر مثال ایک ایسے آئینے کی ہے جس میں ہر دیکھنے والے کو اپنی صورت دکھائی دیتی ہے اور جیسے جیسے صورت تبدیل ہوتی ہے، آئینہ ویسے ویسے اسے دکھاتا چلا جاتا ہے۔

یہ مثال دریدا کی نہیں ہے۔ تاہم دریدا کے تصور کی رو سے جیسے آئینے کو اپنے اندر دکھائی دیتی صورت یا شے یا وجود پر قدرت نہیں ہوتی، اسی طرح متن کو بھی معنی پر کوئی قدرت نہیں ہوتی اور اس کا انحصار قاری پر ہوتا ہے کہ وہ معنی کو کس حد تک متن سے آزاد کر سکتا ہے۔

دریدا کا یہ تصور ردِ ساختیات ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ ساختیات نے تو محض مصنف و خالق کی ارادی معنویت کو مسترد کیا تھا اور اس بات پر اصرار کیا تھا کہ متن اپنے معنی کی تشکیل خود کرتے ہیں اور یہ معنی خالق کے ارادی معنی سے آزاد ہوتے ہیں لیکن دریدا کا اصرار تھا کہ متن میں معنی ہوتے ہی نہیں اور متن اس کے برخلاف کسی ایک معنی کے مسلسل التوا پر گامزن رہتا ہے۔

دریدا کے اس تصور نے ان لوگوں کو انتہائی مشتعل کیا جو ساختیات والوں سے اس بات پر ناراض تھے کہ انہوں نے خالق کے تصور اور اس کی با ارادہ معنی خیزی کو مسترد کر کے غالباً کائنات و خالقِ کائنات کے رشتے ہی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ جب کہ دریدا کا تصور ان معنوں میں وجودیت سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے کہ اگر معنی، متن سے اتصال کے فریقِ ثانی میں پیدا ہوتے اور نمو پاتے ہیں تو ساری ذمہ داری بھی اس طرف منتقل ہو جاتی ہے جہاں معنی نمو پاتے ہیں۔

دریدا کے نزدیک معنی کی تشکیل کا عمل کبھی مکمل نہیں ہوتا جیسے کہ اقبال کو کائنات نا تمام محسوس ہوتی تھی اور کن فیاکون کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ دریدا فرق و افتراق یا ڈیفرینس کو التوا کا بنیادی عوامل قرار دیتا ہے اور متن سے زیادہ متنیت یا ٹیکسچوایلیٹی کا قائل ہے۔ یعنی متن کا التوا بھی متن کا التوا نہیں۔

وہ محض پیدائشی طور پر یہودی نہیں تھا بلکہ تہذیبی اور ثقافتی معنوں بھی یہودی تھا اور تورات کی اس متنیت پر یقین رکھتا تھا جو اس کے نزدیک یہودی mysticism ازم کی اساس ہے اور یہ mysticism ازم اسلام اور عیسائیت کے تصوف کا ہم معنی نہیں۔

خالد جاوید

امریکا، سسٹم اور گیارہ ستمبر کے بُھوت

شیکسپیئر کا میک بیتھ کہتا ہے ''زندگی کون سے احمق کی چیخ ہے؟'' مگر میں اس چیخ کا عادی ہو گیا ہُوں اور اپنے حافظے سے بھی پیچھا نہیں چھُڑا سکتا۔ حالانکہ حافظ کمزور ہو چلا ہے اور اب تو سارا شعور ہی محض ایک بڑبڑاہٹ ہی بن کر رہ گیا ہے مگر اس بڑبڑاہٹ کی بھی ایک پُر اسرار اور خطرناک طاقت ہے۔

حافظہ کچھ تو فطری طور پر کمزور ہوتا جاتا ہے اور کچھ اُس پر حملہ بھی کیا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کو اس قسم کے حملوں میں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ تاریخ اپنا پہلا وار تو مؤرخوں پر ہی کرتی ہے۔ وہ اُنھیں ہمیشہ اچنبھے میں ڈالتی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب تہذیب، تاریخ سے رُوٹھ جاتی ہے اور اپنی پوٹلی میں بچی کچھی کنکریاں سمیٹے، کمر جھکائے سڑک پر چلتی جاتی ہے۔ تاریخ کے طوفانی ریلے سے خوف زدہ اور سہمی سہمی۔

اس صورت حال میں میرے لیے یہ سمجھ پانا مُشکل ہو جاتا ہے کہ آخر سیموئل ہنٹنگ ٹن تہذیبوں کے کس تصادم کی بات کر رہے ہیں؟

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکا پر کیے گئے حملے کو میں اسی تناظر میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ یہ میرا اپنا رُومانی Ghetto ہے۔ میری خود لذتی کا خطرناک نجی پہلو۔ اس خود لذتی میں اخبارات، ٹیلی ویژن، اور ریڈیو کی نشریات جیسے ذرائع ابلاغ کا دخل پرچھائیوں سے زیادہ نہیں ہے۔

پھر بھی اجتماعی طور پر اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو یہ عمل میری رُوح کے اندر وقوع پذیر ہونے والا ایک خواب رہی ہے۔ زبردستی دیکھے گئے خواب دیکھنے والی ذات کے لیے ایک اُداس مگر کبھی نہ دی جاسکنے والی گالی کی طرح ہوتے ہیں۔

مگر ٹھہریئے۔ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ تمام حفاظتی تدابیر کے ناکام ہو جانے کے بارے میں کیا بیان دے رہے ہیں۔

یو ایس فیڈرل ایسوسی ایشن اتھارٹی (F.A.A) کا بیان ہے کہ کسی ہینڈ بیگ میں چاقو تلاش

کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ چاقو اکثر غیر دھات والے مادّے سے بنائے جاتے ہیں۔ آگے چل کر وہ یہ خوش کُن اطلاع بھی فراہم کرتے ہیں کہ ایسی ایکس رے مشین آنے ہی والی ہیں جس کے ذریعے مسافر کا پورا جسم معائینے کی زد میں لایا جاسکتا ہے۔ اس میں نرم اشیاء مثلاً گوشت اور کپڑے تو رجسٹر نہیں ہوں گے مگر سخت اشیاء چاہے وہ دھات کی بنی ہوں یا نہیں، فوراً نظر آجائیں گی۔ اسے Three-second dose x-ray کہتے ہیں مگر میڈیکل سائنس کو ابھی اس پر مکمل اطمینان کرنا باقی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُنہیں گوشت اور کپڑے سے زیادہ نرم اور لطیف اشیا کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا کہ نرمی اور لطافت کی ایک پراسرار تباہ کاری بھی ہوتی ہے۔

دوسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ ایئرپورٹ پر Biometrics کا استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ وہ تکنیک ہے جس کے ذریعے جسمانی ساخت مثلاً چہرے کا نقشہ اور ڈھانچہ، انگلیوں کے نشانات اور آنکھوں کے بارے وغیرہ میں فوری طور پر علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی میرا خیال ہے کہ اُنہیں اُداس اور مجبور چہروں، انتقام سے لبریز آنکھوں اور محرومی سے لپٹی ہوئی انگلیوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ علم ضرور حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے بیانات سے قطع نظر، بہرحال یہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ حفاظتی تدابیر کا کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ناکام نہ بنایا جاسکے۔

مگر میں اس بات کو اتنے سپاٹ انداز میں بھی قبول کرلینے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ کہا جاتا ہے کہ جہاں اس ٹیکنالوجی نے انسان کو عظیم تحفظ بخشا ہے وہاں اس تحفظ کو تباہ و برباد کرنے کا توڑ بھی ایجاد کرلیا ہے۔ لیکن میں اروندھتی رائے کے اس خیال سے سو فیصد متفق ہوں کہ غصہ، تار کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ کسی کو دکھائی دیے بغیر کسٹم سے گزر جاتا ہے۔ سامان کی تلاشی میں کسی کو نظر نہیں آتا۔

تو قصہ دراصل یہ ہے کہ سائنس بلکہ ٹیکنالوجی ایک خاص ارتقائی منزل پر پہنچ کر ''شعور کی خالص'' خطرناک اور پراسرار طاقت سے شکست ضرور کھاتی ہے۔ واضح رہے کہ میں یہاں شکست، شعور اور ٹیکنالوجی کو اضافی معنی میں استعمال کررہا ہوں۔

امریکا پر کیا گیا یہ حملہ دراصل ٹیکنالوجی کی عبرت ناک شکست ہے۔ ٹیکنالوجی جو کام کرنے کی سب سے زیادہ عادی ہے، وہ ہے اپنے تمام مفروضوں میں سے انسانی شعور کو بے دخل کرنا۔ اس میں کس قسم کے شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام منطق اور فطری مفروضوں میں سے انسانی شعور کو بڑی حقارت کے ساتھ بے دخل کرتی ہے بلکہ دھتکارتی ہے۔ مگر اسے کیا کہیے کہ وہ خود ہی

انسانی شعور کی پیداوار یا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسانی شعور اور جذبے کی نفی ہی دراصل کبھی کبھی اس کے انہدام کا باعث بنتی ہے اور ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے ٹیکنالوجی اپنے آپ میں ایک نظام بلکہ مجھے صحیح لفظ لکھنے کی اجازت دیں تو سسٹم (system) ہوتی ہے۔ نیوکلیر ٹیکنالوجی پر مبنی ہتھیار یا بم وغیرہ بھی اپنے آپ میں ایک سسٹم ہیں جو انسانی شعور اور کسی نہ کسی جذبے کی نفی ضرور کرتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ پہلے خود تباہ ہوتے ہیں۔ اُن کی یہ تباہی اُن تک ہی محدود نہیں ہوتی، یہ ایک الگ بات ہے۔ جس طرح ایک زہریلی چھپکلی اُبلتے دودھ میں گر کر پہلے خود مرتی ہے پھر اُس دودھ کو پینے والے تمام لوگ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ یہ تباہی کی ریاضی ہے۔ مگر وہ تباہ ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی جذبے سے ٹکرانے کے باعث۔

یہ سسٹم دراصل ایک بند اندھی کوٹھری کے مانند ہے۔ یہ ایک مہر بند سسٹم (close system) کی خاصیت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی شرائط اور اپنی اخلاقیات کا غلام ہوتا ہے۔ سسٹم اپنے سے باہر کی ہر شے کو ایک سسٹم کی نظر سے ہی دیکھ سکتا ہے۔ وہ واقعی یرقان زدہ ہوتا ہے۔ وہ دہشت گردی، استحصال، تشدد، بے رحمی، خوف اور کرب کو ایک سسٹم کی صورت میں ہی دیکھ پاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے حواس و اعصاب، سیاست، بے انصافی، بدعنوانی اور مکاری کو بھی ان کی اصل شکل سے دیکھنے یا محسوس کرنے پر بھی کبھی قادر نہیں رہے۔

یہ ایک قسم کا اندھا پن ہے۔ وہ سیّال کو محسوس نہیں کر سکتا۔ شعور سیّال ہے۔ اُدھر شعور کی خوبی یہ ہے کہ وہ سسٹم کی تشکیل تو کرتا ہے مگر خود سسٹم بننے سے یکسر انکار کر دیتا ہے۔ ایک لمبا اور فیصلہ کن انکار۔ وہ تمام حفاظتی تدابیر دراصل صرف تدابیر ہی نہ رہی تھیں۔ ان کی اپنی جُداگانہ شخصیت تشکیل پا گئی تھی۔ یہ بڑی بے حس، بے رحم اور روبوٹانہ شخصیت تھی۔ یاد رکھیے کہ روبوٹ سسٹم کو بھوتوں میں یقین نہیں ہے۔ بُھوت جن کے چہرے نہیں ہوتے۔ جو سیّال ہوتے ہیں۔ بہتے رہتے ہیں۔ بُھوت ہی حافظے کا دوسرا نام ہے۔ اور حافظہ شعور ہے۔ ایسا حافظہ جس میں ماضی کی تمام محرومیاں، مجبوریاں، خواب اور آرزوئیں ہلکی بھاری اشیا کی طرح کبھی ڈوبتی کبھی تیرتی پھرتی ہیں۔

وہ تمام تدابیر اس لیے ناکام نہیں ہوئیں کہ وہ ڈھیلی ڈھالی اور خامیوں سے پُر تھیں۔ بلکہ وہ اس لیے ناکام ہو گئیں کہ وہ ضرورت سے زیادہ مکمل اور مضبوط تھیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی جب سسٹم بنتی ہیں تو مجھے ''برونو'' یاد آتا ہے۔ ''برونو'' نے کہا تھا ''اگر بیلوں کو بھی اپنے خدا کے بارے میں سوچنے یا محسوس کرنے کی طاقت یا صلاحیت سے فراہم کردی

جاتی تو ان کے خدا کا تصور ایک دیوہیکل بیل کی شکل میں ہی ہوتا۔"

اب سسٹم انسان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اپنی گرامر، اپنی ساخت اور اپنی شرائط کے بل پر کھڑا ہو کر اطمینان سے فلیٹ ہیٹ لگائے، سگریٹ پیتی ہوئی شخصیت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اس "اینٹی باڈی" کی طرح تھا جو اپنے جسم میں باہر سے آنے والی ہر شے کو "اینٹی جن" ہی سمجھتی ہے۔ اور فوراً مدافعت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔

تو اب یہ بات بالکل صاف ہو جانا چاہیئے کہ سسٹم دوسرے "سسٹم" کو تباہ کرنے کے لیے چھچھورے پن کے ساتھ، پُر غرور انداز میں سر اُٹھائے ایئرپورٹ اور تباہ شدہ عمارتوں پر براجمان تھا۔ وہ ایک پل کو بھی وہاں سے نہیں ہٹا تھا۔

مگر ھیہات۔ انسانی شعور، وہ سسٹم نہیں تھا۔ وہ جلوت تھا۔ دُکھ، انتقام، بے بسی اور نفرت کا پریت جس کے ہاتھ میں تین ہائی جیک کیے گئے ہوائی جہاز تھے جو اُن سر بفلک عمارتوں کو تباہ کرتے کرتے خود بھی تباہ ہو گئے تھے۔

شعور کی نفی؟

اگر سہل پسندی سے کام لیا جائے تو بات کا رُخ فوراً "شعور" اور "مادے" کی قدیم فلسفیانہ دوئی کی طرف موڑا جا سکتا ہے مگر میں یہاں "مادے" کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ٹیکنالوجی کے سسٹم بن جانے کی بات کر رہا ہوں۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہر ٹیکنالوجی اپنے آپ میں ایک سسٹم نہیں ہوا کرتی؟ یقیناً وہ ہوتی ہے اور اس لیے اس کے اور جذبے کے درمیان ٹکراؤ بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ گیارہ ستمبر کو جو کچھ ہوا، وہ یہی تھا۔ اس کی سیاسی، تاریخی اور معاشی جہتیں چاہے جو بھی رہی ہوں مگر اپنی ماہیت میں یہ صرف ایک ٹکراؤ تھا۔ ٹیکنالوجی جو انسان کے عظیم عقلی جذبے کا نتیجہ تھی مگر سب سے پہلے اس نے جس شے کو مجروح کیا وہ یہ عظیم انسانی جذبہ ہی تھا۔ یہ ٹیکنالوجی کی خودکشی تھی۔ یہ خودکشی تو اسی کا مقدر تھی کیونکہ وہ اس شیطانی، آسیب زدہ بچے کی خوفناک اخلاقیات کو قبول کر چکی تھی جو پیدا ہوتے ہیں اپنی ماں کی کوکھ پر نفرت بھری رات رسید کرتا ہے۔ ایسے ناشکرے کی پہلی سانس ہی دراصل اس کی خودکشی ہوتی ہے۔

امریکا اپنے آپ میں صرف ایک ملک ہی نہیں رہا ہے۔ وہ خود بھی ایک سسٹم بن چکا ہے۔ حفاظتی اعلیٰ نظام، اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی، صارفیت اور سرمایہ کاری بجائے خود "امریکا" ہیں۔ امریکا کو ابتدا ہی سے سرمایہ کاری میں ایک بے رحمانہ دلچسپی رہی ہے۔ جنون کی حد تک۔ اس کے علاوہ وہ

سب کچھ نظر انداز کرتا آیا ہے۔ یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ ہندوستان کے صوبہ گجرات میں تقریباً ہر ذی حیثیت خاندان کا کم از کم ایک فرد ''امریکا'' میں ہی بستا ہے۔ امریکا عام گجراتیوں کے لیے عروس البلاد ہے۔ حال ہی میں گجرات میں ہوئے مسلمانوں کے بھیانک اور درناک قتل عام نے ''گجرات'' کو ساری دنیا میں بدنام اور سیاہ رخ کیا ہے۔ یہ مماثلت بڑی دلچسپ ہے کہ گجرات میں بھی سوائے پیسہ کمانے کے، افراد کی لگن دوسرے کسی کام میں نہیں رہی۔ دن بھر پیسہ کماتے رہنا اور شام کو کسی پارک میں تمام اہلِ خاندان کے ساتھ بیٹھ کر ایسی نمکین اور چٹپٹی خوردنی اشیا چٹ کرتے جانا جن میں وافر مقدار میں میٹھے کی بھی شمولیت ہو، گجراتیوں کا اہم شیوہ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ سے شعور کی نفی کرتے آئے۔ تہذیب، اقدار، ادب اور آرٹ کی طرف اُن کا رجحان کبھی قوی نہ ہوسکا۔ غربت کو انھوں نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ ذات پات اور نسل پرستی کی جڑیں گجرات میں ہمیشہ سے ہی بہت گہری رہی ہیں۔ گجراتیوں کو اس بات کا بے حد گھمنڈ رہا کہ ان کا صوبہ ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مقابلتاً معاشی اور اقتصادی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ مگر اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ گجرات اور خاص طور سے احمد آباد میں انکم ٹیکس کی چوری ہندوستان کے باقی شہروں کی نسبتاً سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ شہری قوانین میں چالاکی کے ساتھ توڑ مروڑ کرنا بھی سب سے زیادہ گجراتیوں کا ہی وطیرہ رہا ہے۔ سال گزشتہ گجرات میں آئے زلزلوں نے وہاں کی نام نہاد ایمانداری کی پول بھی کھول دی ہے۔ یاد رکھیے یہ وہی صوبہ ہے جہاں سے اہنسا کے پجاری نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اس صوبے نے سب سے زیادہ قتل و غارت گری کا کھیل پیش کیا ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کا یہ قتل عام باقاعدہ منصوبہ بند کوششوں کا نتیجہ تھا اور اس کے لیے N.R.I.S کے ذریعہ پیسہ اور سرمایہ اکٹھا کیا گیا تھا۔

غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ گجراتیوں میں اقلیتوں کے اس قتل عام پر کوئی احساس ''جرم'' کوئی پچھتاوہ یا کوئی ضمیر پر بوجھ نہیں پیدا ہوا ہے اور نہ ہی اس کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔

گجرات کا آدرش امریکا ہے۔ اس لیے اس بھیانک صورت حال پر ہمیں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ امریکا میں بھی طرح طرح کے نئے قانون تشکیل کرنا، جمہوریت کے نام پر انسانی حقوق کے ساتھ کھلواڑ کرنا اور تیل کی معاشی سیاست پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے بین الاقوامی داؤں پیچ کھیلنا، سرشت میں شامل ہیں۔

مگر کوئی بھی سسٹم چاہے وہ امریکا ہو یا کوئی اور ملک جب وہ چھچھورے پن کے ساتھ سائنسی

ترقی اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کا نعرہ بلند کرتا ہے تو اپنے حافظے کو فراموش کر جاتا ہے، بلکہ شاید اپنے ہی حافظے کے خلاف جنگ کا اعلان بھی کر دیتا ہے۔

اب مسئلہ وہی ہے کہ ''مری تعمیر میں مُضمر ہے اِک صورت خرابی کی'' حافظے کے خلاف جنگ میں سب سے پہلے خیال اور فکر پر پابندی لگانا ضروری ہوتا ہے۔ موجودہ کمپیوٹر سائنس Binary system پر کام کرتا ہے۔ کمپیوٹر صرف ''زیرو'' اور ''اکائی'' کو جانتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کسی ہندسے کو نہیں جانتا۔ کیا کوئی یہ یاد رکھنا چاہتا ہے کہ قدیم یونانی فلسفے کے ایک حکیم ''فیثا غورث'' نے حقیقت مطلق کو ایک ہندسہ یعنی ''اکائی'' کی شکل میں ہی تصور کیا تھا۔ ٹھیک ہے کہ فلسفے کی رُو سے بھی اب یہ ایک گیا گزرا خیال ہے مگر جب کمپیوٹر کہتا ہے کہ سو (100) نام کی کوئی شے نہیں ہے بلکہ یہ تو ''ایک'' ہی ہے جسے ہم سو بار شمار کرتے ہیں تو کیا ہمارا ذہن کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتا؟ مگر ٹیکنالوجی اس طرح کے بیکار سوالات کو سائنس کی اسپرٹ کے مجروح ہونے سے تعبیر کرتی ہے اور عین ممکن ہے کہ ایسا ہو بھی مگر خیال اور فکر پر پابندی کا عمودی رجحان حافظے کو بے شرمی کے ساتھ نظر انداز کر دینے جیسا ہے۔ اس طرح ٹیکنالوجی انسان کو احساس کمتری میں مبتلا کرتی ہے اور اُس کا اخلاقی حوصلہ بھی پست کرتی ہے۔ ساتھ ہی انسان کے آزاد تخلیقی، غیر منطقی رویّوں کو ذلّت بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

میں سائنس یا ٹیکنالوجی کے خلاف نہیں ہوں بلکہ میں تو اس کا بڑا قائل ہوں، اسکول کے دنوں میں ہمیشہ امتحان میں ''سائنس کے کرشمے'' پر مضمون لکھتا آیا ہوں اور بڑے اچھے نمبر بھی حاصل کیے ہیں۔ مگر یہاں میرا اشارہ، سائنس کے اندر پوشیدہ ایک غیر سائنسی فعل کی طرف ہے۔ اصل نکتہ اسی نی کو سمجھنے میں پوشیدہ ہے جسے عام طور پر صارفیت کے نشے اور آرام و آسائش کے لالچ میں فراموش کر دیا جاتا ہے کیونکہ سطحی طور پر تو سائنس یہی سب کچھ فراہم کرتی ہے اور اوسط ذہن کے لوگوں کو جنت مل جاتی ہے۔

سائنس کی یہ غیر سائنسی ذہنیت اُسے بڑی آسانی کے ساتھ جیوتش کے ہم پلّہ کھڑا کر سکتی ہے۔ جس طرح جیوتش انسانی شعور اور انسانی ارادے کی آزادی کی نفی کرتی ہے اور ''قمر'' کے نحس اثرات کو کاٹنے کے لیے ''زہرہ'' کے سعد اثرات کا بیان کرتی ہے، یعنی ''قمر'' بطور ایک سسٹم اور ''زہرہ'' بطور ایک سسٹم کی آپسی ٹکراؤ کی پیچیدگیاں اُجاگر کرتی ہے، بالکل اس طرح سائنس کا علّت و معلول کا اصول اور اس کا بے حد، بے لچک رویّہ بھی یہی سب کرنے پر قادر ہے۔ بہت پہلے ہیوم

نے اصول علت و معلول پر اپنے جن تحفظات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل ہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ اور اب تو باقاعدہ Anti-matter کی بات کی جا رہی ہے جہاں صرف لامرکزیت ہے اور علت و معلول کا رسمی سا تعلق بے معنی ہو گیا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ سائنس کی اس فی کو کسی سائنس دان نے بیان نہیں کیا تھا۔ کوانٹم فزکس کے زیادہ تر ماہرین مثلاً ہائیزن برگ، الفریڈ نیڈے، نیومن، میکس برن، میر یونگے اور ڈیوڈ ماہر سے لے کر لی اور یانگ تک اس خرابی کی طرف اشارہ کرتے آئے ہیں۔ پوپر تو صاف صاف کہتا ہے کہ ''ٹھوس مادی دنیا میں تو اصول علت و معلول کی کارفرمائی واضح ہے مگر جیسے ہی ہم زیادہ لطیف دنیا، یعنی الیکٹران پروٹون سے بنی اصل دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو جگہ جگہ ہمارا سابقہ غیر یقینی اور غیر معین صورت حال سے پڑتا ہے۔ یہ دو باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں یا ان دونوں کے درمیان کوئی شے ہے جو متضاد ہے۔ اس متضاد شے کو دور کرنا مشکل ہے۔''

اصل میں عام آدمی کا سائنس کے بارے میں سطحی علم بڑا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ علم زیادہ تر سائنس اور ٹیکنالوجی کی افادیت اور کچھ گھسے پٹے فارمولوں تک ہی محدود ہوتا ہے۔ وہ اس سطحی علم کے جھانسے میں آ کر علم کے دوسرے شعبے مثلاً آرٹ، ادب اور فلسفہ وغیرہ کو اونچے منبر سے کھڑے ہو کر حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ٹیکنالوجی گلیمر کا نعم البدل ہوتی ہے بلکہ کہنا چاہیے ''امریکا'' گلیمر کا نعم البدل ہوتا ہے اور پھر وہ بوجوہ تاریخی اور معاشی اسباب اور بھی زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اس سسٹم پر (امریکا) تحسین آفرین تالیاں بجاتے رہتے ہیں۔

ٹیکنالوجی اپنے اندر سے ایک قسم کی بے حس خود غرض کا اخراج کرتی رہتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ناہمواری ہے جو سسٹم کے گویا باہر کی شے ہے اور زائد ہے۔ یہ میرے خیال میں کافکا کی Redundanuy کی طرح ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ ناہمواری یونہی آوارہ نہیں گھومتی۔ پرانے الیکٹرانک سسٹم سے لے کر جدید ترین انفارمیشن سسٹم تک اس Redundancy کا مسئلہ برقرار ہے۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ ہے جو زائد ہے۔ بے ضرورت ہے اور کائنات کی توانائی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

دراصل یہ وہ ناہمواری، خود غرض اور لایفیت ہی ہے جو آوارہ گھوم گھوم کر اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر میں اہم اور فیصلہ کن رول ادا کرتی ہے۔

۱۱ ستمبر کو جو کچھ ہُوا وہ پورے طور سے لایعنی ہے (Absurd) اور اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ واقعہ دنیا اور اس کے باہمی رشتوں میں زائد (Redundant) بھی ہے۔ مگر خوفناک بات یہ ہے کہ امریکا نے انتقاماً افغانستان میں جو کچھ کیا وہ بھی اس لایعنیت کا اہم عنصر ہے اور اس کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہم یہ بھی صاف دیکھ رہے ہیں کہ امریکا کے ضمیر پر بھی کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ اس کے جمہوری نظامِ اعصاب میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے۔

بودلیر نے کہا تھا، ''خیال رہے کہ وقت ایک عظیم جواری ہے۔

جو ہمیشہ بغیر دھوکہ دیے جیت جاتا ہے، وہ قانون۔''

انسانی تاریخ اس لیے ہمیں ہمیشہ حیرت میں ڈالتی ہے۔ اب تک امریکا نے جو بھی کہا وہ فاشزم سے مختلف نہیں ہے بلکہ اور زیادہ پختہ قسم کا فاشزم ہی ہے۔ صرف فاشزم ہی ٹیکنالوجی جیسے نافرمان اور آسیب زدہ بچے کو ایک بینت کی سزا دینے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔ اس کے نتائج معمولی نہیں۔ اب وہ آرٹ میں نہیں، جنگ میں جمالیات کا نظارہ کرتے ہیں۔ مسولینی بے چارے نے تو یہ سب بڑے سادہ طریقے سے کہا تھا۔

مگر اس سسٹم میں آرٹ محض ایک قابلِ صرف شے بنتا ہے اور ٹیکنالوجی ہمارے جسم پر لذت آگیں مالش کرتی رہتی ہے۔

والٹر بنجامن نے کہا تھا، ''ٹیکنالوجی، سماج کی بنیادی طاقتوں کے ساتھ چلنے لائق نہیں ہوئی ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا کر بھی نہ سکے گی کیونکہ وہ سماج اور اس کے شعور اور انسانی جذبے کی ہی نفی کرتی ہے۔ اس لیے ساتھ چلنے میں اس کی سانس پھول جانا حیرت انگیز نہیں ہے۔

تو شیکسپیئر کا میک بیتھ کہتا ہے ''زندگی کون سے احمق کی چیخ ہے؟'' اور میں اس احمقانہ چیخ اور لایعنیت کا عادی ہو چکا ہوں۔ اس لیے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کی دُور کی کوڑی کو احمقانہ چیخ اور لایعنیت کا نتیجہ مان کر خاموش ہو جاؤں یا اس کے منطقی اور عقلی رابطوں کا نتیجہ مان کر خاموش ہو جاؤں یا اس کے منطقی اور عقلی رابطوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دوں؟

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ پتہ نہیں سموئیل ہنٹنگ ٹن کون سی تہذیب کی بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ میں تو تہذیب کو ہر قسم کی تہذیب کو تاریخ سے رُوٹھتے ہوئے سر جھکائے سڑک پر کبڑی سی بن جاتے دیکھ رہا ہوں۔ ابھی تو سہمی سہمی اور خوف زدہ ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ اگر وہ کہیں دور گم

ہوکر پھر واپس آئے تو اس کے مُنھ سے نکیلے دانتوں کا اضافہ ہوجائے اور وہ ڈراکیولا کی تہذیب میں تبدیل ہوکر تاریخ کا خون چوسنے لگے۔

حفاظتی تدابیر کا ناکام ہوجانا اس خوفناک لایعنیت کا تماشہ تھا۔

تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ مگر یہی تو وہ سوال ہے جسے کوئی اُٹھانا نہیں چاہتا یا سلیقے سے اس کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ اس سلسلے میں نوم چومسکی نے بڑی بنیادی بات کہی ''اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ ہم ہسٹریائی وعظ اور جھوٹ کے رعب میں نہ آئیں۔ انسان کیا کرتا ہے اور کیا کرنے میں ناکام رہا ہے، اس کے انسانی نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اس بارے میں فکرمند رہیں۔ یہ سب باتیں پیش پا افتادہ ہی سہی، لیکن اس قابل ہیں کہ انہیں یاد رکھا جائے۔''

جہاں تک ''دہشت گردی'' کا سوال ہے میں اس لفظ کا استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جوزف کونریڈ یاد آ گیا۔

'کونریڈ' نے کہا تھا ''دہشت گردی تخیلاتی ذہن سے بہت قریب ہوتی ہے۔'' اب میں پھر دُہرا رہا ہوں کہ بُھوت حافظے کا دوسرا نام ہیں۔ ان کے چہرے نہیں ہوتے۔ وہ سیّال ہوتے ہیں، بہتے رہتے ہیں۔

۱۱ ستمبر کو حافظے کے یہ بُھوت اگر اتنی بڑی تباہ کاری پھیلا سکتے ہیں تو امریکا اور ٹیکنالوجی دونوں کو بنیادی بات پر غور کرنا چاہیے۔ حالانکہ اتنی تباہی کے بعد بھی ان کا گلیمر ختم نہیں ہوتا۔ میڈیا والوں نے دُھواں اُگلتی اونچی اونچی آسمان کو چھوتی عمارتوں کو بار بار اور جس انداز میں دکھایا، وہ ایک جشن بلکہ Ritual کی طرح تھا۔

تو اصل مسئلہ اس گلیمر اور چمک دمک کا ہے اور یوں دیکھا جائے تو یہ بھی لایعنی ہے۔ تاریخ ہمیشہ اس طرح کے کام تو کرتی آئی ہے۔ میں تو صاف کہتا ہوں کہ میرے اندر حیرت زدہ رہنے کی سکت بھی نہیں باقی بچی ہے۔ میں احمق کی چیخ کا عادی ہو چکا ہوں۔

نجیب محفوظ
ترجمہ: انور احسن صدیقی

مداخلت بہت ہو چکی!

حال ہی میں، عراق کے ادیبوں اور صحافیوں کا ایک گروہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ مجھے ان سے جو تاثر ملا وہ یہ ہے کہ عراق میں جاری حالیہ مزاحمت، بڑی حد تک خانگی معاملہ ہے، اور عراق کے پڑوسی ممالک کی مداخلت کا نتیجہ نہیں، جیسا کہ بعض لوگ باور کرا رہے ہیں۔ اس لیے میں اس تصوّر کی حمایت نہیں کر سکتا کہ عرب یا اسلامی افواج عراق بھیجی جائیں اور وہ اس مزاحمت کا سامنا کریں۔ اس طرح کی مداخلت، اس تصادم کی شدّت میں اضافہ ہی کر سکتی ہے اور اس کا نتیجہ تشدّد کا پھیلاؤ ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ، ایسے اقدام سے ایسی صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے جو عرب ممالک کی آپس میں چپقلش کا سبب بن جائے۔

ہمیں جس بات کی مطلق ضرورت نہیں ہے، وہ ایک نئی جنگ کا اُلجھاوا ہے۔ یوں بھی عرب دُنیا میں پہلے ہی سے بہت سے خونی تصادم جاری ہیں۔ بغداد میں ایک مصری سفارت کار کا حالیہ اغوا اور اس کے بعد رہائی اس بات کا اشارہ ہے کہ عراقی مزاحمت اپنے ملک میں عرب مداخلت کی مخالف ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ عراق کو اس حالیہ آزمائش سے کامیابی کے ساتھ ہم کنار ہوتے اور تشدّد کے سلسلے کا خاتمہ ہوتے دیکھیں۔ مگر اس کا حل عراق کے اندر سے آنا چاہیئے، اور عرب، اسلامی یا دوسری افواج کے ذریعے سے نہیں۔ حملہ آور امریکی افواج کی واپسی، عراق میں استقامت کا راستہ استوار کر سکے گا۔ مزید غیر ملکی افواج معاملات کو بگاڑ ہی سکتی ہیں۔

امر سندھو
سندھی سے ترجمہ: اسلم خواجہ

ادیبوں کی مزاحمت

"تم دور دراز کے دیس سے آئے ہو۔
لیکن تمہیں فاصلوں کی کیا پرواہ
تم فاصلوں سے بلند
اور تمہارا لہو سرحدوں سے بے نیاز ہے
پھر بھی گاتے رہتے ہو
کسی دن، کسی رات، کسی بھی لمحے
موت کی آغوش میں سوجاؤ گے
لیکن کون جانتا ہے کہ تمہاری یہ موت
کہاں آئے گی؟
تم بے نام، بے نشاں، تمہاری زبان بھی کچھ اور ہے
حقیقت صرف یہ ہے کہ تم یہاں آئے ہو
ایک ایسے ملک میں، جسے تم جانتے نہیں
تم اس کے در و دیوار کے رنگوں کو بھی نہیں سمجھتے
جس مکان کی حفاظت کے لیے تم سینہ سپر کھڑے ہو
اب، جس دھرتی میں تم دفن ہو
جس مٹی میں جذب ہو
تم اس مٹی سے محبت کرتے تھے
یہ دھرتی، یہ زمین کتنی پیاری تھی!"

ہسپانوی شاعر اور مصور رافیل البرتی کی یہ نظم، جو انہوں نے پانچویں رجمنٹ کو خراج

عقیدت، پیش کرتے ہوئے لکھی تھی، اسپین کی خانہ جنگی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ پانچویں رجمنٹ اسپین کی خانہ جنگی میں لڑنے والی وہ فوج تھی، جو پوری دنیا کے شاعروں، ادیبوں، مصوّروں اور دانشوروں پر مشتمل تھی، جو اسپین میں جسمانی طور پر وہی لڑائی لڑنے گئے تھے جو وہاں کے ہسپانوی عوام اپنے ہی ملک کے آمر حکمرانوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ قارئین کے لیے شاید یہ وضاحت غیر ضروری نہ ہو کہ یہ رجمنٹ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی اپیل پر پوری دنیا کے ان رضا کاروں پر مشتمل فوجی دستہ تھا جو فاشزم کو امن کی آنکھ میں کانٹا سمجھتے تھے۔

رافیل البرٹی کے ذاتی پروفائل پر آنے سے قبل اسپین کی خانہ جنگی کا مختصر تفصیل بیان کرنا مناسب ہوگا۔

آج کے دور اور آج کی دنیا میں جب دنیا حقیقتاً یک رُخی ہوگئی ہے، اس پر یقین کرنا مشکل ہوگا کہ آج سے چھ سات دہائی قبل مغربی دنیا کے اہل قلم، دانشور، آدرشوں کی ایک ایسی لڑائی میں شریک رہے ہیں، جو ان کی نظر میں ان کے آدرشوں اور فاشزم کے درمیان دوبدو لڑی گئی تھی۔ ایک جانب اسپین کی مطلق العنان حکومت تو دوسری جانب کسانوں، مزدوروں پر مشتمل عوام۔ آج یہ تصور کرنا انتہائی مشکل ہوگا کہ اسی دھرتی پر جب ستر کی دہائی میں کمبوڈیا کی خانہ جنگی کے دوران ہزاروں افراد مارے جا رہے تھے تو اِسی مغرب کے دانشور پیر پسارے بیٹھے تھے یا پھر ۱۹۹۰ء کے یوگوسلاویہ کو یاد کریں، اُس وقت بھی یورپ کی دانش کا وارث حلقہ اپنے کان پر جوں تک رینگتا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اسی یورپ کے دانشور کے لیے یہ تصوّر کرنا اب بے شک دشوار ہوگا کہ اُس نے تیس کی دہائی میں باقاعدہ سپاہی کے طور پر پرائی آگ میں کیوں اور کیسے کودنے میں ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی تھی؟

اس کے مقابلے میں اتحادیوں کے نام پر مختلف ممالک کے اُجرتی سپاہی جمع کر کے عراقی مزاحمت کاروں سے نبرد آزما ہونے والی افواج سے متعلق یہ تصور کرنا انتہائی آسان ہے کہ یہ تمام فوجیں دنیا کے اس بڑے غنڈے کا کردار ادا کرنے والے امریکا کے بلاوے پر جمع ہوئی ہیں، جن میں سے کچھ کو فوجی امداد کی لالچ ہے، تو کچھ ہمارے جیسے خود کو پیا من کو بھانے والی دلہن بنانے کے لیے پیش خدمت ہوئے ہیں۔ دوسروں کو چمک اور چھڑی پر سرنگوں ہونے والوں میں بھگدڑ بھی اسی طرح ہوئی ہے جیسے اب پہلے اسپین پھر فلپائن اور بالآخر بلغاریہ اور دوسرے پیش کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سفیر کے طور پر ایک پاکستانی کی عراق میں تقرری، ہمارے مسلمان بھائیوں کو بھی

وہاں کا رخ کرائے گی یا نہیں، اس کے متعلق فی الحال کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

'اگر تم یہاں میری مدد کے لیے آئے ہو
تو تم فضول اپنا وقت برباد کر رہے ہو
لیکن اگر یہاں اس لیے آئے ہو کہ
تمہاری آزادی میری آزادی سے جڑی ہوئی ہے،
تو پھر آؤ مل کر کام کریں!'

میکسیکو کے اصلی باشندوں کی دیہی خواتین کے لوک گیت کے یہ مصرے اُس وقت کے ہسپانوی مزاحمت کار عوام کی اُمنگوں کے ترجمان تھے۔ اسپین کی خانہ جنگی اُن دنوں کے یورپی دانشور، اہل قلم، اہل دل کے لیے کسی سرحد، نسل، رنگ یا قوم کی لڑائی نہیں تھی۔ یہ ان کے لیے ایک آدرش، ایک نظریے کو بچانے کی لڑائی تھی۔ یہ فاشی نظریے کے خلاف، پوری دنیا کے فاشی آمروں کے خلاف ایک علامتی لڑائی تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک جانب فاشی آمر فرانکو تھا تو دوسری جانب سوشلسٹ عوام اور پوری دنیا سے جمع ہونے والے آدرش وادی۔ آج کے دور میں یہ بات کتنی حیرت انگیز اور کرشماتی لگے گی کہ اُس وقت اسپین میں دنیا کے تقریباً پچاس ممالک سے تعلق رکھنے والے پینتالیس ہزار رضا کار اس لڑائی میں شریک ہونے کے لیے آکر جمع ہوئے تھے۔ انٹرنیشنل بریگیڈ ان فوجی دستوں کا مشترکہ نام تھا جو مختلف گروہوں کی شکل میں اس لڑائی کے شریک تھے اور ان میں سے سولہ ہزار کے قریب اسپین میں مختلف محاذوں پر لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان میں سے تین ہزار کا تعلق امریکا سے تھا اور تیرہ سو کینیڈا کے باشندے تھے (جن میں سے صرف ۳۵ ہی زندہ واپس لوٹے تھے) دوسری جانب فرانکو بھی اکیلا نہیں تھا۔ جرمنی کا ہٹلر اور اٹلی کا مسولینی بھی فاشزم کی اسی راہ کے راہی تھے۔ اگرچہ رضا کار اسپین کو فرانکو سے بچا نہیں سکے تھے۔ تاہم انہوں نے اسپین فاشزم کی راہ روک کر اٹلی اور جرمنی کی فاشزم کو بڑی زک ضرور پہنچائی۔ دوسری جانب جرمنی اور اٹلی ہی فرانکو کے لیے بڑے اتحادی ثابت ہوئے۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں انتظار ہوگا میری جانب سے اس وضاحت کا کہ اس بین الاقوامی جدوجہد میں میری شرکت کیا معنی رکھتی ہے؟ دیکھو، یہ اُس وقت کی جنگ ہے جب سفید فاموں نے صدیوں سے ہمیں غلام بنا کر رکھا، ذلتوں کا شکار بنایا، ہمیں خود سے جدا رکھ کر ہماری توہین کی، کیوں کہ میں سیاہ فام ہوں، اور میں سیاہ فام یہ لڑائی اپنے لوگوں کے لیے لڑ رہا ہوں، اس لیے ہی میں آج

اسپین میں ہوں کیوں کہ اب ہم اقلیتی گروپ نہیں ہیں، جو کسی مدد کے بغیر ایک بہت بڑے دیو سے لڑ رہے ہوں، کیوں کہ میرے پیارے! ہم سب دنیا کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ مل کر ایک ہوئے ہیں، جنھوں نے انسانی تہذیب کو طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور اقلیت کی تباہ کاریوں سے بچانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اُٹھائی ہے، کیوں کہ اگر ہم نے فاشزم کو یہاں اسپین میں ہی شکست دے دی تو ہم امریکا میں بھی اپنے لوگوں کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں قائم فاشی اذیت گاہوں، عذاب گھروں اور یہودیوں کے لیے قائم ہٹلر کے مذبح گھروں سے نجات حاصل کر لیں گے۔ ہم یہ سب کچھ اپنے لوگوں کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ امریکی تاریخ کے اوراق پر نظر تو ڈال کر دیکھو، جو ہمارے شہدا کے لہو سے سُرخ ہیں۔ درختوں سے ٹنگے ہوئے، جلائے گئے جسموں سے سڑاند دینے والے ہمارے پیاروں کے کراہنے اور تڑپنے کی سرگوشیوں سے بھری ہوئی تاریخ، جن کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں کاٹی گئیں، تیل کی کڑاہیوں میں جن کے زندہ جسم جلائے گئے۔ لوہے کی سلاخوں میں جن کا زندہ ماس بُھونا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ عورتوں اور مردوں کے ذہنوں میں ہمارے آقاؤں کی جانب سے نفرت کا زہر ڈالا گیا تھا۔ یہ آقا ہمارے خون اور پسینے کی محنت کے استحصال پر سکون کی سیج پر سوئے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ نفرت کے مارے لوگ ذمہ دار تھے اس پورے مکروہ سازش کے، جس کے ہم شکار بنے؟ نہیں قطعی نہیں۔ وہ تو بچارے فاقہ زدہ تھے ہماری طرح۔ وہ تو محض استعمال ہوئے۔ وہ خود بھی انھی مالکوں، آقاؤں کے ہاتھوں لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں، لیکن یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ ہم مل کر لڑیں گے اور مل کر ایک نیا سماج تعمیر کریں گے۔ ایسا سماج جہاں امن، سکون اور انصاف ہوگا۔ جہاں سیاہ فاموں کے لیے الگ قطار نہیں ہوگی۔ مال گاڑی کی طرح سیاہ فاموں کے لیے کوئی علیحدہ بوگی نہیں ہوگی۔ اسی لیے پیارے میں یہاں اسپین کی لڑائی میں شریک ہوں۔''

چھ جولائی ۱۹۳۷ء کو اسپین کے محاذ سے ایک امریکی سیاہ فام کا اپنے دوست کو تحریر کیا گیا خط۔ یک قطبی، یک رخی دنیا آج اس آدرش کے ساتھ لڑنے والوں کو شاید دیوانہ یا دہشت گرد کہے گی، لیکن اُس وقت یہ آدرش پوری دنیا کے انسانی ضمیر کا عکس بن کر اُبھرا تھا۔ جارج آرویل سے لے کر ہیمنگوے تک جو بھی لورکا کے دیس میں یہ خانہ جنگی رپورٹ کرنے گیا، وہ اس جنگ میں اس عوامی فوج کا سپاہی بن گیا۔ ہیمنگوے شمالی امریکا کے اخبار کے لیے رپورٹنگ کرنے اسپین گیا تھا۔ ''اسپین آگ کے شعلوں میں'' نامی دستاویزی فلم کے لیے کمینٹری لکھنے والے ہیمنگوے بعد از اں

اسپین کی وفادار فوج (جو عوامی فوج تھی) کے ترجمان کے طور پر مشہور ہوا۔ 'اسپینی دھرتی' کی نیویارک میں اسکریننگ کا انتظام کر کے ہیمنگوے نے اسپین کے لیے "ایمبولینس فنڈ' بھی جمع کیا تھا۔

"اسپین میں موت کی نیند سونے والو! آج کی رات سرد ہے اور حالیہ سرما میں وہ مردہ ہوں گے، جس طرح دھرتی بھی اُن کے ساتھ سوئی ہوئی ہے۔ لیکن بہار میں جب بارشیں آئیں گی، دھرتی کو مہربان بنانے کے لیے نرم ہوا جنوب سے پہاڑوں کو چھوئے گی، سوکھے درخت دوبارہ چھوٹے چھوٹے پتوں کے ساتھ زندہ ہوجائیں گے اور جار ہاندی کے کنارے سیب کے درختوں پر بہار آئے گی۔ ہمارے مارے جانے والے ساتھی اب اسپین کی دھرتی کا حصہ ہیں اور اب اسپین کی دھرتی دوبارہ موت کا لقمہ نہیں بنے گی۔ ہر بہار میں وہ دوبارہ زندہ ہوجائے گی اور ہمارے مارے گئے ساتھی بھی ہمیشہ اس کے ساتھ جئیں گے۔ جس طرح دھرتی کبھی بھی نہیں مرتی، اُسی طرح جو غلامی چھوڑ کر آزادی پاتے ہیں وہ بھی کبھی بھی مر نہیں سکتے۔"

ہیمنگوے نے اُن امریکی رضا کاروں کو خراج پیش کرتے ہوئے لکھا جو گھر بار اور زندگی کے سینکڑوں سکھ چھوڑ کر جاڑے میں اسپین کے جنگی محاذ پر ایک آدرش کے دفاع میں موت کا لقمہ بنے۔ جارج آرویل بھی اسپین کی خانہ جنگی شروع ہونے کے دنوں میں ذہن میں اخباری مضامین لکھنے کا سوچ کر اسپین گیا تھا لیکن اُس نے بھی وہاں جلد ہی مزاحمتی گروپ میں شمولیت اختیار کر لی۔ لورکا کے دیس کی یہ جنگ اہل ضمیر انسانوں کے لیے اپنے وجود کی جنگ کی علامت بن گئی- لورکا، اسپین کا انقلابی شاعر، مصور، تھیٹر نویس جو اس جنگ کی ابتدا میں ہی فاشی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا اور بعدازاں مارا گیا لیکن رافیل البرتی انقلابات، آدرشوں اور نظریات پر ماتم کرنے والی ۱۹۹۰ء کی دہائی اور نئے ہزارے کے نئے سورج کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔

وہ زندگی کے جو پچاس سال مسلسل فاشزم اور سامراج کا تعاقب کرتے ہوئے اسپین کی آزادی کے گیت لکھتا رہا، وہ بھی اس جنگ کے فوجی دستے میں باقاعدہ سپاہی کی طرح لڑا تھا۔ 'پانچویں رجمنٹ' کا یہ شاعر، مصنف اور مصور سپاہی کہتا رہا کہ

'خدا تمہارا حافظ و مددگار رہے
تم کہاں جا رہے ہو، اتنا تو بتاؤ
میں پانچویں رجمنٹ جا رہا ہوں،
وہاں پہاڑوں کی سمت

میں فتح کے گیت گاتا
پانچویں رجمنٹ جا رہا ہوں
یہی میری رجمنٹ اور یہی میرا مستقبل ہے!"

جب تہذیب فاشسٹوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہی ہو تو اُس وقت ادیب کا کام صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ تہذیب اور حُسن کی حفاظت کے لیے، انسانی تاریخ کے ورثے کی حفاظت کے لیے جدوجہد کا شریک ساتھی بنے۔ ادب جب تاریخی شعور کا عکس نہیں بنے اور ادیب جب اس کا ترجمان نہ بنے، تب نہ صرف لکھنے والا بلکہ وہ پڑھنے والا بھی، جو اس شعور کا حصے دار نہیں بنتا اور اس کا وارث نہیں بنتا، جو بھی لکھنے/پڑھنے کے غیر پیداواری عمل کی طرح ہوتا ہے یا اس سے بھی بھیانک یہ کہ ادب کو ذاتی لذّت پرستی کے زمرے میں لاکر اس کو عیاشی کا ایک نرالا مظہر بنالیتا ہے۔

تاریخ اور اس کے حوالے چُننا، ان کو بار بار دہرانا محض ذہنی ناسٹلجیا نہیں، بلکہ ایک دور کے پس منظر، پیش منظر کے عکس آج کے دور کے کئی معاملات کی خود ساختہ وضاحت کی طرح سامنے آتے ہیں۔ فاشزم، آمریت اور غلامی کے مسلّط کردہ یا خود ساختہ خوف، ماضی کے حوالوں اور بہادری کی مثالوں سے دور کیے جاسکتے ہیں۔ ریزہ ریزہ کرکے قوموں، لوگوں کو الگ الگ کھڑا کرکے ان کی طاقت تقسیم کرنے کی پالیسی کا فعل اپنے جوبن پر ہے اور اب صرف ملکوں، قوموں میں سے ایک ایک کرکے، وار کرکے تنہا کرنے، وار کرکے ختم کرنے کا بین الاقوامی مشن عمل پذیر ہے۔ مزاحمتوں، جدوجہدوں، مظلوموں کے بین الاقوامی اتحادوں سمیت ماضی کے تمام تر حوالے انسانی ذہن کی یادداشت سے دور ہو گئے ہیں۔ انسانی مستقبل کے ضمیر کی جنگ اتنی کٹھن بھی تو نہیں، یہ الگ بات ہے کہ آزادی، نجات کی صدی کا سفر گزشتہ صدی کے مقابلے میں اس صدی میں زیادہ مشکل ہوگیا ہے کیونکہ حالیہ جنگ کا میدان مظلوم قوموں کی سرحدیں اور دھرتی نہیں بلکہ ان کے قدرتی وسائل، ان کی تاریخی شناخت، ان کے تہذیبی مظاہر ہیں۔ اگرچہ ہتھیاروں سے وار ان کا آخری وار ہے لیکن قوموں، ملکوں، تہذیبوں اور مظلوم طبقات کی لوٹ مار کا پہلا میدان اعداد و شمار کی دنیا ہے۔ Digits کی دنیا ہے پھر بھی یہ جنگ جیتنا اتنا مشکل تو نہیں! عراق سے اتحادیوں کا سر پر پیر رکھ کر بھاگنا نئے دور کی جدوجہد کی کامیابی کی علامت ہے اور اسی دوران عالمی عدالت کی جانب سے اسرائیلی دیوار کی تعمیر کو غیر قانونی قرار دینا، اس تنہائی بھری صدی میں تنہا کھڑے ہوئے سندھ کے لیے جدوجہد کے تازہ ترین حوالے بن سکتے ہیں۔

وہ بھی دور تھا، جب دیس بدلیس کے شاعروں کا سفر اسپین میں جا کر ختم ہوتا تھا وہ جو راتوں کو خندقوں میں بیٹھ کر شاعری کرتے، اپنے پیاروں، محبوباؤں، گھر والوں کو کرتے تھے اور دن میں فاشی فوج سے نبرد آزما ہوتے تھے، انہوں نے ایک پورے دور کو متاثر کیا۔ انہوں نے پورے دور کی تاریخ کو ایک روپ دیا اور ادب کو سدا بہار رکھا، انہوں نے مشترکہ انسانی ضمیر کی حقیقی ترجمانی کی۔

'بے شک میرے ہاتھ، میرے پیچھے باندھ دو
مجھ سے میرے سگریٹ اور کتاب چھین لو
میرا حلق ریت سے بھر سکتے ہو
لیکن شعر، میرے دل کا مچلتا لہو ہیں
میں جیل کی کوٹھری میں گاتا رہوں گا!'

ناانصافی، استحصال، ننگی فاشزم اور مظلوم اقوام کی غلامی کے اس بھیانک سیاہ دور میں کون اس نظم کے خالق فلسطینی جلاوطن شاعر محمود درویش سے انکار کر سکتا ہے؟ یتیم بچوں، تنہائی کے شکار، سیاسی، سماجی طور پر استحصال زدہ اور پسماندہ قوموں کے لیے کون انٹرنیشنل بریگیڈ کے خواب دیکھتا ہے؟ کون پانچویں رجمنٹ کا سپاہی بننے کے لیے قلم ایک جانب رکھ کر جاڑے کا سفر کرے گا؟ پوری دنیا نہ سہی، پورا براعظم نہ سہی، پورا ملک نہ سہی، ملک کے ایک چھوٹے حصے کی ایک چھوٹی سی اقلیت کے لیے کون سینہ سپر ہو سکتا ہے؟ عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کیا قریب المرگ، قریب انجام اور سانس لینے کے لیے ہاتھ پیر مارنے والی قوم کی آخری ہچکیاں کافی نہیں؟ آئیے، یہ سوال صرف عالمی ضمیر سے ہی نہیں بلکہ اپنے آپ سے، اپنے ضمیر سے بھی پوچھیں!

کوئی تو کرنل صاحب کو خط لکھے

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ناولوں میں سب کچھ سچ ہوتا ہے، سوائے نام اور تاریخ کے۔ لیکن کیا یہ سچ اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ عدالت کے فیصلے پر اثر انداز ہوجائے اور اس ناانصافی کو ختم کردے جو تاریخ نے روا رکھی تھی، وہی تاریخ جس میں سب کچھ جھوٹ ہوتا ہے، سوائے نام اور سنین کے۔

معاملہ چلا ہے گابرئیل گارسیا مارکیز کے ایک ناول سے۔ لوگ اس پر یہی کہیں گے کہ ایسی باتیں صرف ناولوں میں ہوتی ہیں، اور ناول بھی مارکیز کے جن کی تخیلاتی اور رنگ برنگی دُنیا، حقیقت اور جادو کا امتزاج ہے۔ مگر ناول سے نکل کر یہ معاملہ عدالت میں پیش ہے۔ مارکیز کے وطن کولمبیا میں عدالت اس مقدمے کی سماعت کررہی ہے کہ ناول نگار کے نانا کے انتقال کے لگ بھگ ساٹھ برس بعد ان کا فوجی اعزاز و اکرام بحال کیا جائے اور انہیں پس از مرگ ترقی دے کر جنرل کے عہدے پر فائز کیا جائے۔

آں جہانی نکولس مارکیز میجیا لاطینی امریکا کے مقبول ترین مصنف گابرئیل گارسیا مارکیز کے نانا تھے اور ان کے اس لائق نواسے نے ان کے کردار کو سامنے رکھ کر ایک مختصر ناول لکھا جو ''کرنل صاحب کو کوئی خط نہیں لکھتا'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس ناول میں ۷۵ سالہ کرنل صاحب اور ان کی بیوی برسوں سے اس خط کا انتظار کررہے ہیں جس میں ان کو یہ اطلاع ملے گی کہ ملک کی خانہ جنگی میں اپنی خدمات کے صلے میں وہ فوجی پنشن کے حق دار ہوجائیں گے۔ اس انتظار کے عالم میں ان کی مالی حالت خراب ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایک بدحال قصبے میں کرنل صاحب اس خط کا انتظار کیے جارہے ہیں جو کسی نے ان کو نہیں لکھا۔

کرنل صاحب انتظار کرتے کرتے خود تو اس دُنیا سے گزر گئے اور ان کا انتظار جدید افسانوی ادب کا ایک انتہائی معنی خیز استعارہ بن گیا۔ مگر اب مارکیز کے بعض مدّاحوں نے اس معاملے کو دوبارہ اٹھایا ہے۔ ''کرنل صاحب کے لیے کوئی ایسا شخص تو ہو جو ان کو خط لکھے، حالاں کہ اب

اکیسویں صدی آ گئی ہے،'' حوزے رافائیل کانون نے کہا، جنہوں نے یہ مقدمہ عدالت میں دوبارہ دائر کیا ہے۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ مملکت، کرنل صاحب کی حیثیت کو تسلیم کرے۔ پھر ہم چاہتے ہیں کہ ان کا عہدہ جمہوریہ کے جنرل کے برابر کیا جائے۔ اب تک ان کو تیسرے درجے کے شہری کے طور پر دیکھا گیا ہے۔''

اخباری نمائندوں نے ٹیلی فون پر انٹرویو کے دوران کانون نے بتایا ہے کہ ان کے تین ساتھیوں نے کرنل صاحب کے فوجی کیریئر پر ۱۸ ماہ کی تحقیق کے بعد کافی شواہد جمع کیے۔ ۱۸۹۹ء میں برپا ہونے والی ''ایک ہزار دنوں کی جنگ'' میں کرنل صاحب نے فوجی خدمات انجام دی تھیں، اور اس بارے میں اس وقت کے فوجی اہل کاروں کے بیانات موجود ہیں۔ ''یہ ناانصافی پچھلی صدی میں کی گئی تھی مگر ایک غلط کام کو دُرست کرنے کے لیے ابھی بھی دیر نہیں ہوئی'' کانون نے کہا۔

فی الحال ان کا مقصد کرنل صاحب کے فوجی ریکارڈ کی دُرستگی ہے، اور وہ کرنل صاحب کی پنشن کا قصہ نہیں چھیڑ رہے۔ اس کے بارے میں مارکیز خاندان سے بعد میں مشورہ کیا جائے گا۔ مارکیز خود اس مقدمے اور کرنل صاحب کے رُتبے کی بحالی کی مہم کا حصہ نہیں بنے ہیں۔ مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اس مقدمے کی کارروائی کا بڑی دل چسپی کے ساتھ مشاہدہ کر رہے ہیں۔

مارکیز کی نانی، یعنی کرنل صاحب کی بیوہ نے ۱۹۳۹ء میں کرنل صاحب کے انتقال کے بعد عدالت میں یہ مقدمہ دائر کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ناکام ہوگئیں اور ۵۰ء کی دہائی میں مارکیز کے ماموں کی طرف سے بھی ایسی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ مارکیز نے اپنا بچپن کرنل صاحب کے گھر میں گزارا اور اس نے یہ ناول ۱۹۵۷ء میں قلم بند کیا۔

اس ناول کے طفیل یہ مقدمہ ازسرِنو زندہ ہوگیا۔ اگر اس کا فیصلہ کرنل صاحب کے حق میں ہوگیا تو یہ اس کہانی کے لیے ایک نیا موڑ ہوگا کہ جس میں غربت سے تنگ آ کر اپنا آخری سامان بیچنے پر تُلے ہوئے کرنل صاحب سے ان کی بیوی پوچھتی ہے کہ اگر یہ سامان نہ بکا تو وہ کیا کھائیں گے، اور کرنل صاحب ایک ہی لفظ میں جواب دیتے ہیں جو اس ناول کا نقطۂ انتہا بھی ہے... ''گوبر۔''

گوانتا نامو میں کافکا

کیوبا کے ساحلی علاقے گوانتانامو میں امریکی حکومت نے نظر بندی کا جو کیمپ افغانستان اور القاعدہ کے معتوبین کے لیے قائم کر رکھا ہے، اس میں قید کیے جانے والے لوگوں کی حالت زار رسوائی سے بڑھ کر افسانوی شہرت اختیار کر چکی ہے۔ اس کو افسانہ بنتے کیا دیر لگتی ہے۔ برطانوی اخبار ''دی رجسٹر'' میں جون ۲۰۰۴ء میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ گوانتانامو بے کے بارے میں یہ فقرہ کہ یہ دنیا کے "beast worst" مقامات میں سے ہے، سرکاری ویب سائٹ سے حذف کر دیا گیا۔ اس کارروائی کی اطلاع دیتے ہوئے اخبار نے لکھا کہ ''یہ فقرہ حذف کرنا کا حکم کمانڈنگ افسر نے اس لیے دیا کہ اس سے اس کیمپ کے بارے میں ان کے تصور کی درست عکاسی نہیں ہوتی تھی، بحری افواج کے نمائندے لیفٹنٹ مائیک کافکا نے کہا۔''

اس فقرے کو دہراتے ہوئے ایک صاحب نے پہلے ہی خبردار کر دیا کہ مبادا آپ اپنی بصیرت پر شک میں مبتلا ہو جائیں، آپ نے ٹھیک پڑھا۔ کافکا نام کے ایک شخص/ امریکی فوج کو متعین کیا گیا ہے کہ وہ اس قید خانے کے بارے میں سوالوں کا سامنا کرے جہاں قیدیوں پر ایک غیر واضح اور عمومی فرد جرم مسلط ہے، جو اپنے وکلاء سے بات نہیں کر سکتے اور امکان یہی ہے کہ کبھی باہر نہ آ سکیں گے۔

امریکی فوج کے لیفٹینٹ بہادر کے بارے میں کوئی اور تفصیلات درج نہیں کی گئی تھیں، ورنہ ہمیں یہ جاننے کا اشتیاق تھا کہ موصوف نے اپنے معروف ہم نام کی تصانیف پڑھی ہیں، خاص طور پر ''دی ٹرائل'' نام کا وہ ناول جس کے کرداروں کو یہ نہیں معلوم کہ کس جرم کی پاداش میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ اندازہ ہے تو بس اتنا کہ مقدمے کی کارروائی جاری ہے اور غالباً فیصلہ ہو بھی چکا۔ مگر یہ ناول میں نے نہیں لکھا، لیفٹینٹ صاحب عافیت تمام کے ساتھ اپنی بریّت کا اعلان کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکی حکومت کا نقطۂ نظر کافکا کے ناول سے مترشح نہیں ہو رہا؟

کافکا کی روح یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ گوانتانامو میں امریکی انتظامیہ اس کے ناول کی بھونڈی

نقالی کر رہی ہے۔ وہ چرائے ہوئے اسکرپٹ پر کام کر رہے ہیں! اگر کافکا کا کوئی وکیل یا ایجنٹ ہوتا تو وہ پریس کے سامنے یوں چیختا۔ کافکا کا کوئی ولی وارث نہیں اور اس کی ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی مگر جولین بارنز کیا کرے؟

انگلستان کے معاصر ادیب جولین بارنز نے مشرق یوروپ میں کمیونسٹ روس کے زوال کے بعد ایک ناول ''سیہی'' (The Porcupine) کے نام سے لکھا۔ پارٹی کے رہ نما استویو پیتکانوف پر ملک و قوم کے مفادات کے خلاف کام کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ پیتکانوف اقتدار سے اُتر گیا مگر اسے اپنے دورِ حکومت میں کیے جانے والے اقدامات پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ وکیل استغاثہ کے یہاں پر وہ جرح کرتا ہے اور ملک، قوم، تاریخ کے بارے میں اس کے خیالات کو رد کر دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بارنز نے یہ ناول رومانیہ کے آمر نکولائی چاؤشسکو کو سامنے رکھ کر لکھا۔ مگر ناول کا وہ عدالت والا منظر دیکھیے اور عراق کے معزول رونما صدام حسین کی عدالت میں گفتگو پڑھیے جہاں انہیں پیش کیا گیا اور سات مختلف جرائم کی تفصیلات کا بیا نشروع ہوا۔ صدام حسین نے عدالت کے کمرے کو ''تھیٹر'' قرار دے دیا۔ صدام حسین نوشتۂ دیوار پڑھ لیں تو بہت ہے، فاضل عدالت کے وکلاء کو جولین بارنز کا ناول فوراً پڑھ ڈالنا چاہیے کہ جو تاریخ وہ رقم کرنے کے لیے کوشاں ہیں، اس ناول میں پہلے ہی تخلیق کی جا چکی ہے۔

HADITOONS

ہادی تونز

''دنیا زاد'' کی گیارہویں کتاب میں ہوشنگ گلشیری کے حوالے سے ذکر ہوا تھا کہ ایرانی فن و ثقافت کا خاصا بڑا ذخیرہ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ شعر و افسانہ کے علاوہ مصوری، فوٹوگرافی اور کارٹون اس سلسلے میں نمایاں ہیں۔ اس سے پہلے، اردشیر رستمی کے کارٹون ''دنیا زاد'' کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں، اس بار ''ہادی تونز'' ملاحظہ فرمایئے۔

''ہادی تونز'' کے نام سے ایک ویب سائٹ مرتب کی گئی ہے کہ ایران کے کارٹونسٹ (''کاریکاتوریست'') کے کارٹونوں (''آثار کاریکاتور'') کی رسائی کی دائرہ وسیع کیا جائے۔ اس ویب سائٹ پر ہادی حیدری کے کارٹونوں کی گیلری کے علاوہ دنیا بھر سے کارٹونوں کی خبریں اور ایران سے ہر ہفتے ایک مُنتخب ادارتی کارٹون کا تجزیہ شامل ہیں۔ یہ ویب سائٹ فارسی اور انگریزی میں ہے (اگرچہ اس کی انگریزی واجبی ہے)۔ اس کے مقاصد میں ''ارتباط با علاقہ مندان ہُنر کاریکاتور در ایران و جہاں''، لوگوں میں اور کارٹونوں کے فہم میں اضافہ کرتا ہے۔ مرتّبین کو توقع ہے کہ اس طرح ایران میں کارٹونوں کی فضا میں ایک نئی لہر پیدا ہو جائے گی۔

ہادی حیدری نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی زندگی کا آغاز ۱۱ جون ۱۹۷۶ء کو صبح آٹھ بجے ایک اسپتال میں نرس کے ہاتھوں پُشت پر ضرب سے ہوا۔ اور یہ ضربیں ۱۹۸۱ء تک جاری رہیں یہاں تک کہ ان کو ایک فکاہی مجلہ مل گیا اور ان ضربوں کے سبب وہ کارٹون کی طرف راغب ہوگئے۔ اب وہ اپنے الفاظ میں ''پارس کارٹون'' نام کے چوزے ہیں جو ''دنیائے کارتون وکاریکاتور'' نام کے انڈے میں سے نکلا ہے۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم کہ انجام کار وہ کباب بن جائے گا یا ''خروسِ بے محل''۔

ہادی حیدری نے ۱۷ برس کی عمر میں کارٹونسٹ کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور دسمبر ۱۹۹۷ء میں روزنامہ ''جامعہ'' سے وابستہ ہوئے جو ایران کا ''پہلا سوسائٹی'' اخبار (روزنامہ مدنی) تھا

اور (شاید اسی لیے) بند ہوگیا۔ ہادی روزنامہ ''نشاط'' اور ''عصرِ آزادگان'' سے وابستہ ہوگیا اور اس کے علاوہ روزنامہ ''آفتابِ امروز'' کے لیے بھی کام کرتا رہا۔ وہ روزنامہ ''مشارکت'' سے وابستہ ہوئے اور اس پر پابندی لگ جانے کے بعد آج کل ''طبرستانِ سبز'' اس دوران اس نے یونیورسٹی سے ڈپلومہ اور مصوری کی اسناد بھی حاصل کیں۔ اس نے ''ادبیات کاریکاتور ایراندر عصر اصلاحات'' کے نام سے کارٹونوں کی تاریخ بھی مرتب کی ہے۔ وہ اپنے تمام کارٹونوں کو کتابی شکل میں مرتب کررہا ہے اور اسے امید ہے کہ ان کی اشاعت بھی ممکن ہو سکے گی۔

جاوید اختر بھٹی

(ملتان)

دنیا زاد میں غزل پر بحث چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ غزل نے اُردو ادب میں جو مقام حاصل کرلیا ہے وہ کسی دوسری صنف کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ بحث بہت پرانی ہے غالباً آخری مرتبہ فراق اور جوش کے دور میں ہوئی تھی۔ جب فراق غزل کہہ رہے تھے اور جوش نظم کی سربلندی کے لیے سرگرم تھے۔ آج اس جہان فانی میں فراق رہے نہ جوش، معذرت کے ساتھ، ان دنوں اُردو ادب قابل فخر دور سے نہیں گزر رہا۔ پھر بھی غزل کو باقی رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اس بحث کا فائدہ یہ ہوگا کہ چند اچھے مضمون پڑھنے کو مل جائیں گے۔ ورنہ اب تو ادبی رسائل میں بحث کی روایت نے بھی دم توڑ دیا ہے۔

ہمارے شہر کے ایک قادر الکلام بزرگ شاعر جناب اصغر علی شاہ نے فرمایا کہ

نہ مرثیہ رہا باقی نہ اب قصیدہ رہا
نہ رزمیہ کے لیے عالمی جریدہ رہا
نہ داستان سرا آج مثنوی ہی رہی
نہ اختصارِ رباعی میں دلکشی ہی رہی
نہ قطعہ باقی نہ ترکیب بند باقی رہا
بقا کی شے غزلِ ارجمند باقی ہے

اہم بات یہ ہے کہ اصغر علی شاہ صاحب نظم کے شاعر ہیں۔ وہ کبھی غزل کے حامی نہیں رہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اعتراف کیا۔ یہی غزل کی سچائی ہے۔

ابرار احمد

(لاہور)

دنیا زاد ۱۲ بہت پسند آیا۔ آپ پرچے کے معیار کو دن بدن بہتر کیے جا رہے ہیں۔ اور بہت جلد ''دنیا زاد'' نے معاصر ادبی جرائد میں اپنا منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔

غزل پر میرے موقف کی تائید میں انتظار حسین، ظفر اقبال، ڈاکٹر آفتاب احمد اور جاوید شاہین کی آراء کی اشاعت کے بعد میرے خیال میں اس بحث کا اب خاتمہ بالخیر ہوگیا۔ شعری حصے

میں عرفان ستار اور علی افتخار جعفری کی غزلیں خوب ہیں اور ہمارے نئے غزل گو شعراء کے اس رجحان کی نشان دہی کرتی ہیں جسے 'نوکلاسیکی' رجحان قرار دیا جاسکتا ہے۔ عرفان ستار تو خیر خاصے عرصے سے اچھی غزلیں تخلیق کر رہے ہیں، علی افتخار جعفری کی غزل بھی ہمیں ان کے شعری طرزِ فکر کی بابت اشارے فراہم کرتی ہیں۔ امید ہے وہ آگے بڑھیں گے۔ رسا چغتائی نے سہل ممتنع اور چھوٹی بحر میں رواں دواں اور کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ لیکن ''دھیان میں کیا؟''۔ ''مکان میں کیا؟'' والی غزل ہمیں مسلسل جون ایلیا کی یاد دلاتی ہے۔ اور جون نے ایسے باکمال اشعار نکالے ہیں اُس غزل میں کہ اور کوئی چراغ اس کے سامنے نہیں جلایا جاسکتا۔

حصۂ نظم میں نسرین انجم بھٹی اور محمد انور خالد کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ حارث خلیق کی پہلی اور آصف ڈار کی تقریباً تمام نظموں پر منیر نیازی کا رنگ حاوی ہے۔ 'حسن کوزہ گر' سے انسپائر ہوکر نظموں کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس بے مثال نظم میں راشد نے جس نوع کے کوزے بنا دکھائے ہیں وہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہیں۔ اس لیے اس نظم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے

یوسف چوہدری ایک شاندار افسانہ نگار تھے۔ ان پر رفاقت حیات کی تحریر جہاں پسند آئی وہیں مجھے وہ ۶۔۷ برس بھی یاد آگئے جو میں نے راولپنڈی میں گزارے۔ ۸۰ کی دھائی میں یوسف چوہدری سے میری پہلی ملاقات احمد داؤد ہی نے کرائی۔ اور مجھے یاد ہے کہ اُس نے یوسف کے متعلق بہت اچھے کلمات کہے تھے۔ بعد کی دوچار ملاقاتیں بھی اسی طرح ہوئیں اور یوسف، احمد داؤد کے ساتھ ہی میری طرف آئے۔ رفاقت حیات کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد میں انہیں احمد داؤد سے شکایت پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ۹۹ میں میرے لاہور آجانے کے بعد ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا رہی۔ ویسے ان دوستوں کو احمد داؤد سے جائز شکایت پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یوسف چوہدری کی بطور افسانہ نگار شناخت یا پذیرائی کے عمل میں داؤد رکاوٹ بنا ہو۔ یوسف چوہدری ہر کھرے فنکار کی طرح ادبی مجالس اور شہرت کے حصول کے دیگر ذرائع سے دور ہی رہا کرتے تھے۔

یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ یوسف چوہدری نے احمد داؤد کے افسانوں پر اصلاح دی ہو۔ مشاورت کا سلسلہ دوست ادیبوں کے درمیان چلتا ہی رہتا ہے اور یہ کوئی احسان کی بات بھی نہیں ہوتی کہ جہاں آدمی کسی کو کچھ دیتا ہے تو بدلے میں اس سے کچھ لیتا بھی ہے۔ سیکھنے سکھانے کا عمل تو

ایک باعزت طریقہ ہے آگے بڑھنے کا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا احمد داؤد کو خط لکھنا یہ بھی بتاتا ہے کہ غالباً یوسف کا افسانہ احمد داؤد نے بھی 'اوراق' میں اشاعت کی غرض سے بھیجا ہوگا۔ آغا صاحب یوسف چوہدری کو براہِ راست بھی خط لکھ سکتے تھے۔ نیز کسی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نام آئے گئے خط کو اپنے آپ تک محدود رکھے۔ بہرحال یہ ایسی اہم باتیں نہیں تھیں کہ جن کا تذکرہ کیے بغیر یہ مضمون مکمل نہ ہو پاتا۔ یوسف چوہدری ایک باکمال اور نہایت منفرد افسانہ نگار تھے، اور ان کے کام کی وقعت کو کسی طور کم نہیں کیا جاسکتا۔ یوں بھی اب تو ہمارے یہ دونوں پیارے دوست پیوندِ خاک ہو چکے۔

عرفان صدیقی پر شمیم حنفی اور ظفر اقبال نے مختصر لیکن اچھا لکھا۔

نجیب محفوظ
ترجمہ انور احسن صدیقی

انقلابی عرفات

چالیس برس سے بھی زیادہ عرصے سے یاسر عرفات فلسطینی اُمیدوں کی تجسیم بنا ہوا ہے۔ اس کی پالیسیوں سے اختلافات کیے گئے، اس کے ساتھیوں کے درمیان رقابت کی آگ بھڑکی مگر فلسطینیوں کی اکثریت اس کے ساتھ رہی۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ عرفات نے ایک تاریخی موقعے کو اس وقت گنوادیا جب ایہود بارک کی پیش کش کو ٹھکرادیا جسے بل کلنٹن کی حمایت بھی حاصل تھی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس پیش کش میں فلسطینیوں کے لیے واپسی کا حق موجود نہیں تھا۔ عرفات کے اصول ہی نہیں، اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑجاتی اگر وہ بارک کے خیالات سے اتفاق کرلیتا۔ سیاست مفاہمت کے فن کا نام ہے۔ اس لحاظ سے عرفات سیاست دان سے بڑھ کر انقلابی تھا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد صدر جمال عبدالناصر نے اقوام متحدہ کی قرار داد ۲۴۲ کو منظور کرلیا جو ڈھکے چھپے انداز میں اسرائیل کو تسلیم کرلیتی ہے۔ پی ایل او نے ایسا نہیں کیا۔ ناصر نے قومی مدبر کے طور پر عمل کیا۔ پی ایل او نے انقلابی تحریک کے طور پر عمل کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک ناصر اور پی ایل او کے تعلقات کشیدہ رہے۔ تاریخ یاسر کو ایک ایسے مدبر کے طور پر یاد نہیں رکھے گی جس نے بہترین معاہدے کیے بلکہ ایسے انقلابی کے طور پر یاد رکھے گی جس نے ایک پوری قوم کی امنگوں کو مسلسل جدوجہد میں ڈھال دیا۔

قلم کار

ابرار الحسن
اجمل سراج
احمد جاوید
ادل سومرو
اسد محمد خاں
اسلم خواجہ
امام شامل
امجد طفیل
امر سندھو
انتظار حسین
انور احسن صدیقی
انور سن رائے
انور شعور
ایوگینی ایفتوشینکو
پابلو نیرودا
پروفیسر فتح محمد ملک
جیلانی بانو
حسن عابدی
حمرا خلیق
خالد جاوید
خالد سہیل
خالد محمود خان
خورشید عالم
ڈاکٹر اسلم فرخی
رضیہ فصیح احمد
رفیع مصطفیٰ
سحر انصاری
شاہ محمد پیرزادہ
شمس الرحمٰن فاروقی
شمیم حنفی
شیر شاہ سید
ظفر اقبال
عارف امام
فاروق خالد
فاروق سرور
فہمیدہ ریاض
کشور ناہید
کھیم چند
محمد انور خالد
محمد سلیم الرحمٰن
مسعود اشعر
مشرف عالم ذوقی
معین نظامی
نبی احمد
نجیب محفوظ
نصیر احمد ناصر
نیر مسعود

SCHEHERZADE
Price: Rs. 180/-